BROWN BOOKS
مشاہدات
(مختلف ممالک کے سفرنامے)
پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
مشاہدات
پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
B

MUSHAHEDAAT
(Mukhtalif Mumalik ke Safarname)

By
Prof. Khwaja Md Ekramuddin

تصنیفات

- رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ
- نوائے آزاد—اظہر علی آزاد کاکوروی (فارسی مخطوطے کی تنقیدی تدوین)
- اردو کی شعری اصناف
- تعارف و تنقید
- دیوان شانی؛ فارسی مخطوطے کی تنقیدی تدوین
- اسلامی تاریخ کے اہم شہر (ترجمہ)
- اردو میڈیا
- اردو زبان کے نئے تکنیکی وسائل اور امکانات
- اردو سفرناموں میں ہندستانی تہذیب و ثقافت
- اکیسویں صدی میں اردو: فروغ اور امکانات
- اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی و ثقافتی فروغ
- رشید احمد صدیقی کے منتخب مضامین
- ملاقاتیں (مشاہیر کے انٹرویو)
- وسیم بریلوی کی شاعری کے فکری و فنی جہات
- اردو کا عالمی تناظر
- سید محمد اشرف: نمائندہ افسانے
- 1857 پہلی جنگ آزدی سے متعلق اردو فارسی ذخیرے کا تنقیدی جائزہ
- اردو شاعری: نمائندہ شعرا کا تعارف اور ان کی شاعری
- امام بخاری کے ملک میں چند روز

Centre of Indian languages School of Language, literature and Culture Studies.
Jawaharlal Nehru University, New Delhi-110067.India

مشاہدات

(مختلف ممالک کے سفرنامے)

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

زیر اہتمام

ورلڈ اردو ایسوسی ایشن

Mushahedaat

By

PROF. KHWAJA MD. EKRAMUDDIN

ISBN: 000-00-00000-00-0

ایڈیشن	:	2020
قیمت	:	350
تعداد	:	500
کاغذ	:	70Gsm نیچرل شیڈ
مطبع	:	TOUCHSTONE، نئی دہلی۔110002
ناشر	:	براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔110025
زیر اہتمام	:	ورلڈ اردو ایسوسی ایشن، نئی دہلی، انڈیا

Circulation & Distribution Office:

Brown Books

Opp. Blind School, Qila Road,

Shamshad Market, Aligarh - 202001

Mob: +91 9818897975, Ph: 0571 2700088

E-mail: bbpublication@gmail.com

انتساب

اجنبی ملکوں میں اردو کی شمع روشن کرنے والوں کے نام

مصنف سے رابطے

Dr.Khwaja Md .Ekramuddin

Professor

Centre of Indian languages

School of Language, literature and Culture Studies.

Jawaharlal Nehru University

New Delhi-110067.India

emails:

khwajaekram@gmail.com

ekramuddin@mail.jnu.ac.in

websites:

www.khwajaekram.com

www.onlineurdulearning.com

www.worldurduassociation.com

WhatsApp:+919717977743

فہرست

پیش لفظ

سفر ایک مشاہدہ ہے لیکن مشاہدہ کرنے والوں کا زاویۂ نگاہ ہمیشہ جداگانہ ہوتا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی تمام سرزمین کو اگر دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ تمام ممالک زبان اور تہذیب وثقافت کے لحاظ سے الگ الگ رنگوں کے حامل ہیں۔ دیکھنے والا کس زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے، یہ اُس پر منحصر ہے۔ اسی لیے ہر سفرنامے میں ایک ہی ملک کے الگ الگ رنگ نظر آجائیں گے۔ دیکھنے اور لکھنے والوں کی انفرادیت کو بھی یہی ظاہر کرتا ہے۔ اسی لیے کوئی بھی سفرنامہ کسی بھی خطۂ زمین کے تمام احوال وکوائف اور تہذیب وثقافت کے ہر پہلو کو نہیں پیش کرسکتا ہے۔ میرے سفرنامے بھی ایک خاص زاویۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ یہ سفرنامے بعض ممالک کی تہذیبی زندگی کو پیش کرتے ہیں تو کچھ سفرنامے دیارِ غیر میں اردو زبان وادب کی ترویج وتدریس پر روشنی ڈالتے ہیں۔

''مشاہدات'' میرے ان غیر ملکی اسفار کا مجموعہ ہے جسے میں نے ہر سفر کے اختتام پر لکھا جو مختلف جرائد ورسائل اور اخبارات میں شائع بھی ہوئے۔ میرے ویب سائٹ پر بھی یہ سفرنامے موجود ہیں۔ اب ان سفرناموں کو نظرِ ثانی کے بعد ایک مجموعے کی شکل میں قارئین کی خدمت میں پیش کررہا ہوں۔ الحمداللہ دنیا کے بڑے ممالک کا سفر اردو زبان وادب کے حوالے سے ہوا۔ اس لیے ان سفرناموں میں ان ممالک کی تہذیبی وثقافتی زندگی کے علاوہ ان ممالک میں اردو کی صورت حال کا خصوصی ذکر ہے۔

اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں اردو زبان کی تدریس سے وابستہ ہوں اور اسی زبان کے وسیلے سے ان اسفار کا موقع ملا۔ ان اسفار کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ اردو زبان کی مقبولیت کیا ہے اور

اردو زبان نے تہذیبی طور پر کتنے ممالک کا سفر کیا ہے۔بعض ممالک ایسے ہیں جہاں اسکول کی سطح سے یونیورسٹی کی سطح تک اردو پڑھائی جاتی ہےاورا کثر ممالک ایسے ہیں جہاں بی۔اے کی سطح سے پی۔ایچ۔ڈی کی سطح تک کی تعلیم ہوتی ہے۔یہ ہم اردو والوں کے لیے فالِ نیک ہے کہ اردو کی تعلیم وتدریس دنیا کے کئی ممالک میں ہورہی ہے۔کچھ ممالک ایسے ہیں جن کے بارے لوگ بہت کم جانتے ہیں۔وہاں کے احباب کی بھی برصغیر میں آمدورفت بہت کم ہے۔اس لیے بہت سے لوگوں کو ہم جانتے تک نہیں۔حالانکہ ان کی خدمات ایسی ہیں کہ نہ صرف ان کا اعتراف کیا جانا چاہیے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی ہونی چاہیے۔میں نے محسوس کیا کہ ربط واشتراک اور باہمی تعاون سے ہی ہم اپنی زبان اور تہذیب کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ان اسفار کے بعد جن اردو کے اساتذہ اور طلبہ وطالبات سے میری ملاقاتیں ہوئیں وہ وقتی ملاقات نہیں رہیں بلکہ الحمدللہ آج بھی ان سے رابطے ہیں اور باہمی تعاون کا سلسلہ جاری وساری ہے۔

ان ممالک کے احباب سے مل کر اندازہ ہوا کہ کوئی ایسا پلیٹ فارم ہونا چاہیے جس کے ذریعے ہم ایک دوسرے کو جان سکیں اور علمی تعاون پیش کرسکیں۔اسی مقصد سے اپنے اسکالرس کے ساتھ مل کر''ورلڈ اردو ایسوسی ایشن'' نامی تنظیم بنائی تا کہ دوردراز ممالک میں بیٹھے احباب جو اردو کی خدمت کررہے ہیں،ان سے باہمی تعاون ممکن ہوسکے۔سچائی یہ ہے کہ موجودہ عہد میں کسی بھی زبان کے ثروت مند ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس میں مہجری ادب کا معیار ومنہاج کیا ہے۔ ہمیں ان مہجری ادیبوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جو دیارِ غیر میں رہ کر بھی اپنی تہذیب اور زبان سے وابستہ اور منسلک ہیں اور اردو ادب کے سرمائے میں بیش قیمت اضافہ کررہے ہیں۔ان سفرناموں میں ان تمام احباب کی خدمات کا اجمالاً ذکر دراصل ان کی خدمات کا اعتراف بھی ہے۔

اس کتاب میں اپنے سفرناموں کو میں نے تاریخی اعتبار سے ترتیب دی ہے۔میں نے اس کے علاوہ اپنے ملک کے کئی شہروں کے سفرنامے بھی لکھے ہیں۔لیکن وہ اس میں شامل نہیں ہیں کیونکہ وہ خالصتاً تفریحی نوعیت کے سفر تھے۔اسی طرح حرمین شریفین کی زیارت کا شرف بھی اللہ نے عطا کیا جو صرف زیارت کے مقصد سے تھا۔اس سفر میں میری پوری فیملی ساتھ تھی اور چالیس دن کا قیام مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں رہا۔مگر آج تک اس کا سفرنامہ نہیں لکھ سکا۔اس متبرک

سرزمین کے کن پہلوؤں پر کیا لکھوں؟ یہ آج تک سمجھ نہیں سکا۔ کئی بار کچھ لکھا بھی لیکن مکمل نہیں کرسکا کیونکہ یہ مقدس سرزمین عبادت وعقیدت کی سرزمین ہے اوراس کی زیارت دنیا میں سب سے بڑی زیارت ہے۔اللہ نے ہمیں آنکھیں دی ہیں اوران آنکھوں نے اگر مکہ ومدینہ کا دیدار کر لیا تو اس سے بڑھ کراور کوئی نعمت نہیں۔اب اس کوضبطِ تحریر میں لانا میرے بس کا نہیں اس لیے اس متبرک سفر کی کوئی روداداس میں شامل نہیں۔ازبکستان کا سفرنامہ ''امام بخاری کے ملک میں چند روز'' الگ سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

ان سفرناموں کو کئی بار سوچا کہ کتابی صورت دے دوں مگر تنگیٔ وقت کے سبب ممکن نہیں ہوسکا۔ عالمی سطح پر کرونا کے وبائی مرض کے سبب پوری دنیا قرنطینہ میں محصور ہے۔ایسے میں آن لائن تدریس کے بعد جو وقت بچا،ان فرصت کے لمحات میں یہ کتاب مکمل ہوسکی۔

ان احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی تحریک پر یہ کتاب منظر عام پر آسکی ان میں میرے کرم فرما ڈاکٹر سید تقی عابدی، جناب نصر ملک صاحب ڈنمارک، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر شہاب عنایت ملک ،پروفیسر سید اختر حسین، ڈاکٹر توحید خان، ایڈوکیٹ خلیل الرحمٰن، ڈاکٹر رضوان الرحمان، ڈاکٹر محمد محسن، اورمیرے عزیز اسکالر محمد رکن الدین کے نام اہم ہیں۔

ان اسفار میں جن کرم فرماؤں سے ملاقات ہوئی اور جن کا تعاون شامل حال رہا ان میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کناڈا، سید اقبال حیدر جرمنی، پروفیسر خلیل طوق آر اور ڈاکٹر راشد حق ترکی، سرور غزالی، عارف نقوی برلن، صدف مرزا ڈنمارک، ناصر ناکاگاوا جاپان۔قاہرہ مصر سے پروفیسر یوسف عامر، پروفیسر جلال السعید الحفناوی، پروفیسر ابراہیم محمد ابرہیم، ڈاکٹر رانیا فوزی، ڈاکٹر مروہ لطفی ہیکل السباعی، مصطفیٰ علاء الدین، ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی، ڈاکٹر بسنت محمد شکری، انجینئر ناصر عبدالرحمان، فاطمہ محمد بدر الدین، فاطمہ ماہر، میار ناصر۔ اسکندریہ سے ایناس احمد اور تقیٰ محمد۔ موریشس سے ڈاکٹر آصف علی محمد، ڈاکٹر رحمت علی، عنایت حسین عیدن، شہزاد احمد عبداللہ، انور دوست محمد اور ڈاکٹر نازیہ جافو۔سوئیڈن سے عارف کسانہ اور جمیل احسن۔فرانس سے سمن شاہ اور ممتاز ملک۔ برطانیہ سے ڈاکٹر جاوید شیخ، مہ جبیں غزل انصاری، فرزانہ نیناں، شہزاد ارمان، فہیم اختر، صباحت قمر۔ امریکہ سے عبد الرحمان عبد اور لاکھن گوسائیں تاشقند سے ڈاکٹر محیا عبد الرحمانوا،

پروفیسر الفت محبّ، لولا مکتوبہ مرتضیٰ خوجائیوا۔ پاکستان سے ڈاکٹر جمیل اصغر۔ ایران سے ڈاکٹر مندنا خانم، ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی، شیوا شہبازی، نگین، ڈاکٹر وفا یزدان منش اور ڈاکٹر علی بیات۔ ان طلبہ و طالبات بھی کا شکریہ جن کا ذکر اس سفرنامے میں موجود ہے۔ ہمارے دوست ایڈوکیٹ ناصر عزیز صاحب کا سرورق کے لیے بہت شکریہ۔

میری شریک حیات نجمہ اکرام، بیٹے محمد شادان، بیٹی ثنا فاطمہ اور سارہ فاطمہ کا شکریہ ادا کرنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں کیونکہ ان کی معاونت کے سبب ہی یہ سفر ہوئے اور یہ سفرنامہ بھی منظرعام پر آسکا۔ میری شریک حیات نے ہمیشہ پڑھنے لکھنے میں میری مدد کی۔ گھر کے ہزار کام ہوتے ہیں لیکن ان ذمہ داریوں سے مجھے آزاد رکھا۔ بچوں نے بھی ذمہ داری نبھائی۔ اللہ ان سب کو جزائے خیر عطا کرے۔ (آمین)

اپریل ۲۰۲۰ — خواجہ محمد اکرام الدین

نئی دہلی — ہندستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی

پروفیسر عتیق اللہ

سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

زمیں کے اتنے سے ٹکڑے پہ۔۔۔۔

اردو میں سفر نامہ نگاری کا شمار میں ان مظلوم اصناف میں کرتا ہوں، جنہیں ہماری ادبی تواریخ حاشیے میں بھی شمار نہیں کرتیں۔ سفر نامہ اپنی ہئیتی ترکیب میں مخلوط صنف کلام ہے۔ وہ ایک ایسی بیانیہ صنف ہے جس میں تاریخ، جغرافیہ، تہذیب، سوانح، تنقید، تحقیق، علم و معلومات، شخصی تجربات و تاثرات، افسانویت، مصوری، فوٹو گرافی، مشاہدات چشم تصور سے دکھانے کا عمل اور سفر نامہ نگار کا اپنا اسلوب اور آئیڈیالوجی میں سے کوئی بھی زاویہ اور پہلو ممنوعہ فہرست میں شامل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ جن اسفار کو روحانی سیاحت کا نام دیا جاتا ہے جیسے ابوالعلاء معرّی کی ''رسالۃ الغفران''، دانتے کی 'ڈیوائن کامیڈی' یا اقبال کی 'جاوید نامہ'۔ ان کی بنیادیں بھی آئیڈیالوجی پر استوار ہیں۔ بعض اہم ترین سفر نامے جتنے تحقیقی ہیں اتنے ہی مہماتی اور خطرات سے معمور ہیں۔ کمبل پوش سے مستنصر حسین تارڑ تک جو سفر نامے لکھے گئے ان میں لکھنے والے کے نقطہ نظر اور مقصد کے علاوہ اس کے طریق اظہار اور مشاہدات و تجربات کو ادبی سطح پر یکجا کرنے کے عمل میں افتراق ایک مشترک قدر ہے۔ اسی لیے ان میں تنوع بھی ہے۔ مغرب میں بعض سفر نامے محض تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ یہ سفر نامے اُن زمانوں کے ہیں جب رسل و رسائل کے ذرائع مشکل تر تھے۔ سفر کیا تھے مہمات سر کرنی تھیں۔ ہر ملک و قوم کی تہذیب، زبان، مذہب، رسومات وغیرہ اتنے نامانوس اور خوابناک تھے جیسے وہ کوئی سیارہ ہو اور اس کی مخلوق Alien ہو۔ زبانی روایتیں اور مفروضے ایک جگہ سے دوسری جگہ گشت کرتے رہتے تھے۔ انہیں یہ سراغ بھی ملتا ہے کہ کس دیس

کی طرف کوچ کرنا چاہیے اور کیوں؟ فاہیان، میگستھنیز، البیرونی، شیخ ابن بطوطہ وغیرہ کے سفرنامے اسی لیے جادونگریوں کے سفرنامے ہیں اور اُن زمانوں کے ہیں جب اِن مسافران کا اول و آخر مقصد اپنے تھیلوں کو ہیرے جواہرات سے بھر کر لے جانا نہیں تھا۔ نئی کائناتوں کی دریافت اور تحصیل علم و معلومات کی تڑپ ہی ان کی مہمیز تھی۔

یوں تو ایک ساتھ بہت سے سفرنامے یاد آ گئے لیکن ایک ایسے سفرنامے کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جس سے اردو کا قاری ناواقف ہے۔ یہ سفرنامہ چارلس مانٹیگ ڈوٹی (Charls MontagueDouhty1843-1926) نے Traders in ArabianDeserts کے عنوان سے 1888 میں لکھا تھا۔ ڈوٹی خطروں کا کھلاڑی تھا اس نے 1875 تا1877 عرب ریگستانوں کے سخت کوش روز و شب گزارے۔ اس نے ان عرب گوریلا مجاہدین کی مسلح جدوجہد میں ساتھ بھی دیا جو ترکوں کے خلاف نبرد آزما تھے۔ ڈوٹی کا یہ سفرنامہ فراموش گاری کی دُھند میں اَٹا رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ٹی۔ای۔لارنس نے جب اپنے تعارفی نوٹ کے ساتھ اسے شائع کیا تب دنیا کو یہ پتہ چلا کہ یہ سفرنامہ ریگستانی قبائلی زندگی کے علم و معلومات کا ایک نادر مخزن ہے اور ڈوٹی کا ادبی طرز اظہار منفرد ترین ہے۔ لارنس نے ڈوٹی کے اسلوب کو نہ صرف ممتاز بتایا ہے بلکہ اس کی پیروی بھی مشکل ہے۔ غالباً اسی باعث عرصۂ دراز تک اس کی طرف توجہ مبذول نہیں ہوئی۔

ہمارے دور میں جو سفرنامے لکھے گئے ہیں، ان میں محض وہ سفرنامے میری دلچسپی کا موضوع ہیں۔ جن کا رُخ ان قدیم علاقوں سے ہے جو اپنی ایک مخصوص تاریخ و تہذیب کی شناخت رکھتے ہیں۔ موجودہ سائنس و تکنالوجی کی ترقیات اور رسل و رسائل میں تیز رفتاری کے ساتھ جو آسانیاں پیدا ہوئی ہیں، اس کے اثرات سے تو یہ محفوظ نہیں ہیں۔ لیکن باقیات کی شکل میں عبادت گاہیں، خانقاہیں، مقابر و محلات، رسومات، آداب زندگی، اخلاقی اور جذباتی نظام اقدار و عادات کا شمار بھی آثارِ قدیمہ کے طور پر کرنا چاہیے۔ یہ لوگ آج بھی مغرب سے بہت کچھ اخذ کرنے کے باوجود مشرق کی ان روایتوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں جن سے ان کی شناخت قائم ہے۔

پروفیسر خواجہ اکرام الدین کے سفرناموں میں میری دلچسپی کا سامان اسی لیے وافر ہے کہ ان

کی سیاحت کا رُخ مشرق وسطیٰ، وسط ایشیا اور ایران و مصر کی طرف بھی رہا ہے۔ ان کی ایک حیثیت اردو ادب کے استاد کی ہے اور دوسری ایک تشنہ کام طالب علم کی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ہر سیاحت اپنا ایک واضح مقصد رکھتی ہے۔ یہ غالب کا دور تو ہے نہیں کہ دہلی سے کلکتہ سات سمندر پار کے سفر سے کم نہیں تھا۔ خچر، گھوڑا، گدھا، کشتی جو مل گیا اسی پر قناعت کرنی پڑی۔ کیا گرمی کیا سردی، کیا بارش، کیا آندھی طوفان 'لاد چلا جب بنجارہ'۔ محمد حسین آزاد نے ایران میں جو صعوبتیں اٹھائیں وہ بھی کم افسانوی نہیں۔ ہمارا آج کا سیاح بڑا خوش قسمت ہے کہ اسے 'رُکاوٹ کے لیے کہیں کھید' جیسے لفظ سے سابقہ نہیں پڑتا، یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں جاتا ہے، وہاں کی زمین اس کے لیے پہلے سے آنکھیں بچھائے رہتی ہے اور پھر محبت کرنے والے اتنے مل جاتے ہیں کہ اپنا دامن ہی تنگ پڑ جاتا ہے۔ یہ ہے مشرق۔ عزیزی خواجہ اکرام جس کے مشتاق ہیں۔ میں نے اس سے قبل یہ اشارہ کیا تھا کہ وہ اردو زبان و ادب کے استاد ہیں۔ تنقید بھی ان کا میدان ہے اور بالخصوص جدید تر ذرائع ابلاغ اور انفرموتکنالوجی ان کی دلچسپی کا خاص موضوع ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس میدان میں اردو میں آتھیرٹی کا درجہ رکھتے ہیں۔ کئی مضامین اور کتابوں کے مؤلف و مصنف ہیں۔ اردو کو انٹرنیٹ سے جوڑنے کی جو کوششیں عمل آور ہیں خواجہ اکرام اس میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کے سفر نامے محض تہذیبی مقصد سے عبارت نہیں ہیں، اردو کا کاز بھی اس میں مضمر ہے۔ میں اسی لیے انھیں 'اردو کا سفیر' کہتا ہوں۔

خواجہ اکرام کی ذہنی و جذباتی آسودگی کا سامان جو حافظ و سعدی اور امام بخاری کے ملک میں، مصر و ہرات میں ملا، اس کی گنجائش یورپ، امریکہ اور جاپان میں کہاں۔ ازبکستان میں قیام کے دوران قمر رئیس مرحوم نے بھی ایک ڈائری لکھی تھی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ہر سفر نامہ نگار کا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے نہیں نکلتا، اس کا مقصد اس کے ہر سنگ میل پر مہمیز کرتا اور پھر جہاں اتنے بہت سے مشعل بردار مل جائیں جنھیں دیکھ کر بے ساختہ آتش کا یہ شعر آجائے کہ:

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزرہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

تو یہی تجربہ قمر رئیس کا تھا اور یہی خواجہ اکرام کا، میں نے دیکھا کہ وقت بھی کیا کیا صورتیں دکھاتا ہے۔ قمر رئیس کا حلقۂ یاراں بدل گیا۔ ان وقتوں کے دو ایک اساتذہ کے علاوہ ایک نئی بستی آباد ہوگئی۔ نئی نسل ہی مشعل بردار بھی تھی۔ لیکن مسافر نوازی میں شمہ برابر کمی نہیں آئی۔ قمر رئیس سویت یونین مرحوم سے تقابل کرتے رہے۔ بین السطور میں کہیں تاسف کی رمق بھی محسوس کی جاسکتی ہے اور کہیں اس نئے منظرنامے میں حوصلوں کی آبیاری دیکھ کر ان کے اسلوب میں بھی چٹک سی آجاتی ہے۔ خواجہ اکرام کے لیے تقابل سے زیادہ حالِ موجود کی اہمیت تھی۔ ان کا تعلق سلسلۂ چشتیہ سے ہے، لیکن یہ سرزمین تو مختلف مسالک کا مرکز ہی نہیں ہیں۔ محدثوں، فقیہوں، ولی اولیاؤں اور مبلغین اسلام سے نور آگیں بھی ہیں۔ خواجہ صاحب ہر جگہ اس نور سے سیراب ہوتے رہے، اپنے ایمان کو تازہ کرتے رہے، اپنی برسوں کی پیاس کو بجھاتے رہے۔ جس مزار پر پہنچتے پھر وہ پہلے سے خواجہ نہیں رہتے، جیسے اپنے آپ کے لیے اجنبی بن گئے ہوں۔ وہ پھر اپنے شعور کی طرف لوٹتے اور ان اکابرین کی تاریخ کے اوراق پلٹنے لگتے جن سے اردو کا قاری بڑی حد تک ناواقف ہے۔ بہت کم کو یہ علم ہے کہ سمرقند و بخارا اور ان کے گرد و پیش کے مقامات کتنے عظیم وفقید المثال ہستیوں سے آباد ہیں اور جن سے یہاں کی مٹی بھی چمکیلی اور خوشبودار ہوگئی ہے۔ خواجہ اکرام نے ان بزرگان دین کے بارے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں ان سے ان کے مرتبے اور عظمت کا پتہ چلتا ہے کہ اہل اسلام ان سے کس قدر لاعلم ہیں۔

خواجہ صاحب کو اپنی گفتگو کو قرات نواز بنانا بھی خوب آتا ہے۔ وہ جب کسی خانقاہ یا مسجد یا مزار پر ہوتے ہیں تو ان میں ایک والہانہ پن عود کر آتا ہے۔ ماحول اور فضا کی پاکیزگی اور سرّیت کو لفظوں میں کسب کرنے کے دوران روحانی یگانگت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ فطرت کے مظاہر سے لطف اندوزی کے دوران وہ مصور بن جاتے ہیں اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ رنگوں کو چھو رہے ہیں اور خشبوؤں کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ خوبصورتی محض فطرت تک ہی محدود نہیں ہے وہ ان رہائش گاہوں میں بھی دیکھتے ہیں جہاں آمدنی کے ذرائع محدود ہیں مگر خوش سلیقگی، مہمان نوازی اور سجع کاری کا کلچر من وعن برقرار ہے۔ یہ اسلوب ان مواقع پر قائم نہیں رہتا جہاں وہ اپنے قاری کو چشم تصور سے دیکھنے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ایسے لمحوں میں ڈرامائی تکنیک بہت کام آتی ہے۔

دعوتوں کا اہتمام ہو کہ شادی بیاہ کی رسمیں، ہم انھیں پڑھتے ہی نہیں دیکھتے بھی جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب سلسلہ گفتگو میں ارتکاز کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ان کا ذہن بہت مرتب ہے۔ چیزوں کو بکھرنے نہیں دیتا۔ جب وہ اساتذہ کے درمیان ہوتے ہیں تو وہ ایک استاد کے پیرائے میں دکھائی دیتے ہیں، طلبا کے درمیان شفقتیں بکھیرنے کا انداز ہی مختلف ہوتا ہے۔ وہ جاپان میں ہوں کہ پاکستان میں، یورپ میں ہوں کہ امریکہ میں ہندستان اور اردو زبان وادب کا حوالہ وہ کسی گفتگو اور کسی موقعے پر نہیں بھولتے۔ وہ صرف ان ممالک میں نہیں پہنچے جہاں کئی دہوں سے اردو زبان وادب کی تعلیم و تدریس کا نظام قایم ہے اور جہاں کے طلبا اور اردو اساتذہ، یہاں کی ادبی تقریبات میں شرکت کر چکے ہیں بلکہ ان ملکوں کا بھی انھوں نے ذکر کیا ہے جہاں اردو تعلیمات کا انتظام ہے لیکن برصغیر ہندو پاک کا اردو معاشرہ ان سے ناواقف ہے۔ خواجہ صاحب نے جاپان، ترکی، مصر، ایران، پاکستان، موریشس وغیرہ کے نظام تعلیم کا بہت باریکی سے مطالعہ ومشاہدہ کیا اور کچھ نتائج بھی اخذ کیے۔ اطمینان کی سانسیں بھی لیں، فخر وانبساط کے تجربے سے بھی گزرے۔ انھیں بخوبی احساس ہے کہ ہندستان میں کس طرح ایک دوررس منصوبے کے تحت اردو کو حاشیے میں دھکیل دیا گیا ہے۔ لیکن انھوں نے کہیں بھی اپنے زخموں کو کھُلنے نہیں دیا کہ زخموں کے کھلنے کی آواز سماعتوں کے پردے چاک کر دیتی ہے۔ انھوں نے ان ممالک میں کسی دوسرے ملک کے تعلیمی نظام سے تقابل بھی نہیں کیا، کیونکہ تقابل سے ایک راہ درجہ بندی کی طرف بھی جاتی ہے۔ خواجہ صاحب کے مختصر ترین سازِ سفر میں ان کی صوفیانہ طبعیت اور دلِ دردمند تھا۔ ان کی وسیع المشربی بس یہ شعر ادا کرتی رہی:

زمیں کے اتنے سے ٹکڑے پہ اتنی دیواریں
کہ ایک شخص اِدھر سے اُدھر نہیں جاتا

عتیق اللہ

نئی دہلی

○○○

پروفیسر علی احمد فاطمی

سابق صدر شعبۂ اردو، الہٰ آباد یونیورسٹی

دو باتیں

ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانا، ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا محض سفر کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعے مشاہدہ و تجربہ کی ایک دنیا سامنے آتی ہے اور اگر مسافر کے پاس چشمِ بینا ہے تو وہ قطرہ میں دجلہ دیکھ لیتا ہے، ذہن بیدار ہوتا ہے، کشادگی اور وسعت آتی ہے۔ غالب نے کہا تھا:

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

اقبال نے بھی کہا تھا:

سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
سفر زندگی کے لیے سوز و ساز

یہ تو اشعار ہیں، اب اوراق الٹیے تاریخ کے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت فرمائی۔ مکہ سے مدینہ کا سفر کیا اور تاریخ اسلام میں ہجرت اور وسعت کا ایک انسانی تصور پیش کیا۔ ناخدائے سخن میر تقی میر نے سفر کیا۔ آبروئے غزل غالب نے کلکتہ کا سفر کیا تو ترقی و تبدیلی دیکھ کر قلب ماہیئت ہوگئی۔ اقبال نے مشرق سے مغرب کا سفر کیا۔ مغرب کو دیکھ کر مشرق کا عرفان حاصل کیا۔ سرسید نے سفر کیا لندن گئے۔ اخبار دیکھا، تعلیمی نظام دیکھا واپس آ کر ایک تحریک اور تاریخ رقم کردی۔ عبدالحلیم شرر نے انگلستان کا سفر کیا تو انگریزی طرز پر ناول اور تاریخی ناول کے انبار لگا دیے۔ سجاد ظہیر نے سفر کیا۔ لندن و پیرس گئے واپس آ کر زبان وادب کی دنیا بدل دی۔ افریقہ میں گاندھی

ریل کے ڈبے سے کیا نکالے گئے بعد میں گاندھی نے انگریزوں کو ہندستان سے نکال کر پھینک دیا۔ ابوالکلام آزاد نے ایک جگہ لکھا ہے:

''میں نے آدھا علم سفر سے حاصل کیا۔ مطالعہ کی تنہائیوں نے مجھے ذہنی بالیدگی بخشی لیکن سفر کے مشاہدوں نے میری نگاہ کو وسعت دی۔ جو لوگ سفر نہیں کرتے وہ بسم اللہ کے گنبد میں قید رہتے ہیں۔ سفر انسان کو قوموں کی سرگزشت اور ملکوں کی تاریخ کا بالواسطہ علم بخشتا ہے۔''

اسی لیے سفر کو وسیلۂ ظفر کہا گیا ہے اور کسی نے زندگی کا استعارہ بھی کہا ہے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ درست لیکن یہ سوال پھر بھی قائم رہتا ہے کہ سفر نامہ دائرۂ ادب میں کس طرح داخل ہوتا ہے۔ یعنی اسے ادبی مرتبہ کس طرح دیا جائے اور صنفی طور پر ادب کے کس خانے میں رکھا جائے؟ ان سوالوں کے جوابات تفصیلی ہو سکتے ہیں اور بحث طلب بھی جس کی گنجائش یہاں نہیں ہے۔ بس دو جملوں میں یہ عرض کرنا ہے کہ جب کوئی تحریر و تخلیق انسانی تہذیب و ثقافت اور معاشرت وغیرہ کو تخلیقی اسلوب میں کچھ اس طرح پیش کرے کہ خارجی مشاہدات داخلی محسوسات کا بھی حصہ بنتا ہے اور چشمۂ ذات سے سرچشمۂ کائنات کو کچھ اس فکری و فطری انداز سے پیش کرے کہ ذات اور کائنات باہم شیر و شکر ہو جائے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سفر نامہ فلسفہ ہو جائے لیکن یہ ضرور ہے کہ اسلوب و منظر کے پس پردہ تاریخ، تہذیب، معاشرت، ثقافت کے جلوے اور نظارے ہوں اور ایک مخصوص و دلکش اسلوب کے ساتھ پیش کش ہو تو وہ بہر حال ایک ادبی روپ اختیار کر لیتا ہے۔ ممتاز افسانہ نگار مرزا حامد بیگ نے ایک جگہ لکھا ہے:

''سیاحت کے اثرات اور تجربات اپنا انعام آپ ہیں۔ اس لیے سفر ناموں کا بیان بھی منھ بسورنے اور آہ وزاری کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تخلیقی سفر ناموں کی شگفتہ بیانی راضی بہ رضا ہونے کی علامت ہے۔''

پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے ایک جگہ معنی خیز بات لکھی ہے:

''انسان اپنی امنگوں، آرزؤں اور کشاکشوں کا مطالعہ اپنی تہذیب و ثقافت میں ہی کرتا ہے اور وقت اور حالات کے تحت اپنا لائحۂ عمل تیار کرتا ہے اور پھر ایک

جہانِ نو کی جانب قدم آگے بڑھاتا ہے۔اس لائحۂ عمل کے تیار کرنے اور جہانِ نو کی جانب قدم بڑھانے میں اس کی دور اندیشی کے لیے سیر وسیاحت شرط ہے۔یہی وجہ ہے کہ سیاحت کا شوق اور نئی دنیاؤں کی سیر انسانی تہذیب کی ابتدا سے ہی اس کی فطرت کا ایک حصہ رہا ہے۔''

باتیں اور بھی ہوسکتی ہیں اور بحثیں بھی۔ لیکن تازہ ترین صورت یہ ہے کہ اب ساری دنیا کے ادب میں سفر نامہ غیر افسانوی ادب (Nonfictionalprose) کی شکل میں اپنی اہمیت تسلیم کرواچکا ہے۔دنیا کے تمام زبان وادب میں اس کا دلچسپ اور کرشماتی سرمایہ ہے جنہیں قارئین پورے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ایسا اس لیے کہ ان میں تجسس وتحیر، مشاہدات وتجربات کی ایک رومان انگیز اور نغمہ ریز اور چشم کشا اور حیرت زا دنیا آباد رہتی ہے اور یہی وہ بنیادی عناصر ہیں جس نے نہ صرف کائناتِ شاعری بلکہ کائناتِ انسانی کی تشکیل کی اور انسان کے تہذیبی ارتقا کی تاریخ مرتب کی۔یہی وجہ ہے کہ اب سفر نامے حدودِ قارئین سے نکل کر وجودِ ناقدین تک پہنچ چکے ہیں اور ان پر تحقیقی وتنقیدی کام انجام پا رہے ہیں۔اردو زبان وادب میں بھی اچھے کام ہوئے ہیں۔خود خواجہ اکرام الدین کی مرتب کردہ کتاب ''اردو سفر ناموں میں ہندستانی تہذیب وثقافت'' ایک اہم اور بڑا کام ہے۔جس میں مختلف زاویوں اور حوالوں سے سفر ناموں کی تاریخ کا تفصیلی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

''مشاہدات'' کے عنوان سے جو کتاب پیش نظر ہے اس میں گیارہ سفر نامے شامل ہیں۔امریکہ، جاپان سے متعلق تو سفر نامے بہت ملتے ہیں اور اس کتاب میں بھی شامل ہیں لیکن مصر، ہرات، قسطنطنیہ، موریشس وغیرہ کے اسفار پر کم کم لکھا گیا ہے۔چنا چہ اس زاویے سے یہ سفر نامے متوجہ کرتے ہیں۔ان سفر ناموں کی دوتین خوبیاں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔اول یہ کہ سارے اسفار محض سیاحت یا سیر وتفریح کا حصہ نہیں تھے بلکہ ایک خاص مقصد اور نظریہ کے تحت کیے گئے۔دوم یہ کہ خواجہ اکرام الدین چونکہ عام سیاح یا مسافر نہیں بلکہ پروفیسر، ادیب و دانشور ہیں اور سفر نامہ کے فکر وفن پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اس لیے ان کے تخلیقی عمل میں بے لگامی کم اور ثابت قدمی زیادہ ہے۔تیسرے یہ کہ ان سفر ناموں کا اختصار وایجاز اظہار کا پختہ و بالیدہ وسیلہ بن جاتا ہے۔

''مشاہدات'' کے پیش لفظ میں وہ صاف طور پر کہتے ہیں:

''سفر ایک مشاہدہ ہے لیکن مشاہدہ کرنے والوں کا زاویۂ نگاہ ہمیشہ جداگانہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔میرے سفرنامے بھی ایک خاص زاویۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ یہ سفرنامے بعض ممالک کی تہذیبی زندگی کو پیش کرتے ہیں تو کچھ سفرنامے دیارِ غیر میں اردو زبان وادب کی ترویج وتدریس پر روشنی ڈالتے ہیں۔''

راقم الحروف نے بھی خواجہ اکرام الدین کے ساتھ کئی سفر کیے ہیں خاص طور پر موریشس کے دو سفر۔ میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ خواجہ پردیس میں گلی کوچے کی آوارگی ونظارگی سے زیادہ کتب خانے، ادارے، تاریخی عمارتیں وغیرہ دیکھنے اور سمجھنے میں زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ یہاں ان کی زاویۂ نگاہ والی بات سچی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں وہ اپنے ہم عصر سفرنامہ لکھنے والوں سے الگ ہوجاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے ان کے سفرنامے قدمی سے زیادہ قلمی اور علمی زیادہ ہوجاتے ہیں۔ تاہم وہ کچھ اس طرح ملے جلے انداز سے لکھتے ہیں کہ معیشت اور ثقافت باہم مدغم ہوکر ایک نئی وحدت اختیار کرلیتے ہیں۔ موریشس کے متعلق ان کی یہ تحریر ملاحظہ کیجیے:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ موریشس کا چھوٹا جزیرہ اپنی خوبصورتی میں بے نظیر ہے۔ ہر چہار جانب سے سمندر کے ساحل الگ الگ نظارے پیش کرتے ہیں۔ پانی کا رنگ بھی کہیں گہرا نیلا تو کہیں بالکل سبز، کہیں پتھریلے ساحلی کنارے ہیں تو کہیں ساحل پر ریت کی خوبصورت چادریں بچھی ہوئی ہیں۔ موریشس میں گھنے جنگلات بھی ہیں لیکن خاص بات یہ ہے کہ یہاں سانپ، بچھو بالکل نہیں اور نہ کوئی درندہ جانور ہے جو انسانوں کو نقصان پہنچاتے ہوں۔ یہاں کا موسم خوشگوار رہتا ہے۔۔۔۔۔۔موریشس گنّے کی کاشت کی وجہ سے مشہور رہا ہے۔ گنے کی مٹھاس کی طرح یہاں کے لوگوں کے اخلاق میں بھی میٹھاس پائی جاتی ہے۔''

اسی طرح سے جب مصر، ہرات وغیرہ کا تعارف کراتے ہیں تو زمین کا کم زمان ومکان کا تعارف زیادہ ہوتا ہے۔ زمین تو ساری دنیا کی ایک جیسی ہوتی ہے۔ تہذیبی شناخت تو زمان ومکان سے ہی ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ یہی زمان ومکان اور تاریخ وجغرافیہ سے ہی کلچر وجود میں آتا ہے۔ اور

کلچر سے ہی قومیں کلچرڈ ہوتی ہیں۔سفر نامہ ان سب کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

اکثر یہ ہوتا آیا ہے کہ سفر نامہ لکھنے والوں نے دیارِ غیر میں مہینوں برسوں قیام کرکے لمبے لمبے سفر نامے لکھے ہیں۔اس لیے ان کے مقابلے میں خواجہ اکرام کے یہ سفر نامے چھوٹے محسوس کیے جا سکتے ہیں اور عین ممکن ہے کہ ان میں تشنگی کا احساس بھی رہے۔لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بعض قانونی اور دفتری مجبوریوں کی وجہ سے خواجہ کا قیام اکثر مختصر سا ہی رہا اور قیام مختصر ہو تو سفر نامہ لکھنا ایک بڑا امتحان تو ہوتا ہی ہے۔قلیل مدت میں طویل سفر نامے کس طرح لکھے جا سکتے ہیں۔اس لیے ان میں ایک تعارف بھی ہوگا۔ایک ایسی جھلک جو دجلہ کو قطرہ میں پیش کر سکے۔یہی تو فن ہے شاعری کا اور سفر نامہ کا بھی جس سے خواجہ اکرام کامیابی سے گزر گئے ہیں۔اس اعتبار سے ان کے یہ سفر نامے قابل تحسین ہیں اور لائق مطالعہ بھی ہیں۔

چلتے چلتے ایک اور بات مطالعہ میں آئی ہے وہ یہ کہ اردو زبان وادب کا یہ لائق فرزند اور مخلص سفیر جہاں بھی سفر کرتا ہے، جس ملک میں جاتا ہے اپنی مادری زبان اور تہذیب و تجسیم، تعلیم و تدریس سے کبھی الگ نہیں ہوتا۔اکثر ان کی نظریں اپنی مادری زبان اور تہذیب کو ہی تلاش کرتی ہیں نیز یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ترقی اور تیزی سے بدلتی ہوئی اس دنیا میں اردو زبان کس ملک میں کہاں اور کیسے ہم آہنگ ہو کر اپنا نیا کینڈا تیار کر رہی ہے۔اگر میں یہ کہہ دوں کہ قدیم اردو کو جدید ٹیکنالوجی سے رشتہ جوڑ کر جس قدر خواجہ اکرام نے دیکھا اور سمجھا ہے شاید کسی دیگر اردو والے نے نہیں، تو شاید غلط نہ ہوگا۔اس کے باوجود ان کی تحریر و تخلیق میں اور ان کی شخصیت میں مشرقی بوباس رچی بسی ہے جس سے ان کے سفر ناموں میں ایک عجب مانوس رنگ اور بے تکلف سا نکھار آ گیا ہے جسے بس محسوس ہی کیا جا سکتا ہے اور شعر و ادب تو محسوسات کا ہی ایک غیر شعوری عمل ہوتا ہے۔ان سفر ناموں میں یہ اوصاف نظر آئے۔جس کی بنیاد پر میں انھیں پڑھے جانے کی سفارش کرتا ہوں۔

میں اس کتاب کا، ان سفر ناموں کا دل سے خیر مقدم کرتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ ان کا زاویۂ نگاہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

الہٰ آباد

علی احمد فاطمی

○○○

محمد رکن الدین
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

مصنف کا مختصر تعارف

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین سینٹر آف انڈین لینگویج، اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ اردو زبان وادب کے خدمات کے حوالے سے وہ بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔ ۲۰ سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی چند کتابوں کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی اکثر کتابیں ہندستان اور بیرون ممالک یونیورسٹیز کے نصاب میں شامل ہیں۔ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کو ان کی علمی وادبی کارکردگی کے عوض کئی ملکی اور بین الاقوامی اعزازات و انعامات مل چکے ہیں۔ جن میں جاپان، ڈنمارک، جرمنی اور ترکی کے علاوہ ہندستان کے مختلف علمی وادبی اداروں کے نام شامل ہیں۔

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین تین سال تک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزرات برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند میں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ اپنے ڈائریکٹر شپ کے دوران انھوں نے قومی کونسل کی کارکردگیوں میں نئی اسکیموں کے نفاذ سے قابل قدر اضافہ کیا۔ انہی کی مدت کار میں کونسل سے بچوں کا ماہنامہ ''بچوں کی دنیا'' کا اجرا ہوا اور ''عالمی اردو کانفرنس'' کی بنیاد پڑی۔ انھوں نے اردو کو نئی ٹکنالوجی سے جوڑ کر اردو کے فروغ کے امکانات کو وسیع کیا۔

اردو کے نئے امکانات کی تلاش میں وہ مستقل سرگرم رہے ہیں اسی لیے کونسل کی مدت کار کے اختتام کے بعد بھی وہ اس سمت میں کام کرتے رہے۔ دنیا بھر میں موجود اردو سیکھنے والوں کے لیے انھوں نے آن لائن اردو لرننگ (www.onlineurdulearning.com) کا پروگرام شروع کیا جسے دنیا بھر میں مقبولیت حاصل ہوئی۔

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کے چئیر مین ہیں جو ایک غیر سرکاری خود مختار ادارہ ہے۔اس ادارے کا مقصد دنیا کے مختلف گوشوں میں موجود اردو کے اساتذہ/ ادیبوں/ شاعروں/فکشن نگاروں/صحافیوں/طلبہ وطالبات اور قلم کاروں سے رابطہ واشتراک اور باہمی تعاون، نئی نسل کے ادیبوں اور قلمکاروں کی حوصلہ افزائی، اردو تدریس کے فروغ کے لیے ممکنہ وسائل کی فراہمی کی کوشش، اردو کے مہجری ادیبوں کی کتابوں کی اشاعت، اردو کی نئی کتابوں پر تبصرے اور اس کی رسائی کے امکانات کی تلاش اور مہجری ادیبوں پر مبنی انسائیکلو پیڈیا کی تیاری ہے۔

گذشتہ دو دہائیوں سے www.khwajaekram.com ویب سائٹ جاری رکھے ہوئے ہیں۔اس کے ذریعے دنیا بھر میں موجود اردو کے ادیبوں سے جڑے ہوئے۔انھوں نے دنیا کے ان ممالک کا سفر بھی کیا ہے جہاں جہاں اردو کی بستیاں موجود ہیں۔پروفیسر خواجہ اکرام نے مہجری ادب پر خود بھی بہت کام کیا ہے اور اپنے کئی ریسرچ اسکالرس سے تحقیقی مقالے بھی لکھوائے ہیں۔

محمد رکن الدین
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

○○○

پاکستان کتنا دور کتنا پاس

(فیصل آباد، پشاور اور لاہور)

ہندستان اور پاکستان کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں دونوں پڑوسی ملک ہیں۔ دوری کے اعتبار سے بہت نزدیک ہیں۔ لیکن کئی اعتبار سے بہت دور ہیں۔ اسی لیے لگتا ہے کہ جیسے یہ خوابوں کا ملک ہو۔ میں نے اس ملک کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا کہ یہ کوئی غیر ملک ہے بلکہ ہمیشہ یہی جانا کہ یہ ہمارے ملک کا ہی ایک حصہ ہے جو اب ہم سے الگ ہو گیا ہے۔ لیکن یہ سرزمین دو سرحدوں میں بٹ جانے کے بعد بھی ایک دوسرے سے الگ نہ ہو سکی اس کی وجہ ان دونوں مما لک کے درمیان ہزاروں برس کے جذباتی، ثقافتی، تہذیبی اور اقتصادی روابط ہیں۔ اسی لیے ہزار کدورتوں کے بعد بھی ان رشتوں کو نہ تو ختم کیا جا سکا ہے اور نہ ختم کیا جا سکتا ہے۔ اب بھی پاکستان اور ہندستان کے لوگ ناہموار سفارتی تعلقات کے باوجود ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور کتنے ہی لوگ ملنے کی آرزو لیے ہوئے جی رہے ہیں۔ اب تک مجھے کوئی ایسا پاکستانی نہیں ملا جو ہندستان آنے کی تمنا نہ رکھتا ہو۔ یا کوئی ایسا ہندستانی نہیں ملا جو پاکستان جانے کی خواہش نہ رکھتا ہو۔ دنیا میں یہی دو مما لک ایسے ہیں جو فطری اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب تر ہیں اور سیاسی روابط کے اعتبار سے بہت دور۔ شاید دنیا میں یہ ایسے مما لک ہیں جہاں کا ویزا حاصل کرنا ہندستانیوں اور پاکستانیوں کے لیے سب سے مشکل ہے اور اگر مل بھی گیا تو مخصوص شہر اور مخصوص مقامات کے لیے۔ اس پر طرہ یہ کہ آپ جہاں جہاں جائیں پولیس تھانے میں رپورٹ درج کرائیں۔ یہ سلوک دونوں طرف سے ہوتا ہے لیکن انہی مما لک میں اگر ہندستانی اور پاکستانی کے علاوہ کسی اور ملک کا شہری آتا ہے تو نہ اسے رپورٹ کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے اور نہ کسی خاص مقام یا شہر کی پابندی اس

پر عائد ہوتی۔ جس ملک کے باشندے ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں اُن پر اتنی پابندیاں اور جن کا کوئی واسطہ نہیں وہ پاکستان یا ہندستان کی گلی گلی کی خاک چھان سکتا ہے۔ جو سچا ہندستانی یا پاکستانی ہے وہ سفارتی جواز کے ساتھ اپنے پڑوسی ملک میں جا کر کوئی غلط کام نہیں کرسکتا۔ اور غلط کام کرنے والے سرحد پر ہزار چوکسی برتنے کے بعد بھی دراندازی کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے دونوں حکومتوں کو چاہیے کہ ان ناروا اصولوں اور ہتک آمیز سلوک سے اپنے اپنے شہریوں کو بخش دیں۔ کیونکہ جس قدر آمدورفت کا سلسلہ شروع ہوگا اسی قدر غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا اور اسی قدر دونوں ممالک قریب تر آئیں گے۔ اگر دونوں ممالک کے درمیان رشتوں کی تلخیاں ختم ہو جائیں تو ایشیائی ممالک میں ان کا مقام کچھ اور ہوگا۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ جلد ایسے دن دیکھائے۔

فیصل آباد کا سفر:

اگست 2006 میں پاکستان کا یہ میرا پہلا سفر تھا۔ پاکستان دیکھنے اور اس سرزمین پر اپنی مشترکہ تہذیب کے نقوش کے دیدار کا بہت دنوں سے اشتیاق تھا۔ اللہ سے بہت دعائیں کی تھیں کہ خدا کبھی اس ملک کا سفر نصیب کرے سو اللہ نے میری سن لی۔ ایک دن میرے محسن پروفیسر عبدالحق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے فون پر مجھ سے دریافت کیا کہ کیا آپ ایک سیمنار کے لیے پاکستان جانا پسند کریں گے؟ میں نے فوراً لبیک کہا کیونکہ ہمارے دل کی مراد پوری ہونے والی تھی۔ جی۔ سی۔ یونیورسٹی، فیصل آباد سے محترمہ صباحت قمر کا دعوت نامہ بذریعہ میل آ گیا۔ عنوان بہت عمدہ تھا ''اکیسویں صدی میں اردو تحقیق وتنقید''۔ میں نے اپنی رضامندی کے ساتھ شکریہ بھی کہا اور جلد ہی اپنا پیپر ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بالآخر 28 / اگست کو وہ دن آ ہی گیا۔ ہم پروفیسر عبدالحق صاحب کی سربراہی میں پاکستان کے لیے روانہ ہوئے۔ دہلی سے ہماری فلائٹ شام چار بجے کی تھی مگر اتفاق سے اس دن ہندستان اور پاکستان میں طوفانی بارش ہو رہی تھی۔ اس سبب سے ہماری فلائٹ چار گھنٹے تاخیر سے دہلی پہنچی اور ہم پانچ گھنٹے تاخیر سے لاہور پہنچے۔ تاخیر کے سبب ہمارے لیے لاہور ائیر پورٹ پر منتظر صاحبان کو کافی انتظار کرنا پڑا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس سفر میں

میرا ایک بھائی مجھے ملنے والا ہے۔لاہور ائیر پورٹ سے باہر نکلتے ہی ڈاکٹر جمیل اصغر تپاک سے اور انتہائی خاکساری سے ملے۔ پروفیسر عبدالحق سے ان کی بارہا کی ملاقات تھی۔انھوں نے میرا اور پروفیسر ابن کنول کا تعارف کرایا۔ہم لوگ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ ان سے کہیں کہ آپ کو انتظار کی زحمت ہوئی۔اس سے پہلے کہ ہم کچھ کہتے انھوں نے معذرت پیش کی کہ آپ لوگوں کو پریشانی اٹھانی پڑی۔ باہر ہوا میں خنکی بھی تھی اس لیے جمیل صاحب جلدی سے ہمیں گاڑی کے طرف لے گئے۔ انتہائی آرام دہ کار میں ہم سوار ہوئے۔ میں بہت خوش تھا اور ہر چیز کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ جو چیز مجھے سب سے زیادہ اچھی لگی کہ ہر شخص ایک دوسرے کو سلام ہی کر رہے تھے۔ہم ہندستان میں سامنے والے کو دیکھ کر یا تو سلام کرتے ہیں یا آداب پیش کرتے ہیں کیونکہ پاکستان کی طرح وہاں سب مسلمان نہیں ہیں۔ طے یہ تھا کہ ہمیں پہلے لاہور میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے گھر جانا ہے۔ان سے ملاقات اور ناشتے کے بعد فیصل آباد کے لیے نکلنا ہے۔مگر بہت تاخیر ہونے کی وجہ سے ان سے معذرت کر لی گئی اور اگلے دن فیصل آباد میں ملاقات ہونا طے ہوا۔

ہماری کار بلا تاخیر لاہور سے فیصل آباد کے لیے روانہ ہوئی اور کچھ ہی دیر میں ہم موٹر وے پر آ گئے۔موٹر وے پر سفر کرنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔موسم بھی کافی سہانا تھا۔میرے برابر جمیل صاحب بیٹھے تھے وہ اتنی محبت سے باتیں کرنے لگے کہ بس ہم باتوں میں ہی لگے رہے اور سفر کا اندازہ بھی نہیں ہوا۔لیکن یہ اندازضرور ہوا کہ پاکستان کے لوگ بڑے پُر خلوص اور مہمان نواز ہوتے ہیں۔رات گیارہ بجے ہم گیسٹ ہاؤس پہنچے۔ وہاں منتظمین ہمارے لیے منتظر تھے۔سب سے پہلے ڈاکٹر رابعہ سرفراز نے ہمارا استقبال کیا۔اس کے بعد ڈاکٹر ریاض مجید اور ڈاکٹر محمد عقیل صاحبان سے مل کر حیرت ہوئی کہ ادب میں اتنا اونچا مقام رکھنے والی شخصیات اتنی محبت اور خاکساری سے ملیں گی،اس کی توقع نہیں تھی۔انھوں نے ہمارے انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اس لیے ہم ایک ساتھ کھانے کی ٹیبل پر بیٹھ گئے۔پُر تکلف کھانے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں آرام کے لیے چلے گئے۔ ہندستان سے روانہ ہوتے وقت طرح طرح کے خدشات تھے اور گھر والے بھی متفکر،کیونکہ دنوں ملکوں کے حالات ہی ایسے نشیب وفراز سے گزرتے رہتے ہیں۔لیکن

ان احباب سے مل کر ساری تشویش دور ہوگئی۔تشویش کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں مسلم مما لک کے حالات پر کالم لکھتا رہا ہوں۔کئی کالم میں پاکستانی سیاست کو نشانہ بھی بنایا تھا اس لیے اندر اندر ہی ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں کوئی مجھ سے کچھ پوچھ نہ لے۔کئی ایسی خبریں بھی پڑھی تھیں کہ پاکستان میں کئی ہندستانی صحافیوں کے کمروں میں رات کو ریڈ ہوئی اور ان سے تفتیش بھی ہوئی۔ ہندستان میں بھی ایسا ہوا ہے۔اس لیے میرا ڈرنا فطری تھا۔ رات کو ڈاکٹر جمیل میرے ساتھ ہی میرے کمرے میں رکے تو سکون ملا۔صبح ناشتے کے بعد ہم کانفرنس میں شریک ہوئے۔ پاکستانی اردو ادب کی تمام مشہور شخصیات سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔

پہلے ہی دن میرا پیپر تھا جس کا عنوان تھا ''سائبر اسپیس اور اردو کی تدریس'' بہت سے لوگوں کو یہ عنوان عجیب لگا۔(کیونکہ اس وقت ڈیجیٹل میڈیا اور سوشل میڈیا کا رواج بہت کم تھا۔ اردو یونی کوڈ کا رواج تقریباً نہیں کے برابر تھا)اس عنوان کے تحت میں نے آن لائن اردو تدریس کے امکانات اور ٹکنالوجی میں اردو کے استعمال پر بات کی تھی۔(بعد میں اسی موضوع پر میری کتاب ''اردو زبان کے نئے تکنیکی وسائل اور امکانات'' منظر عام پر آئی)میرے علاوہ دیگر تمام مقالات عہد حاضر کے تنقیدی اور تحقیقی رویے پر تھے جو یقیناً بیش قیمت مقالے تھے۔ بعد میں یہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوئی۔

پہلے سیشن میں جب چائے کا وقفہ ہوا تو ڈاکٹر جمیل نے کہا کہ کیوں نا ہم کچھ دیر کے لیے کہیں باہر چلیں۔ بات یہ تھی کہ پاکستان دیکھنا ہی میرا مقصد تھا سو میں نے بغیر کسی تامل کے ہاں میں ہاں ملا دی اور کسی مصلحت کو نہیں دیکھا اور نہ ہندستانی ہونے کے ناطے کسی پابندی کا احساس رہا۔ ہم نے چائے پی اور موٹر سائیکل پر جمیل صاحب کے ساتھ ان کے گاؤں کے لیے نکل پڑے۔ان کا گاؤں بمشکل تمام دس یا پندرہ کیلومیٹر کی دوری پر تھا۔وہ پہلے اپنے گھر لے گئے جہاں ان کے والدین اور بھابھی سے ملاقات ہوئی۔کس قدر جوش و ولولے کے ساتھ وہ ملے اور کتنا والہانہ استقبال کیا یہ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ پیار و محبت اور پُر خلوص ضیافت کے بعد جمیل صاحب ایک ٹیلر کے پاس لے گئے اور پوچھا کہ آپ کو پاکستانی کرتا پائجامہ کیسا لگتا ہے؟ میں نے

اشتیاق سے اثبات میں سر ہلایا تو انھوں نے دو کرتے پائجامے کے کپڑے پسند کروائے اور ٹیلر کو جلد تیار کرنے کی ہدایت کردی۔ پاکستان لوٹنے سے پہلے یہ سلے سلائے کپڑے انھوں نے تحفے میں مجھے پیش کیا۔گاؤں جاتے وقت کسی اور راستے سے گئے واپسی کسی اور راستے ہوئی تا کہ پاکستان کے دیہی علاقوں کو دیکھا جا سکے۔ لہلاتے کھیت اور باغات اور سرسبز زمین بہت دیدہ زیب مناظر تھے۔ ہم شاید دو گھنٹے میں واپس آ گئے تھے لیکن جونہی یونیورسٹی کے گیٹ سے داخل ہوئے صباحت قمر حیران و پریشان تقریباً دوڑتی ہوئی آئیں اور پوچھا کہاں غائب تھے؟ ہماری حالت تو خراب ہو رہی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس طرح میرے جانے سے کہرام مچ جائے گا۔ دراصل پولیس اور خفیہ محکمے کے افسران کی تمام ہندستانیوں پر گہری نظر تھی۔ میری عدم موجودگی ان کے لیے باعث تشویش تھی۔ اسی لیے منتظمین کو بار بار پوچھ رہے تھے۔ خیر مجھے تو انھوں نے صرف اتنا ہی کہا مگر مجھے اندازہ ہے کہ ڈاکٹر جمیل کو بہت کچھ کہا گیا ہوگا کہ یوں کسی ہندستانی کو بغیر پولیس کی اجازت کے کہیں نہیں لے جاتے۔ خیر شام کو جب کانفرنس ختم ہوئی تو باضابطہ انھیں آگاہ کر کے ہم ڈاکٹر جمیل کے ساتھ فیصل آباد جسے ایشیا کا مانچسٹر کہا جاتا ہے، وہاں کپڑوں کی شاپنگ کے لیے گئے۔ پہلے کرنسی تبدیل کرائی اور جب کپڑوں کی قیمت معلوم کی تو ایسا لگا جیسے یہ انتہائی کم قیمت میں مجھے مل رہے ہیں۔ اس کی وجہ کرنسی کی قیمت تھی۔ ہندستانی کرنسی کے بدلے ہمیں دوگنے پاکستانی روپے ملے تھے۔ دوسرے دن بھی کانفرنس کی ہماہمی رہی۔ اختتامی اجلاس میں پنجاب کے گورنر محترم مہمان خصوصی تھے۔ تاثرات کے لیے مجھے بلایا گیا تو میں نے وہی بات کہی جو میرے دل میں تھی۔ میں نے کہا کہ جب مجھے دعوت نامہ ملا تھا تو سوچا تھا صباحت اور رابعہ کوئی معمر خاتون ہوں گی، جن کے بال سفید ہوں گے۔ لیکن ان جواں سال خواتین اور ان کی محنت کو دیکھ کر اندزہ ہوا کہ پاکستان کی خواتین کسی بھی میدان عمل میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ یہ بات پاکستان کے روشن مستقبل کی علامت ہے۔ انھوں نے جس انداز سے کانفرنس کا اہتمام کیا، مہمانوں کا خیال رکھا اور شایان شان استقبال کیا یہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔

فیصل آباد میں یہ ہماری آخری رات تھی۔ ہمارے کمرے میں اس دن ماہر اقبالیات ڈاکٹر

صابر کلوروی آ گئے تھے۔ دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے بہت محبت اور شفقت سے تمام تعلیمی احوال دریافت کیے۔ پھر جب صبح ہماری نیند کھلی تو دیکھا کہ صابر صاحب نہیں ہیں۔ شاید وہ جا چکے تھے۔ میں نے کروٹ لی تو سامنے ایک رقعہ پر نظر پڑی۔ اسے کھولا تو اس میں کچھ پاکستانی روپے رکھے ہوئے تھے اور رقعہ پر لکھا تھا۔ ''آپ کی نیند خراب نہ ہو اس لیے الوداعی سلام نہیں ہوسکا۔ یہ ہماری طرف سے آپ کے بچوں کے لیے کچھ روپے ہیں اس سے ضرور کچھ تحفہ خرید لیں۔'' اللہ مرحوم کو جنت بخشے کتنے نیک اور شریف انسان تھے۔ اپنے چھوٹوں سے خوب شفقت کرتے تھے۔ ان کے اس اخلاق سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ اس کے بعد ان سے دہلی میں ایک بار ملاقات ہوئی اور جب میں دوبارہ پاکستان گیا تو ان کے انتقال کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی اس لیے سوائے دعائے مغفرت کے ان کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔

سیمنار کے بعد کا آخری دن اس لیے کوئی کام نہیں کر سکا کیونکہ اسی دن بگٹی صاحب کے ساتھ فوج کی کاروائی ہوئی تھی اس لیے تمام شہر سنسان تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت محدود تھی۔ اس کے اگلے دن علی الصباح دو گاڑیوں سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ ویزا لاہور کا نہیں تھا مگر اصول یہ ہے کہ کسی شہر میں ٹرانزٹ کے طور پر چوبیس گھنٹے سے کم قیام کر سکتے ہیں۔ ہماری گاڑی میں صباحت صاحبہ، جرمنی کے ایک مہمان اور پروفیسر ابن کنول تھے۔ پہلے وہ ہمیں اپنے گھر لے گئیں۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اپنے والدین سے کہا کہ ان کا آج یوم ولادت ہے اس لیے انھیں مبارکباد دیں۔ لیکن یہ تو ہماری تاریخ پیدائش نہیں تھی۔ مجھے حیرت میں دیکھ کر انھوں نے قرۃ العین حیدر کا یہ جملہ سنایا کہ 'جن نے لاہور نئیں دیکھیا وہ جمیا نئین' چونکہ ہم نے پہلی دفعہ لاہور دیکھا تھا اس لیے ان کا یہ جملہ برمحل لگا۔ معاً بعد کھانے کی ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ بڑی بڑی روٹیاں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اتنی بڑی روٹیاں ہندستان میں نہیں بنتیں۔ جتنی بڑی روٹی تھی اس سے تو ہمارے یہاں چار روٹیاں بن جاتی ہیں۔ تب صباحت نے بتایا کہ یہاں ایسی ہی روٹیاں بنتی ہیں۔ کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ان کے والد محترم نے تحفے میں ہمیں پاکستانی کپڑے دئے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ یہاں کہ لوگ کتنے مہمان نواز ہیں۔ پہلی ملاقات میں اس قدر عزت افزائی اور اتنے تحائف۔

شام ہوتے ہی ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے دولت کدے پر پہنچ گئے۔ رات یہیں

قیام کرنا تھا۔ یہاں بھی خوب ضیافتیں ہوئیں اور تحائف ملے۔صبح ہوتے ہی ائیر پورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ہم سبھوں کے پاس مقررہ وزن سے زیادہ سامان ہوگیا تھا فکر اس بات کہ تھی کہ نجانے کتنی اضافی رقم ادا کرنا ہوگی۔لیکن جناب مجھے یہاں بھی ائیر پورٹ کے افسران کا سلوک مثالی نظر آیا۔ایک تو انھوں نے ہمارے بیگ دیکھے جس پر فیصل آباد جی سی یونیورسٹی لکھا ہوا تھا۔تو پوچھا آپ کیا کرتے ہیں؟ جب انھیں معلوم ہوا کہ ہم یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں اور ہندستانی ہیں تو انھوں نے بڑی محبت دیکھائی اور کسی سے کوئی اضافی فیس نہیں لی۔ بلکہ بڑی نرمیت اور خلوص سے ہمارے احوال دریافت کیے۔اس طرح بے شمار تحائف اور خوشگوار یادیں لیے ہم ہندستان واپس آ گئے۔ یہ یادیں اب تک ذہن پر نقش ہیں۔ پاکستانی احباب کا خلوص، مہمان نوازی اور اخلاق یقیناً بے مثل ہے۔

پشاور کا سفر:

پشاور یونیورسٹی ٹیچرس ایسوسی ایشن کی دعوت پر دوسری بار جولائی 2008 میں پاکستان کے لیے روانہ ہوا۔ میر کارواں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے استاد پروفیسر چمن لال ،صدر ہندستانی زبانوں کا مرکز، تھے۔ دیگر ہمراہان ڈاکٹر اخلاق احمد آہن، ڈاکٹر رمن پرساد سنہا اور ڈاکٹر محمد کنجو تھے۔ ویزا ملنے کی داستان بھی عجیب ہے دعوت نامہ ایک ماہ قبل مل چکا تھا اور سیمنار کے موضوع ''اعلیٰ تعلیم :رجحانات اور امکانات'' پر مقالے بھی تیار کر لیے گئے۔ میزبانوں نے کہا کہ 12 جولائی تک ویزا مل جائے گا اور آپ افتتاحی تقریب میں ضرور شامل ہوں۔ کیونکہ پروفیسر چمن لال کو اس نشست کی صدارت کرنی تھی۔چمن لال صاحب، مستقل سفارتخانے کے رابطے میں رہے۔متعلقہ آفیسر نے ہمیشہ یقین دہانی کرائی کہ وقت پہ ویزا مل جائے گا۔مگر 12 سے 17 تاریخ بھی گزر گئی اور ویزا نہ مل سکا۔اچانک 17 کی شام سفارتخانے سے فون موصول ہوا کہ آپ حضرات تشریف لائیں اور ویزا لے جائیں۔آفیس کے اوقات تقریباً ختم ہو چکے تھے اس لیے حیرت ہوئی کہ یہ کرم فرمائی چہ معنی دارد؟ اسی موضوع پہ ہم احباب گفتگو کر ہی رہے تھے کہ ہمارے میزبان ڈاکٹر ارباب آفریدی ، صدر پشاور یونیورسٹی ٹیچرس ایسوسی ایشن و صدر آل پاکستان

یونیورسٹی ٹیچرس و اسٹاف فیڈریشن کا فون آیا۔انھوں نے کہا کہ ہم نے اسلام آباد میں پریس کانفرنس کرکے سخت احتجاج کیا ہے کہ ہمارے ہندستانی دانشوروں کو کن اسباب کے تحت ویزا نہیں دیا گیا؟اس پریس کانفرنس میں انھوں نے پاکستانی میڈیا کو یہ بھی بتایا کہ ہم پاکستانیوں کو بھی ویزا ملتا رہا ہے اور ہندستانی دانشوروں نے ہمیشہ والہانہ استقبال کیا ہے۔اس کے جواب میں ہمارے ملک نے یہ سلوک کیا ہے۔پریس کانفرنس کے بعد پاکستان کے تمام اخبارات نے اس خبر کو شائع کیا اور تمام ٹی وی چینلس میں اسے کور کیا گیا۔اس کے بعد سفارتی عملہ متحرک ہوااور آپ کو ویزے دئے جارہے ہیں۔اس طرح ناوقت فون کا رزا معلوم ہوااور 18 کی شام کو ہمیں ویزا مل گیا اور ہم 19 جولائی کی صبح دہلی لاہور بس کے ذریعے سفر پر روانہ ہوئے۔بس کا سفر ہم سبھوں کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔دہلی سے واگھہ تک پولیس کی گاڑی آگے آگے چلتی رہی۔اس کے مخصوص سائرن کی آواز سے لوگ بس کی جانب متوجہ ہوجاتے اور ہاتھ ہلا ہلا کر مسافروں کو سفر کی مبارکباد پیش کرتے رہے۔یہی حال سرحد پار بھی رہا۔دراصل یہ بس کی حفاظت کے لیے تھا کیونکہ ایک دو ناخوشگوار واقعات بھی رونما ہوچکے تھے۔خیر ہم بخیر وخوبی واگھہ بارڈر پہنچے۔امیگریشن کے بعد پاکستانی امیگریشن جو مشکل سے پانچ سو میٹر کی دوری پر تھا۔وہاں بھی ضروری کاروائیاں مکمل کیں۔وہاں سے نکل کر ہم پاکستان کی سرزمین میں داخل ہوئے۔

واگھہ سے ایک کیلومیٹر کے بعد ہماری بس نہر کے کنارے چلتی رہی یہ بہت ہی خوشنما منظر تھا۔یہ کنارے دراصل تفریح گاہ تھے۔بچے، بوڑھے نوجوان نہر میں غوطے لگارہے تھے۔گرمی کا دن تھا۔نہر کے دونوں کنارے لوگ اپنی فیملی کے ساتھ کہیں چائے پی رہے تھے تو کہیں کھیل کود اور خوش گپیوں میں مشغول تھے۔کچھ عورتیں بھی نقاب کے ساتھ نہر کے ٹھنڈے پانی میں نہا رہی تھیں۔اسے دیکھ کر ہمارے غیر مسلم ساتھیوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ واقعی یہ عجیب بات ہے ہم نے پاکستان کے بارے میں سنا تھا کہ لوگ بہت ہی قدامت پسند ہیں اور عورتوں پر سخت پابندیاں ہیں۔لیکن یہ تو اپنی تہذیب کے ساتھ تفریح بھی کرسکتی ہیں۔یقیناً یہ ہمارے لیے نئی بات ہے۔ بہرکیف واگھہ سے 50 منٹ کا یہ سفر دیکھتے ہی دیکھتے گزرگیا۔سورج کی ڈوبتی کرنوں کے ساتھ ہم

لاہور پہنچ چکے تھے۔ مگر ذہن میں اس سہانی شام نے جونقوش بنائے وہ ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے ایڈیشنل رجسٹرار پروفیسر اورنگ زیب عالمگیر صاحب کو ہم نے بتایا تھا کہ ہم لاہور آ رہے ہیں مگر اسی شام پشاور کے لیے روانہ ہوں گے۔ شاید آپ سے واپسی پر ملاقات ہو لیکن ان کی محبتوں کے ذکر کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ وہ شام کو اپنی اہلیہ کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ انھوں نے چائے اور کھانے کے لیے مدعو کیا مگر ہمیں پشاور جانا تھا اور جناب پروفیسر مختار درانی ہمارے استقبال کے لیے پشاور سے آ چکے تھے اس لیے ہم لاہور میں بہت دیر نہیں رک سکے لیکن ان کی دعوت قبول کر لی اور 24 جولائی کو لاہور آنے کا وعدہ کر لیا۔

پشاور میں یہ ضرب المثل بہت مشہور کہ جب لوگ کسی کو خوش مذاقی میں بددعا دیتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ 'خدا تمھیں کسی پٹھان کا مہمان بنا دے' یہ بات ہمیں پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عظمت حیات خان صاحب نے بتائی تھی جب ہم ان کی دعوت پر ان کے گھر شام کی پُر تکلف چائے پر مدعو تھے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ قبائلی علاقوں میں پہلے یہ دستور تھا کہ لوگ اگر ایک دوسرے کے خلاف مہینوں سے سخت جنگ بھی کر رہے ہوتے اور درمیان اگر کوئی مہمان آ جاتا تو مہمان کی آمد کے اعلان کے ساتھ ہی جنگ بندی شروع ہو جاتی اور دونوں فریق مل کر مہمان کی خاطر تواضع کرتے۔ اب یہ ہمارے لیے خوش بختی بھی تھی اور حیرانی کا سبب بھی کہ ہم لوگ پٹھان کے مہمان تھے۔ یہ اپنے مہمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟ اس کی تشویش اور تشویق میں ہم مبتلا تھے۔ ڈاکٹر مختار درانی کو دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔ درانی صاحب آٹھ گھنٹے کا سفر طے کر کے ہمیں لینے کے لیے لاہور پہنچے تھے اور اب ہمارے ساتھ بھی انھیں مزید آٹھ گھنٹے کا سفر بذریعہ کار طے کرنا تھا۔ لاہور بس اسٹینڈ پر ہمیں دیکھتے ہی لپٹ گئے اور فرط جذبات میں اپنی کہانی سنانے لگے کہ اگر آپ لوگوں کو ویزا نہ ملتا تو ہماری تحریک اور احتجاج کا سلسلہ شروع ہو چکا ہوتا۔ ہم نے اپنے حکام سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہندستانی دانشوروں کو ویزا نہ دینے کی وجہ کیا تھی؟ کیا وہ چورا چکے ہیں کہ انھیں تعلیمی کانفرنس میں آنے سے روکا جا رہا ہے۔ یہ اور اس طرح کی باتیں وہ کرتے رہے تا کہ ہم ویزا کے لیے جن پریشانیوں سے

گزرے ہیں اس کا ازالہ ہو جائے۔ یہ باتیں ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھیں ہم پاکستان کے خوبصورت موٹروے پر آ گئے۔ اس موٹروے کو 'فخر پاکستان' بھی کہا جاتا ہے۔ واقعی جس طرح اسے مینٹین کیا جا رہا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی ہم قیام وطعام کے لیے بنے ایک خوبصورت اسٹاپ پر رُکے۔ انتہائی صاف وشفاف اور کشادہ احاطہ جس میں تمام سہولیات کے ساتھ ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد بھی تھی۔ یہاں ہم نے چائے پی اور مختار صاحب یہ بھی لیں، یہ بھی لیں کا اصرار کرتے رہے۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم لوگ کھانے کے لیے ایسے ہی ایک پُر فضا مقام پر رکے۔ مختار دارنی صاحب نے انتہائی پُر تکلف کھانا کھلوایا اور بار بار وہ یہ پوچھتے رہے کہ باقی احباب کیوں نہیں آئے؟ دراصل انھوں نے ہندستان سے 16 لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ آنا تو سب چاہ رہے تھے مگر ہم پانچ دیوانوں کی طرح کوئی اور نہیں تھا کہ محض چھ سات گھنٹے میں سفر کی تیاری کر لیتے۔ اس کا سہرا بھی پروفیسر چمن لال کے سر جاتا ہے جن کی تحریک نے ہمیں اس سفر کا موقع دیا۔

درانی صاحب نے ہمیں بتایا کہ ہم رات کے تین چار بجے تک پشاور یونیورسٹی کے سمر کیمپ باڑہ گلی پہنچ جائیں گے۔ ہم لوگ بس اور کار کے سفر سے تھک چکے تھے۔ اس کا احساس درانی صاحب کو بھی تھا اس لیے وہ ہر طرح سے باتوں میں الجھائے رہے تاکہ راستہ کٹ جائے۔ حالانکہ وہ خود بھی ہم سے زیادہ تھکے ہوئے تھے۔ لیکن ان کی دلچسپ گفتگو بھی جاری رہی اور ہم میں سے کچھ احباب میٹھی نیند کی آغوش میں بھی چلے گئے۔ میں فرط اشتیاق سے چاندنی رات میں موٹروے کے سفر کے نظاروں میں کھویا رہا مگر ایبٹ آباد کے خوبصورت پہاڑوں کے دامن میں پہنچتے ہی میری بھی آنکھ لگ گئی۔ ڈاکٹر رمن جاگتے رہے اور دارنی صاحب نے جیسے نہ سونے کہ قسم کھا رکھی تھی۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ درانی صاحب کی اس آواز سے میری آنکھیں کھلیں کہ دیکھیں یہ ہمارے سمر کیمپ کا راستہ ہے۔ پہاڑوں کے نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے یہ کچی سڑک تھی جس پر ہماری کار گزر رہی تھی مگر کار میں بیٹھے اکثر لوگوں کے دلوں پر کیا گزر رہی تھی؟ اس کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ ہماری کار اونچائی پر ایک جگہ اچانک رک گئی۔ اگر خدانخواستہ یہ پیچھے کی طرف

لُڑھک جاتی تو ہم کئی سوگز کی گہرائیوں میں ہوتے۔ جیسے ہی ہماری کار گڑگڑاہٹ کے ساتھ رکنے لگی ڈاکٹر اخلاق جس تیزی سے نیچے اُترے اتنی رفتار تو ہم نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ان کے جسم میں ہلکی لرزش بھی تھی۔نہیں معلوم یہ یخ بستہ ہواؤں کے سبب تھا یا کچھ اور؟ درانی صاحب اور ڈرائیور ہم سے کہتے رہے کہ گھبرانے کی بات نہیں لیکن ہم میں سے کوئی نہیں رُکا اور ایک ہی لمحے میں ہم سب نیچے اتر چکے تھے۔معلوم ہوا کہ ہم بالکل گیسٹ ہاؤس کے سامنے کھڑے تھے۔اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ رمن، اخلاق اور ہمارا ایک ہی کمرے میں سامان پہنچایا گیا۔ایک بیڈ پر میں نے اپنا ہینڈ بیگ رکھا اور لحاف تان کر سو گیا۔صبح کے دس بجے تھے ڈاکٹر ارباب آفریدی ہمارے کمرے میں آئے تو ڈاکٹر اخلاق نے مجھے جگایا۔ڈاکٹر آفریدی گلے سے اس طرح لپٹے جیسے کئی برسوں کے بچھڑے مل رہے ہوں۔انھوں نے ہاتھ ملاتے ہوئے ہم سبھی دوستوں کو پانچ پانچ ہزار روپے پیش کیے اور یہ کہا کہ آج کا دن گھومنے کے لیے مخصوص ہے اس لیے آپ سب ہمارے ساتھ چلیں اور ان پیسوں سے اپنے گھر والوں کے لیے ہماری طرف سے تحائف خریدیں۔ ہم نے ہزار کوشش کی کہ یہ نذرانہ قبول نہ کیا جائے مگر بات پٹھان کی مہمان نوازی کی تھی۔ہم لوگ جلد ہی ناشتے سے فارغ ہوئے ہمارے لیے یونیورسٹی کی مخصوص گاڑی تیار تھی۔معلوم یہ ہوا کہ دیگر مندوبین صبح ہی دو تین بسوں میں سوار ہوکر تفریح کے لیے نکل چکے ہیں۔ ہم نے بھی ڈاکٹر آفریدی اور ڈاکٹر درانی کی ضیافت میں سارا دن مری کے پہاڑوں کی سیر میں گزارا۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد ہم سیمنار میں ہال میں پہنچے۔غیر ملکی اور پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں سے آئے مہمانوں سے ہمارا تعارف کرایا گیا۔ پہلے سیشن کی صدارت پروفیسر چمن لال نے کی۔ یہ ہمارے غیر مسلم دوستوں کے لیے انتہائی حیرت کن بات تھی کہ کرتا پائجامہ اور ٹوپی پہنے لوگ انگریزی زبان میں ملٹی میڈیا پروجیکٹر کے ذریعے اپنا پیپر پیش کر رہے تھے۔نقاب پوش خواتین نے بھی بہترین انگلش لب و لہجے میں اپنے اپنے پیپر پیش کیے۔تب انھیں اس غلط فہمی کا

اندازہ ہوا کہ پاکستان میں خواتین اَن پڑھ نہیں جتنا کہ ان کے حوالے سے میڈیا میں خبریں آتی ہیں۔سیمنار کا موضوع ''اعلیٰ تعلیم: رجحانات اور امکانات'' تھا۔زیادہ تر مقالوں میں پاکستان میں موجودہ تعلیمی صورت حال پر بات کی گئی اور حکومت نے اعلیٰ تعلیم کے لیے جو منصوبے بنائے ہیں ان کے مثبت اور منفی اثرات پر گفتگو کی گئی۔سب سے زیادہ ردعمل آوٹ سورسینگ پر تھا۔اس کے علاوہ یہ مطالبات بھی سامنے آئے کہ ہائیر ایجوکیشن ادارے میں اساتذہ کی بھی نمائندگی ہونی چاہیے تاکہ پالیسی طے کرتے وقت ان کی رائے بھی شامل ہو۔ان کی رائے اس لیے زیادہ معتبر ہو سکتی کیونکہ یہ براہ راست اس نظام سے جڑے ہوئے ہیں۔جو خاص بات اس سیمنار کی تھی وہ یہ کہ اس سیمنار میں شریک تمام طلبہ و طالبات اور اساتذہ بخوبی تمام حالات سے آگاہ تھے اور مستقبل کے امکانات پر ان کی گہری نظر تھی۔یہ دراصل اشارہ اس بات کا ہے کہ پاکستان میں نئی نسل اعلیٰ تعلیم کی ضرورتوں اور تقاضوں کو سمجھ رہی ہے۔اگر یہی سنجیدگی پالیسی سازوں کی بھی رہی تو بلا شبہ پاکستان میں اعلیٰ تعلیم کو نئی منزل اور نئی شناخت ملے گی۔اس آٹھ روزہ سیمنار میں ہم لوگ تین دن ہی رک سکے۔کیونکہ ہمیں 26 کو ہر حال میں واپس ہونا تھا کیونکہ ویزا صرف 27 تک کا ہی تھا لیکن 27 کو کوئی بس نہیں تھی۔اور یہ ہمارے بس میں بھی نہیں تھا کہ بس کے بجائے کسی اور سواری سے ہندستان واپس آتے۔کیونکہ ہند و پاک کے ویزا کا اصول یہ ہے کہ اگر آپ بس کے ذریعے پاکستان یا ہندستان میں داخل ہوئے ہیں تو ٹرین یا ہوائی جہاز سے واپس نہیں ہوسکتے۔اس احمقانہ نظام کے ہم بھی شکار ہوئے اور ایک دن قبل ہی پاکستان سے واپس ہونا پڑا۔

ہمیں چونکہ تکشیلا کا بھی ویزا مل گیا تھا اس لیے 22 جولائی کی دوپہر کو ہم تکشیلا کے لیے روانہ ہوئے۔خفیہ ایجنسیاں بھی ہمارے پیچھے پیچھے تھیں مگر درانی صاحب نے بتایا کہ کوئی فکر کی بات نہیں یہ ہمارے تحفظ کے لیے ہیں۔تین بجے ہم تکشیلا کے تاریخی کھنڈروں کی سیر کر رہے تھے۔میرے دوست ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر کو جب یہ اطلاع ملی کہ ہم پاکستان میں ہیں تو وہ ہمیں اسلام آباد لے جانے پر بضد تھے۔جب ہم نے ویزا نہ ملنے کی لاچاری ظاہر کی تو بہ حجت تمام وہ مان سکے اور ہم سے ملنے اپنے دوست فاروقی صاحب کے ساتھ تکشیلا پہنچے۔کوئی آدمی صوفی بھی ہو اور پرُ بہار شخصیت کا مالک بھی، ایسا کم دیکھنے کو ملتا ہے۔لیکن اس قلندر صفت دوست جو 'ساحر' بھی ہے ان

میں سب کچھ موجود ہے۔ ان کے آنے سے کھنڈروں میں بھی بہار آ گئی۔ دو گھنٹے ان کے ساتھ ہم لوگوں نے گزارا جو اس سفر کی خوبصورت یادگار بن گئی۔

شام ہوتے ہی ہم پشاور کے تاریخی شہر میں موجود تھے۔ بچپن میں ہم نے کئی کہانیاں پڑھی تھیں جو پشاور اور سرحد کے علاقوں سے متعلق تھیں۔ اس لیے اس شہر کو دیکھنے کا زیادہ اشتیاق تھا۔ یوں بھی صوبہ سرحد تاریخی اعتبار سے برصغیر میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے ہمارا پروگرام یہ تھا کہ صبح کو شہر کے گردونواح میں بھی جائیں گے۔ مگر حالات کی نزاکتوں کے سبب نہ ہم جا سکے اور نہ ہمیں جانے دیا گیا۔ صبح ہوتے ہی ڈاکٹر درانی ہمارے گیسٹ ہاؤس میں موجود تھے۔ ان کے ہمراہ ہم لوگ پشاور یونیورسٹی کے وسیع و عریض علاقے کو دیکھنے نکل پڑے۔ انتہائی خوبصورت عمارتیں اور باغات کے درمیان ہاسٹلس اور ہر جانب ہرے بھرے میدان۔ قدیم طرز کی تعلیمی عمارتیں اور صفائی کا خاص اہتمام دیکھ کر ہم لوگ بہت متاثر ہوئے۔ سب سے پہلے آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ گئے اور شعبے کے ڈین سے ملاقات ہوئی ان کی ضیافت کے بعد جب ہمیں رخصت ملی تو شعبے کے کلاس روم دیکھنے کا موقع ملا۔ خوشی ہوئی تمام کلاس روم میں ہر طرح کی جدید ٹکنالوجی کی سہولت موجود ہے۔ اس کے بعد پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عظمت حیات خان صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انتہائی خنداں پیشانی سے انھوں نے ہمارا استقبال کیا اور پُر تکلف قہوے کے بعد اپنی بیش قیمت کتابیں پیش کیں اور شام کی چائے کے لیے گھر پر مدعو کیا۔ حالانکہ وقت کم تھا مگر پٹھانوں کی مہمان نوازی کے ڈر سے لامحالہ جانا ہی پڑا۔ چونکہ دن بھر ہم لوگ ادھر ادھر گھومتے رہے اس لیے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ شام چار بجے شاید ان کے گھر پہنچے۔ شاندار روایتی طرز کی کوٹھی، وسیع دالان اور درون خانہ باغ جو مختلف طرح کے پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ گھر کے مین دروازے پر دستک دیتے ہی کئی خادم دوڑے ہوئے آئے اور دروازہ بڑے احترام سے کھولا۔ روایتی انداز میں ہمارا استقبال کیا۔ شام سہانی تھی اس لیے صحن میں ہمارے بیٹھنے کے لیے سلیقے سے میز، کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ مکان دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کسی جاگیردار یا رئیس کا روایتی مکان ہے۔ کچھ ہی دیر میں اندر سے عظمت صاحب تشریف لائے۔ والہانہ استقبال کیا۔ گفتگو شروع ہوئی ہم لوگوں نے پشاور شہر نہ دیکھ پانے کا گلہ کیا۔ انھوں نے حالات کی

ستم ظریفی بتائی۔ اتنے میں کئی خادم طشت پر کئی اقسام کے شربت لے کے آئے۔ ہم نے تازے پھلوں کے شربت سے خود کو ترو تازہ کیا۔ اتنے میں دسترخوان سمیٹ دیا گیا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی۔ لیکن فوراً بعد دوسرا دسترخوان لگا اور اب کئی طرح کے تازے پھل ہمارے لیے پیش کیے گئے۔ پھل واقعی میٹھے تھے اور ہمیں بھوک بھی لگی تھی اس لیے خوب سیر ہو کر ہم نے کھایا۔ اس کے بعد وہی عمل دہرایا گیا۔ دسترخوان سے سارے سامان اٹھا لیے گئے۔ کچھ ہی دیر میں اب طرح طرح کے پکوڑے سامنے تھے۔ پھلوں سے سیر ہو چکے تھے اس لیے زیادہ پکوڑے نہیں کھائے گئے۔ خیر صاحب ہم لوگوں کو کسی نے یہاں کی روایات کے بارے میں بتایا نہیں تھا اس لیے لاعلمی میں اپنا پیٹ بھر چکے تھے۔ اب کیا دیکھتے ہیں کہ خادم کئی اقسام کے کباب دسترخوان پر سجا رہے تھے۔ خوشبو اس کے ذائقے کی گواہی دے رہے تھے اور ہم نادانی کر چکے تھے۔ کھانے کی جگہ باقی نہیں تھی مگر صاحب جس اخلاص اور اصرار سے عظمت صاحب پیش آئے کہ کچھ نہ کچھ کھانا ہی پڑا۔ پہلی دفعہ چپلی کباب کا نام سنا۔ حیرت ہوئی کہ کباب کو چپل سے کیا نسبت لیکن جب اس کا سائز دیکھا تو اس کے نام کی مناسبت سمجھ میں آئی۔ مگر کبابوں کے ساتھ انصاف نہ کرنے کا ملال آج تک ہے۔ چائے اور قہوہ کے بعد انھوں نے بڑی محبت اور حسرت سے ہمیں رخصت کیا اور دوبارہ پشاور آنے کی دعوت دی۔

اس دن کی خاص بات یہ رہی کہ ہم سبھی یہ چاہتے تھے کہ گندھارا آرٹ کے لیے مشہور پشاور میوزیم دیکھیں لیکن اس دن تعطیل کے سبب میوزیم بند تھا۔ درانی صاحب اور ان کے احباب کی تعریف کرنی پڑے گی کہ انھوں نے کسی طرح ہمارے لیے میوزیم دیکھنے کا انتظام کیا اور ہندستانی مہمانوں کے لیے ایک گھنٹے کے لیے اسے کھلوایا گیا۔ اس غیر معمولی مدد کے لیے ہم سب ان کے بہت ہی ممنون ہیں۔ دن بھر شہر کا چکر کاٹتے رہے کہیں جانے سے منع کیا گیا تو کہیں جانا ناممکن تھا اس طرح رات ہو گئی۔ اسی رات (Volvo) ولوو کی آرامدہ بس سے ہم لوگوں کو لاہور کے لیے سفر کرنا تھا۔ ہدایت کے مطابق وقت سے ایک گھنٹے پہلے دس بجے رات ہم لوگ بس اسٹینڈ پر موجود تھے۔ جس انداز سے رپورٹینگ اور دیگر ضوابط سے گزرنا پڑا اس سے روڈ ویز پر ہوائی سفر کا شائبہ ہو رہا تھا۔ اب بس میں سوار ہونا تھا درانی صاحب اور علی اکبر خان صاحبان نے نم آنکھوں سے

ہمیں رخصت کیا۔ٹھیک گیارہ بجے ہماری بس کے خودکار دروازے بند ہوئے۔اسی کے ساتھ بس ہوسٹس نے مترنم آواز میں دعائے سفر پڑھی۔ ہمارے لیے یہ نیا تجربہ تھا کہ بس میں بھی ہوائی سفر کی طرح ہوسٹس موجود تھی۔ یہ سفر اتنی آسانی سے گزرا جس کا تصور ہم نے نہیں کیا تھا۔ایک سوبیس اور تیس کی رفتار میں بس چلتی رہی کہیں کوئی ریڈ لائٹ اور کراسنگ نہیں ملا اور نہ سڑک پر ہچکولے کھائے۔پاکستانی حکومت نے ریلویز میں تو ترقی نہیں کی مگر روڈ ویز میں جو ترقی کہ ہے وہ بلاشبہ قابل تعریف ہے۔

صبح کے ساڑھے پانچ بجے ہم لوگ لاہور شہر میں موجود تھے۔پروفیسر اورنگ زیب عالمگیر اوران کی اہلیہ اپنی اپنی گاڑیاں لے کر ہمیں لینے بس اسٹینڈ آ چکے تھے۔ہم لوگ دل دل میں نادم ہو رہے تھے کہ اتنی صبح اور اتنے سینئر استاد نے زحمت کی مگر ان کی خاکساری اور مہمان نوازی نے ہمیں شکریہ کہنے کا بھی موقع نہیں دیا۔انھوں نے ہمارے لیے یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں تین کمرے بُک کرائے تھے۔ہم لوگ گیسٹ ہاؤس پہنچتے ہی سو گئے۔ابھی ہم گہری نیند میں ہی تھے کہ ناشتے کے لیے ہمیں جگا دیا گیا۔ابھی آنکھیں مل ہی رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی معلوم ہوا ہمارے ناراض دوست ڈاکٹر جمیل اصغر اور ڈاکٹر آصف اعوان جی سی یونیورسٹی، کچھ ہی دیر میں فیصل آباد سے لاہور پہنچنے والے ہیں۔ڈاکٹر جمیل کے بارے میں پروفیسر عبدالحق سابق صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی یہ کہتے ہیں کہ 'جمیل نصف پاکستان ہیں' اگر پاکستان گئے اوران سے ملاقات نہ ہوئی تو گویا آپ نے نصف پاکستان دیکھا۔ ان سے ہماری ملاقات اگست 2006 میں فیصل آباد یونیورسٹی کے انٹرنیشنل سیمینار میں ہوئی تھی۔جمیل اسم بامسمیٰ ہیں۔ جتنے وہ جمیل ہیں اتنا ہی ان کا اخلاق۔پہلی دفعہ ان سے لاہور ائیر پورٹ پر ملاقات ہوئی تھی۔وہ ہمیں فیصل آباد لے جانے کے لیے آئے تھے صرف چند جملوں کے تبادلے کے بعد ایسا لگا تھا جیسے ان سے برسوں کی آشنائی ہو اور اب تو ان کی دوستی بھائی چارگی میں داخل ہو چکی ہے۔

2007 میں وہ پہلی دفعہ ہماری دعوت پر دہلی آئے تھے تب انھیں اور قریب سے دیکھا۔خیر صاحب ناشتے سے ابھی فارغ بھی نہ ہوئے تھے کے ڈاکٹر موصوف اور ڈاکٹر اعوان تشریف لے آئے۔ان کی ناراضگی اس سبب سے تھی کہ انھوں نے ہمارے لیے اپنی یونیورسٹی میں ایک پروگرام

مرتب کر لیا تھا۔ یونیورسٹی کے دیگر اساتذہ بھی ہمارے منتظر تھے۔اس سے زیادہ جمیل کے والد صاحب ان کے گھر کے لوگ اور پیاری بیٹی سومیا اور علی بڑے خوش تھے کے انکل آنے والے ہیں۔ان کا اصرار تھا کہ ہم 24 تاریخ کا پوار دن ان کے ساتھ فیصل آباد میں گزاریں۔ ہم لوگوں نے ویزانہ ملنے کی مجبوری بھی بتائی مگر انھوں نے مقامی طور پر اس کی زبانی اجازت بھی لے لی تھی۔ مگر دستاویزی ثبوت نہ ہونے کے سبب ہم لوگوں نے فیصل آباد کا پروگرام اس لیے بھی ملتوی کر دیا ہے کہ باڑہ گلی سے پشاور تک ایجنسیوں نے جس طرح ہماری دیکھ بھال کہ ہم انھیں مزید زحمت نہیں دینا چاہتے تھے۔ ہماری اس مجبوری کے سبب دونوں دوستوں کو ڈیڑھ سو کیلو میٹر کا سفر طے کرنا پڑا۔ ابھی شکوے گلے ہی ہو رہے تھے کہ ڈاکٹر بزمی تشریف لے آئے۔اس کے بعد پاکستان کی اہم ادبی شخصیت پروفیسر تحسین فراقی صاحب تشریف لائے۔ سب ہم سے شاکی تھے اور ہم حکومت کے شاکی تھے۔ کیونکہ صرف دن بھر کے لیے ہم لوگوں نے فیصل آباد کا ویزا طلب کیا تھا مگر حکومت نے اس شہر کے دیدار اور دوستوں سے ملاقات کو پسند نہیں کیا۔ادھر احباب کی محبتوں کا یہ عالم کہ جب انھیں یہ اطلاع ملی کہ ہم فیصل آباد نہیں آرہے ہیں تو سب کے سب لاہور پہنچنے لگے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی پروفیسر چمن لال نے جنگ آزادی کے ہیرو بھگت سنگھ پر کئی کتابیں لکھی ہیں جو ہندی اور پنجابی میں چھپ چکی ہیں۔فیصل آباد سے قریب ہی بھگت سنگھ کا گاؤں موجود ہے اور ان کا وہ مکان بھی جس میں وہ رہتے تھے۔ جسے ہم لوگ بھی دیکھنا چاہ رہے تھے اور جن لوگوں نے چمن لال صاحب کی کتابیں پڑھ رکھی تھیں وہ چمن لال صاحب سے ملنا چاہتے تھے اور ان کے ساتھ بھگت سنگھ کے مکان کے پاس ہی ایک نشست کرنا چاہتے تھے۔اس لیے لوگ مایوس ہو کر لاہور ہی ملنے چلے آئے۔ جی سی یونیورسٹی کی استاد ڈاکٹر رابعہ سرفراز نے ہمارے پاکستان پہنچتے ہی فون کرنا شروع کر دیا تھا کہ آپ لوگوں کو فیصل آباد ضرور آنا ہے۔لیکن جب انھیں ہمارے نہ آنے کی اطلاع ملی تو وہ بھی اپنی دوست ناز فاطمہ جو نئی نسل کی بہترین شاعرہ ہیں، کے ساتھ ایک بجے کے قریب لاہور پہنچ گئیں۔ان سے ہمارا پہلے سے وعدہ تھا کہ ہم لنچ ساتھ کریں گے مگر ہمارے میز بانِ مہربان اورنگ زیب صاحب نے اپنے گھر پہ انتہائی اہتمام سے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ مستقل سفر کے سبب میری طبعیت کچھ ناساز تھی اس لیے میں دستر خوان پر بیٹھا رہا اور حسرت سے دوستوں

کی جانب دیکھتا رہا ہے جو دعوت شیراز کے مزے لے رہے تھے۔ وہاں سے رخصت ہو کر ساڑھے تین بجے میں رابعہ اور ناز سے ملاقات کے لیے پہنچا بلکہ یوں کہیں کہ ان کی دل آزاری کے لیے گیا۔ کیونکہ انھوں نے ہمارے انتظار میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ میں وہاں بھی ان کے ساتھ بیٹھا رہا اور اس احساس سے نادم ہوتا رہا کہ مہمان تو 'مردہ بدست زندہ' کے مصداق ہوتا ہے۔ میں چاہ کر بھی وقت پر نہیں پہنچ سکا اور انھیں انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔ میں نے ان کے ساتھ لنچ کا وعدہ تو کر لیا تھا مگر نہ تو وقت پر حاضر ہو سکا اور نہ ہی ان کا ساتھ دے سکا۔ لیکن ان کے خلوص کا شکر گزار ہوں کہ تین گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد بھی انھوں نے خنداں پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ اب مجھے نہیں معلوم انتظار کی صعوبتوں سے گزرنے کے بعد انھوں نے دل سے کیا کیا کہا ہوگا۔ خدا ان دوستوں کو آباد و شاد رکھے۔ ان سے ملنے کے بعد شاہی مسجد اور مزار اقبال کی زیارت کر رہے دوستوں کو ساتھ لے کر دیال سنگھ فاؤنڈیشن گیا جہاں پروفیسر چمن لال ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے انارکلی بازار کی سیر کی۔ اس طرح یہ پورا دن نکل گیا۔ دوسرے دن بھی ڈاکٹر جمیل ہمارے ساتھ تھے اس دن ہم نے لاہور شہر کی تاریخی عمارتوں کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ حیرت ہوئی کہ ان تاریخی یادگار کی رکھ رکھاؤ کی جانب حکومت کی کوئی توجہ نہیں۔ انارکلی کی قبر تو اس لیے صحیح سالم ہے کیونکہ وہ سیکریٹریٹ کے احاطے میں میوزیم کے ساتھ ہے مگر نور جہاں کا مقبرہ انتہائی مخدوش حالت میں ہے یہی حال جہانگیر کے مقبرے کا بھی ہے۔ شالیمار باغ کو بھی جس طرح صاف ستھرا رکھا جانا چاہیے تھا وہ نہیں ہے۔ ان عمارتوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ پاکستانی حکومت نے ابھی تک ان آثار قدیمہ کی اہمیت کو یا تو سمجھا نہیں یا ان کی سیاست میں یوں بھی اتنا کچھ کرنے کو ہے کہ اس جانب توجہ دینے کی مہلت ہی نہیں ملی۔

پاکستان میں یہ ہماری آخری شام تھی اس لیے ہم لوگوں نے بازار کا رخ کیا اور عزیزوں کے لیے کچھ تحائف بھی لیے۔ اس کے بعد الحمرا کیمپس گئے یہاں کا نظارہ بھی خوب تھا ایک طرف صوفیانہ قوالی کا پروگرام چل رہا تھا تو دوسری جانب موسیقی کا اور کئی الگ الگ آڈیٹوریم میں مختلف اسٹیج ڈرامے کا شو چل رہا تھا۔ اسی کیمپس میں ایک جگہ شہر کے ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی کہکشاں بھی جلوہ افروز تھی۔ دلی کے منڈی ہاؤس کی طرح یہ جگہ تہذیبی اور ثقافتی مرکز ہے۔ انتہائی

خوبصورت کیمپس میں ہم اور بھی وقت گزارنا چاہ رہے تھے کہ اورنگ زیب صاحب کا فون آنے لگا کہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ اس لیے ہم لوگ اس خیال سے بھی کہ گھر والوں کو ہمارے سبب دیر تک جاگنا نہ پڑے جلد ہی ان کے گھر پہنچ گئے۔ اس بار بھی پُر تکلف کھانے کا اہتمام دیکھ کر سوچنے لگا کہ ہم لوگ اتنا نہیں کر سکتے جتنا یہ پاکستانی احباب کرتے ہیں۔ یہ بات صرف میں نہیں کہہ رہا ہوں جن لوگوں کو بھی پاکستان جانے کو موقع ملا ہے وہ ان کی مہمان نوازی کے قائل ہو کر لوٹیں ہیں۔

26 جولائی کو علی الصباح ہم لوگ تیار ہو گئے پروفیسر اورنگ زیب عالمگیر اپنی تمام مصروفیات کے باوجود ہمیں رخصت کرنے بس اسٹینڈ تک آئے ڈاکٹر جمیل اصغر تو ہماری وجہ سے لاہور ہی رک گئے تھے وہ بھی ساتھ ساتھ تھے۔ انتہائی جذباتی انداز میں ہم سبھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پاکستان کی بے شمار محبت اور یادیں لے کر ہندستان کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ بس امرتسر تک کی تھی۔ امرتسر میں ہمارے پاس تین گھنٹے کا وقت تھا اس لیے پروفیسر چمن لال نے مجھے اور ڈاکٹر رمن کو جلیاں والا باغ اور گولڈن ٹیمپل کی سیر کرائی۔ ڈاکٹر اخلاق اور کنجو نے اسٹیشن پر ہی آرام کرنا مناسب سمجھا۔ شام کو پانچ بجے امرتسر دہلی شتابدی سے چل کر دہلی پہنچے۔ اب تک پاکستان کی یادیں ذہن میں تازہ ہیں خدا کرے ان نقوش کے مٹنے سے پہلے دوسرے نقش کی سبیل نکل آئے۔ اللہ نے یہ دعائیں قبول کیں اور اس کے بعد بھی کئی بار پاکستان جانے کا موقع ملا۔ بس اس بات کا اعتراف ضرور کرنا ہے کہ یہاں کے لوگ بہت محبتی ہیں۔ ہندستانیوں کو بہت پیار دیتے ہیں۔ بہت مہمان نواز ہیں۔ اللہ ان کو سلامت رکھے۔

○○○

قسطنطنیہ کی حسین وادیاں

تربتِ ایوب انصاری سے آتی ہے صدا

اے مسلماں! ملت اسلام کا دل ہے یہ شہر

قسطنطنیہ جسے استنبول کے نام سے جانا جاتا ہے۔ دنیا کے چند بڑے شہروں میں اس کا شمار ہے۔اسے مسجدوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ہر جگہ کچھ ہی فاصلے پر شاندار مسجدیں ہیں۔ مسجدوں کی اتنی تعداد کے بعد بھی کوئی مسجد نمازیوں سے خالی نہیں رہتی۔ان مساجد کا طرز تعمیر بھی بالکل مختلف ہے۔اس طرح کی مسجدیں ہم نے پہلی بار دیکھیں۔ان تمام مساجد کا آرکی ٹیکٹ ایک جیسا ہے۔ایک بڑا گنبد اور اس کے اردگرد متعدد چھوٹے گنبد۔ یہ عثمانی دور کے مشہور آرکی ٹیکٹ "سنان" کی ایجاد ہے۔اس طرز تعمیر کا مقصد یہ تھا کہ امام یا خطیب کی آواز گنبدوں سے ٹکراتی ہوئی دور تک چلی جائے۔ جب لاؤڈ اسپیکر ایجاد نہیں ہوا تھا۔اس وقت مسلمان انجینئروں نے اس انداز سے اس کی تعمیر کی تھی کہ دور کے سامعین تک امام کی آواز پہنچ جائے۔ یہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اس شہر کو پہاڑوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ شہر سات پہاڑوں کے حلقے میں واقع ہے۔ بحر اسود، بحیرۂ مرمرہ اور آبنائے باسفورس یہ تین سمندر اس شہر کے حسن میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ یہ دنیا کا واحد شہر ہے جس کا نصف حصہ یوروپ اور نصف ایشیا میں ہے۔ یہ شہر عظیم اسلامی تاریخ کا روشن باب بھی ہے۔اس شہر کو قدرت نے حسن کی دلفریبیاں عطا کی ہیں۔ ظاہری حسن کے علاوہ یہ روحانی فیوض و برکات سے بھی مالا مال ہے۔میزبانِ رسول ﷺ حضرت

ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار مبارک بھی اسی شہر میں ہے۔ حرمین شریفین کے بعد ترکی میں یہ مقام سب سے اہم اور متبرک سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور خاندان اہل بیت کے مقدس تبرکات کے علاوہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصائے مبارک، حضرت یوسف علیہ السلام کی پگڑی اور قرآن کریم کے کئی نادر نسخے یہاں موجود ہیں۔ دنیا میں سب سے بڑے گنبد کی مسجد بھی یہیں موجود ہے۔ ترکی کو یہ اعجاز بھی حاصل ہے کہ دنیا بھر میں تصوف اور صوفیانہ روایات کے حوالے سے سب سے زیادہ پڑھے اور سمجھے جانے والے مولانا روم کا مزار مبارک بھی اسی ملک میں ہے۔ اس شہر کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ

> ''قسطنطنیہ ۳۳۰ء سے ۳۹۵ء تک رومی سلطنت اور ۳۹۵ء سے ۱۴۵۳ء تک بازنطینی سلطنت کا دارالحکومت رہا اور ۱۴۵۳ء میں فتح قسطنطنیہ (قسطنطنیہ ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو سلطنت عثمانیہ کے ہاتھوں فتح ہوا۔ صدیوں تک مسلم حکمرانوں کی کوشش کے باوجود دنیا کے اس عظیم الشان شہر کی فتح عثمانی سلطان محمد ثانی کے حصے میں آئی جو فتح کے بعد سلطان محمد فاتح کہلائے۔) کے بعد سے ۱۹۲۳ء تک سلطنت عثمانیہ کا دارالخلافہ رہا۔ فتح قسطنطنیہ کے بعد سلطان محمد فاتح نے اس شہر کا نام اسلام بول رکھا (جس کا مطلب ہے اسلام کا بول بالا) جو کہ آہستہ آہستہ استنبول میں تبدیل ہو گیا۔ شہر یورپ اور ایشیا کے سنگم پر شاخ زریں اور بحیرۂ مرمرہ کے کنارے واقع ہے اور قرون وسطی میں یورپ کا سب سے بڑا اور امیر ترین شہر تھا۔ اس زمانے میں قسطنطنیہ کو شہروں کی ملکہ کہا جاتا تھا۔'' (بحوالہ اردو و یکی پیڈیا)

یہ شہر آج بھی ترقی یافتہ اور خوشحال ہے۔ 2010 کے لیے استنبول کو یوروپ کا مشترکہ تہذیبی دارالحکومت منتخب کیا گیا ہے۔ یہ واحد مسلم ملک ہے جو ناٹو کا رکن بھی ہے اور یوروپی یونین میں شامل ہونے کی دعویداری بھی رکھتا ہے۔ یہ ملک اس لیے بھی مثالی ہے کہ اپنے تمام انتشار پر قابو پا کر ترقی کی جانب تیزی سے گامزن ہے۔

ترکی کے انھیں مقامات کے مطالعے اور احباب سے ان کی تفصیلات سنتے سنتے دل میں یہ خواہش بسی ہوئی تھی کہ کاش اس ملکِ دلفریب اور شہرِ جانفزا کی زیارت نصیب ہو جائے۔ سو اللہ نے دل کی یہ مراد پوری کی۔ اللہ کا بے حد و حساب شکر کہ اسلامی تاریخ میں جس شہر کا ذکر بار بار سنا اور پڑھا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ ایک بین الاقوامی ورکشاپ میں شرکت کی دعوت پر دہلی سے ہم اور ڈاکٹر رضوان الرحمان 23 مئی 2010 صبح کی 4.45 کو دہلی سے بذریعہ ترکش ائیر لائن استنبول کے لیے روانہ ہوئے۔ دل میں حسرت تھی کی جلد از جلد حضرت ایوب انصاری کے شہر میں پہنچیں۔ لیکن سفر کی طوالت ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی عام طور پر جہاز پر بیٹھنے کے ساتھ یہ احساس ہوتا ہے کہ چند گھنٹوں میں ہی منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ مگر براہ راست پرواز سے بھی یہ سات گھنٹے کا سفر تھا۔ ڈاکٹر رضوان جانے سے پہلے بار بار ہمیں یاد دلاتے رہے کہ 22 کی رات ختم ہوتے ہی ایک بجے ہم لوگوں کو نکلنا ہے۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بارہ بجے رات کے بعد کہیں جانا ہو تو اگلی تاریخ ہی یاد رہتی ہے اور میرے ساتھ اکثر ایسا ہوا بھی ہے کہ ایک دن بعد یا ایک دن پہلے ہی اسٹیشن یا ایئرپورٹ پہنچ گیا ہوں۔ ڈاکٹر رضوان کی بار بار کی تاکید نے سنیچر کی رات کو سونے بھی نہیں دیا اور سو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ایک ڈیڑھ بجے گھر سے ائیرپورٹ کے لیے نکلنا تھا۔ کہیں نیند نہ آجائے، اور اس خیال سے بھی کہ جب تک گھر سے نکل نہیں جاتے ہیں گھر والے بھی سو نہیں سکیں گے۔ لہٰذا ہم ڈیڑھ بجے ہی ائیرپورٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔ ائیرپورٹ پر ہم جیسے ہی ترکش ائیرلائن کے کاؤنٹر پر پہنچے ڈاکٹر رضوان کے ایک ریسرچ اسکالر مل گئے جو یہاں ترجمے کے حوالے سے کام کرتے ہیں۔ انھوں نے تمام کاروائی بھی جلد مکمل کرادی اور ہمیں اپنے آفس میں چائے بھی پلائی۔ اب ہمارے پاس وقت بہت تھا۔ ہم لوگ امیگریشن کے بعد لانج میں چہل قدمی کر رہے تھے کہ وہاں جے این یو کے پروفیسر دیپک سے ملاقات ہوئی۔ کچھ دیر ان سے بات کر کے وقت نکل گیا۔ لیکن وہ ہم سے پہلے چین کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ بعد ازاں ہم نے کہیں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ ہم تھوڑی دیر ہی سکون سے بیٹھے تھے کہ ایک قافلے کا اسی جگہ ورود ہوا۔ پہلی نظر میں انھیں دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ایک خاندان کے تقریباً بیس پچیس احباب مقدس سفر پر جا رہے ہیں۔ زیارت حرمین شریفین کے لیے وہی جاتے

ہیں جن کی قسمت اوج پر ہوتی ہے۔ ہم نے بڑے احترام سے بیچ کی کرسی خالی کر کے کنارے جگہ لے لی تا کہ یہ سب لوگ ایک جگہ بیٹھ جائیں۔ مگر معذرت کے ساتھ یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ ان کے لوگوں کے بیٹھتے ہی ایک ایسا ماحول بنا جیسے یہ عمرہ کے لیے نہیں بلکہ گرمی کی چھٹی گزارنے کہیں جا رہے ہوں۔ نہ کسی کے لب پر دعا اور نہ کسی کے اندر سنجیدگی سب کے سب اپنے ساتھ لائے کھانے کے پیکٹ کھول کر کھانے پینے میں مشغول ہو گئے۔ یہ کوئی بُری بات نہیں تھی لیکن بری بات یہ تھی کہ جہاں کھایا ڈبہ وہیں پھینکا اور چائے، کولڈ ڈرنکس لے کر آ گئے۔ میں نے بار بار اس صفائی کرنے والے کی چہرے کی ناگواری کو دیکھا جو ان کے پھینکے ہوئے ڈبوں کو بڑی ناگواری سے اٹھا رہا تھا اور بیچ بیچ میں اس قافلے میں شامل نوجوانوں اور خواتین کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں یہ بتا رہی تھیں کہ محض دو تین میٹر کی دوری پر ڈسٹ بین موجود تھا مگر انھوں نے اتنی بھی زحمت نہیں کی۔ آس پاس کے لوگ بھی ان کی تیز تیز آواز میں گفتگو کرنے سے پریشان ہو کر کسی اور نشست پر جا بیٹھے۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایک مقدس سفر پر جانے والے اگر اس طرح کا سلوک اور رویہ رکھیں گے تو لوگ کیا سوچیں گے؟ مجھے ان کے رویے سے افسوس اور صدمہ پہنچا۔ ڈاکٹر رضوان بھی پہلو بدل رہے تھے۔ اتنے میں ترک ہوا یلاری کا اناؤنسمنٹ ہوا اور ہم جہاز پر سوار ہونے کے لیے گیٹ نمبر چار سے روانہ ہوئے۔ ٹھیک وقت پر روانگی ہوئی۔ جب بلندیوں پر پہنچ کر جہاز پرُسکون ہوا تو ترکی طرز کا ناشتہ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد غنودگی طاری ہوئی کچھ دیر کے لیے ہم سو گئے۔ لیکن جب گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا ابھی تو صرف دو گھنٹے ہی گزرے ہیں۔ ابھی ہمیں پانچ گھنٹے اور بھی انتظار کرنا ہے۔ جہاز جس سمت کو پرواز کر رہا تھا وہ ویسٹرلی ہواؤں کا رخ تھا اس لیے رفتار سست تھی۔ اسی لیے دہلی سے استنبول جانے میں ایک گھنٹہ زائد وقت لگتا ہے اس کے برعکس واپسی میں صرف چھ گھنٹے میں دہلی پہنچتے ہیں۔ ہماری گھڑی میں اس وقت تقریباً سات بج رہے تھے۔ ہم جیسے جیسے آگے کی طرف بڑھ رہے تھے ویسے ویسے صبح ہو رہی تھی۔ ہر جگہ ایک ہی جیسا وقت معلوم ہو رہا تھا۔ آسمان اس قدر صاف تھا اور دھوپ اتنی تیز تھی کہ باہر نظر نہیں ٹھہر رہی تھی۔ جہاز کے عملے نے کھڑکی کے شٹر بند کرا دئے تھے تا کہ جو سونا چاہیں انھیں تیز روشنی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن ہم لوگوں کو چونکہ ٹوسیٹر پہ جگہ ملی تھی اس لیے تھوڑا شٹر کھول کر دیکھنے کی کوشش مگر

تیز دھوپ کے سبب باہر دیکھنا محال تھا لہٰذا کچھ دیر بند کمرے کی طرح ائیر کرافٹ میں آنکھیں بند کیے دعائیں پڑھتے رہے۔ ہمارے ایک دوست جن کا نام نہیں لکھ سکتا کیونکہ وہ مشہور شخصیت کے مالک ہیں اور ساری دنیا میں لوگ انھیں جانتے ہیں بالخصوص ہندستان اور پاکستان میں بڑی تعداد ہے جو ان کی صلاحیتوں کا احترام کرتے ہیں۔ کئی دفعہ ان کے ساتھ ہوائی سفر کا اتفاق ہوا ہے۔ زمین پر جس بہادری سے رہتے ہیں اسی بہادری اور بے باکی سے ان کا قلم بھی چلتا ہے مگر ہوائی جہاز پر اُن کا ہواس گُم رہتا ہے۔ انھوں نے ایک دفعہ مجھ سے کہا کہ انسان ہوائی جہاز پر ہی موت سے زیادہ قریب رہتا ہے۔ ان کی بات یاد کر کے ہم بھی استغفار اور دعائیں پڑھتے رہے۔ ہم نے جب اپنی گھڑی کی جانب دیکھا تو 11 بج رہے تھے۔ ائیر کرافٹ میں سونے والے مسافروں کی بڑی تعداد ایک نیند پوری کر کے اٹھ چکی تھی۔ ائیر ہوسٹس مشروبات و دیگر اشیا کے ساتھ ضیافت میں مشغول تھیں۔ تب ہم نے کھڑکی کے شٹر کھول دیئے جب باہر کی جانب دیکھا تو صاف وشفاف فضا تھی اس لیے باہر کے مناظر بالکل صاف دیکھائی دے رہے تھے۔ خوبصورت پہاڑوں کے اوپر سے ہم گزر رہے تھے کہیں ہرے بھرے پہاڑ تو کہیں مٹیالے رنگ کے نشیب وفراز کے درمیان چھوٹے چھوٹے شہر نظر آرہے تھے۔ کہیں پہاڑوں پر برف کی سفید چادر بچھی تھی انھیں مناظر کے درمیان ایک وسیع وعریض نیلے رنگ کا جھیل نظر آیا جو پہاڑوں کے درمیان ایک حسین نظارہ پیش کر رہا تھا۔ ہم نے ایک فلائٹ اسسٹنٹ جو اتفاق سے ہمارے سامنے سے گزر رہے تھے، پوچھا یہ کونسی جھیل ہے۔ انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا لیکن جب ہمارا اشتیاق دیکھا اور یہ جملہ سنا کہ آپ روز اسی کے اوپر سے گزرتے ہیں اور آپ کو معلوم نہیں؟ تو انھوں نے بتایا کہ یہ بن جھیل ہے اور ہم ترکی کے حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔ ہر طرف جھیل اور پہاڑ چادر کی طرح بچھے ہوئے تھے۔ چائے کی چسکیوں کا ہم مزہ ہی لے رہے تھے کہ ترکی میں دور دور پھیلے شہر نظر آنے لگے۔ کچھ ہی دیر میں پائلٹ نے اعلان کیا کہ ہم اتاترک ائیر پورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں۔ تمام مسافر اپنی اپنی سیٹ بیلٹ باندھ چکے تھے۔ اب ہمارا جہاز سمندر کے اوپر تھا اور آہستہ آہستہ نیچے کی طرف آرہا تھا۔ ایسا لگا کہ اسی سمندر پر لینڈ کر جائے گا۔ یہ بحیرۂ مرمرہ تھا، بالکل اسی کے کنارے اتاترک ائیر پورٹ واقع ہے۔ الحمد للہ ہم بخیر وخوبی پہنچ گئے۔ ائیر پورٹ پر داخل ہوتے ہی ہم نے امیگریشن

فارم کی تلاش کی لیکن معلوم ہوا یہاں ایسی کوئی فارملٹی کی ضرورت نہیں۔ ایک لائن سے کئی کاؤنٹر بنے ہوئے تھے ہم بھی ایک کاؤنٹر پر کھڑے ہو گئے۔ سوچا یہاں بھی کافی وقت لگے گا کیونکہ کچھ ہی دنوں قبل جدہ ائیر پورٹ کا تلخ تجربہ تھا جہاں تقریباً دو گھنٹے باہر نکلنے میں لگے تھے۔ مگر یہاں تو کاؤنٹر پر پاسپورٹ دیا الیکٹرونک مشین میں اسے سوئپ کیا اور مسکراتے ہوئے ہمیں خوش آمدید کہہ کر باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ہماری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ آج کل سیکورٹی کے نام پر مسافروں کے ساتھ کیا کیا نا زیبا حرکتیں نہیں ہوتیں۔ اس معاملے میں سنا ہے امریکہ نمبر ون ہے اس کے بعد شاید جدہ ائیر پورٹ ہی ہو۔ پہلے فارم بھریں، پھر لائن میں کھڑے شاہی انداز سے ان کے کام کرنے کے انداز کو دیکھتے رہیں، ان کی بے مروتی اور حقارت آمیز رویے کو برداشت کریں۔ ایسا کہ جیسے ساری دنیا میں وہی اشرف المخلوقات ہیں اور باقی لوگ ان کے خادم یا اس سے بھی بدتر ہیں۔ خیر یہاں کا رویہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ انتہائی خوبصورت ائیر پورٹ سلیقہ منداور سلجھے ہوئے لوگ۔ کچھ ہی دیر میں ہماری نظر رحمت پر پڑی جو تختی پر ہمارا نام لیے ہمارے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی انھوں نے بتایا کہ وہ فاتح یونیورسٹی سے بی۔ اے کر رہے۔ انھوں نے ہمیں زمین دوز میٹرو کی جانب چلنے کو کہا۔ ائیر پورٹ کے اندر اندر ہی ہم میٹرو میں سوار ہوئے کچھ دیر بعد یہ میٹرو سرنگ سے باہر نکل کر شہر میں دوڑ رہی تھی۔ بہت صاف ستھری اور خالی جگہیں دیکھ کر ہم جلدی سے بیٹھ گئے، کیونکہ ہمیں دہلی میٹرو کی بھیڑ بھاڑ کا اندازہ تھا۔ رحمت ہماری تیزی کو بھانپ گئے کیونکہ وہ بنگلہ دیش کے رہنے والے تھے اور ممبئی دہلی سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے کہا یہاں اتنی بھیڑ نہیں ملے گی اس لیے کہیں بھی اطمینان سے بیٹھ جائیں۔ کچھ دیر بعد ہم ایک اسٹیشن پر اترے اور وہیں سے ٹرام لی۔ یہ ٹرام بھی بہت خوبصورت اور صاف ستھری تھی۔ چار پانچ اسٹیشن کے بعد فندیق زادہ پر اترے۔ اسٹیشن کے سامنے ہی کایا ہوٹل تھا جہاں ہمیں قیام کرنا تھا۔ کشادہ سڑک درمیان میں ٹرام کی مخصوص جگہ اور دونوں جانب چوڑی سڑکیں لیکن فوٹ اور برتج بھی بنا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ یہی ہوٹل ہے جہاں قیام کرنا ہے اور فوٹ اور برتج پر چڑھنے لگے۔ میں نے کہا اس کی کیا ضروت ہے سڑک کراس کر لیتے ہیں۔ لیکن ہمیں بتایا گیا کہ اگر پولیس نے دیکھ لیا تو جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ فندیق زادہ ترکی کے یوروپی حصے میں

واقع تھا۔ پہلی نظر میں جو ہم نے سڑکوں کی صفائی اور آمد و رفت کے انتظام دیکھے وہ ہر لحاظ سے قابل تعریف اور ہمارے لیے حیرت کا سبب تھا۔ سڑکیں ایسی کہ سڑک پر بیٹھ جائیں بالکل گھر جیسی صفائی۔ خیر ہم ہوٹل میں داخل ہوئے ہمارے لیے کمرے پہلے ہی سے بُک تھے۔ کمرے پہ پہنچ کر ہی ہمیں بھوک کا احساس ہونے لگا تھا کیونکہ رات بھر کا سفر اور اس وقت ہماری گھڑی میں دن کے دو بج رہے تھے۔ جبکہ ترکی کی گھڑی کے مطابق ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ جب میں نے رحمت سے دوپہر کے کھانے کی بات کی تو تعجب کے ساتھ انھوں نے ہماری جانب دیکھا۔ لیکن جب ہم نے ہندستانی ٹائم بتایا تو انھوں نے ہمارے میزبان عثمان اولانا سے بات کی انھوں نے اسکندریہ ریسٹورینٹ لے جانے کو کہا اور یہ بھی بتا دیا کہ ہمیں ترکی کی مشہور غذا 'دونیر' کھلانا ہے۔ نزدیک ہی وہ ریسٹورینٹ تھا۔ ریسٹورینٹ پہنچ کر اندازہ ہوا کہ واقعی ہم پہلے بھوکے شخص اس ہوٹل میں داخل ہوئے ہیں۔ دونیر بنانے میں وقت لگ رہا تھا جب تک ریسٹورینٹ کے دستور کے مطابق تین طرح کا نان ایک بڑا، دوسرا اس سے چھوٹا اور مزے میں الگ، تیسرا بالکل چھوٹا جس کے اوپر قیمہ رکھ کر بیک کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ سلاد وغیرہ ٹیبل پر رکھ دیا گیا اور ہم گرم گرم نان دیکھ کر ٹوٹ پڑے اور تیزی سے کھانے لگے۔ شاید ریسٹورینٹ مالک کو اندازہ ہو گیا کہ یہ نئے مسافر ہیں اور انھیں معلوم نہیں ہے۔ اس لیے وہ ہماری ٹیبل کے پاس آکر ترکی میں ہمارے میزبان سے مسکراتے ہوئے کچھ کہا اور چلے گئے۔ تب رحمت نے بتایا کہ جب تک دونیر تیار ہو رہا ہے اس وقت تک کے لیے یہ اسٹارٹر ہے لہٰذا آہستہ آہستہ کھائیں ایسا نہ ہو کہ دونیر کے آتے آتے آپ کا پیٹ ہی بھر جائے۔ چونکہ ریسٹراں میں ہم پہلے شخص تھے اس لیے انھیں تیاری میں کچھ زیادہ ہی وقت لگ گیا اور جب تک دونیر آتا ہم تقریباً شکم سیر ہو چکے تھے۔ خیر دونیر بھی کھایا اور مزے لے کر کھایا۔ یہ شاورما کی طرح ہی ہلکی آنچ پر گوشت کے بھونے ہوئے تراشے تھے اور ساتھ میں ساس اور سلاد۔ کھانے کے بعد ہم پر غنودگی طاری ہوئی اور ہم سو گئے رحمت کچھ دیر کے لیے کسی کام سے باہر گئے تھے۔ ترکی میں یہ ہمارے لیے بہت لمبا دن تھا کیونکہ جب ہم ساڑھے بارہ بجے پہنچے تو یہاں نو بج رہا تھا اور شام ساڑھے آٹھ بجے ہوئی۔ رحمت کے آتے ہی ہم نے خواہش ظاہر کی کہ آج ہم فری بھی ہیں اور وقت بھی تو کہیں گھوم کر آجائیں۔ وہ ہمیں ترکی کی مشہور نیلی گنبد کی مسجد

لے گئے۔ یہ سلطان احمد مسجد نیلی مسجد کے نام سے معروف ہے۔ترکی زبان:Sultanahmet Camii کہتے ہیں:

''اسے بیرونی دیواروں کے نیلے رنگ کے باعث نیلی مسجد کے طور پر جانا جاتا ہے۔ یہ ترکی کی واحد مسجد ہے جس کے چھ مینار ہیں۔1616ء میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔اس مسجد میں دس ہزار لوگوں کی گنجائش ہے۔ لمبائی 72 میٹر، چوڑائی 64 میٹر۔گنبد کی اونچائی 43 میٹراور قطر 33 میٹر ہے۔وکی پیڈیا کے مطابق جب تعمیر مکمل ہونے پر سلطان کو اس کا علم ہوا تو اس نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا کیونکہ اُس وقت صرف مسجد حرام کے میناروں کی تعداد چھ تھی لیکن چونکہ مسجد کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی اس لیے مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ مسجد حرام میں ایک مینار کا اضافہ کر کے اس کے میناروں کی تعداد سات کر دی گئی۔مسجد کے مرکزی کمرے پر کئی گنبد ہیں جن کے درمیان میں مرکزی گنبد واقع ہے۔مسجد کے اندرونی حصے میں زیریں دیواروں کو ہاتھوں سے تیار کردہ 20 ہزار ٹائلوں سے مزین کیا گیا ہے جو ازنک (قدیم نیسیا) میں تیار کی گئیں۔دیوار کے بالائی حصوں پر رنگ کیا گیا ہے۔مسجد میں رنگین اور منقش شیشے کی 200 سے زائد کھڑکیاں موجود ہیں تا کہ قدرتی روشنی اور ہوا کا گذر رہے۔مسجد کے اندر اپنے وقت کے عظیم ترین خطاط سید قاسم غباری نے قرآن مجید کی آیات کی خطاطی کی۔مسجد کے طرز تعمیر کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ نماز جمعہ کے موقع پر جب امام خطبہ دینے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو مسجد کے ہر کونے اور ہر جگہ سے امام کو با آسانی دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔مسجد کے ہر مینار پر تین چھجے ہیں اور کچھ عرصہ قبل تک مؤذن اس مینار پر چڑھ کر پانچوں وقت اذان دیتے تھے۔آج کل اس کی جگہ برقی صوتی نظام استعمال کیا جاتا ہے جس کی آوازیں قدیم شہر کے ہر گلی کوچے میں سنی جاتی ہے۔نماز کے وقت یہاں مقامی باشندوں اور سیاحوں کی بڑی تعداد بارگاہ الٰہی میں سر بسجود ہوتی ہے۔رات کے وقت رنگین برقی قمقمے اس

عظیم مسجد کے جاہ و جلال میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔"(بحوالہ اردو ویکی پیڈیا)۔

مسجد کے احاطے خوبصورت پھولوں اور درختوں کے قطار سے سجے تھے۔صفائی ایسی کہ نا قابل بیان۔جگہ جگہ فوارے لگے ہوئے تھے۔یہاں ہم نے خوش رنگ گلاب کو دیکھا جو پودے کے بجائے چھوٹے پیڑ سے لگے ہوئے تھے۔آج تک ہم نے گلاب کا ایسا بونسائی نما درخت نہیں دیکھا تھا۔طرح طرح کے پھول ہمیں اپنی جانب دعوت نظارہ دے رہے تھے۔ہر طرف سیاحوں کی بھیڑ بھاڑ تھی لیکن نماز کا وقت ہوتے ہی مسجد نمازیوں سے بھر جاتی ہے۔نماز کے وقت سیاحوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔مسجد کی دوسری جانب آیا صوفیہ ہے لیکن ہم اس شام آیا صوفیہ نہیں جا سکے۔دوسرے دن سیمنار کی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد اپنے میزبان عثمان اولانا کے ساتھ آیا صوفیہ گئے۔

"آیا صوفیا کی عظیم عمارت عیسائیوں نے چرچ کے طور پر بنائی تھی۔(یہ ایک سابق مشرقی آرتھوڈوکس گرجا ہے)۔لوگ اسے چوتھی صدی عیسوی کی تعمیر بتاتے ہیں لیکن کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس وقت کی کوئی تعمیر صحیح سالم نہیں بلکہ اس کی تعمیر نو یا مرمت کی جاتی رہی ہے۔کہا جاتا ہے کہ حوادث کے نذر ہو جانے کے بعد قسطنطین اول کے بیٹے قسطنطیس ثانی نے اسے تعمیر کیا تاہم 532ء میں یہ گرجا گھر بھی فسادات و ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔اسے جسٹینین اول نے دوبارہ تعمیر کرایا اور 27 دسمبر 537ء کو یہ مکمل ہوا۔یہ گرجا اشبیلیہ کے گرجے کی تعمیر تک ایک ہزار سے زیادہ سال تک دنیا کا سب سے بڑا گرجا گھر رہا۔آیا صوفیہ متعدد بار زلزلوں کا شکار رہا جس میں 558ء میں اس کا گنبد گر گیا اور 563ء میں اس کی جگہ دوبارہ لگایا جانے والا گنبد بھی تباہ ہو گیا۔989ء کے زلزلے میں بھی اسے نقصان پہنچا۔1453ء میں قسطنطنیہ کی عثمانی سلطنت میں شمولیت کے بعد آیا صوفیہ کو ایک مسجد بنا دیا گیا اور اس کی یہ حیثیت 1935ء تک برقرار رہی۔سلطان محمد فاتح نے 1453ء میں استنبول کو فتح کیا

تو سلطان نے اس کے اندر جمعہ کی نماز پڑھی اور حکم دیا کہ اسے بدل کر مسجد کی صورت دے دی جائے۔اس وقت سے یہ عمارت مسجد کے طور پر استعمال ہونے لگی۔ اس کے بعد مصطفیٰ کمال اتاترک کی حکومت آئی۔ انہوں نے 1934 میں ایک نیا حکم نافذ کیا۔اس کے تحت آیا صوفیہ کو میوزیم (عجائب گھر) قرار دے دیا گیا۔فروری 1935 میں میوزیم کے طور پر اس کے دروازے کھولے گئے ۔آیا صوفیہ کو بلا شک وشبہ دنیا کی تاریخ کی عظیم ترین عمارتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔لاطینی زبان میں اسے Sophia Sancta اور ترک زبان میں Ayasofya کہا جاتا ہے۔اس کے خوبصورت گنبد کا قطر 31 میٹر (102 فٹ) ہے اور یہ 56 میٹر بلند ہے۔'' (بحوالہ اردو وکی پیڈیا)

اس کے بعد ہم توپ کاپی میوزیم گئے جہاں قدیم ترک حکومتوں کے آثار ہیں۔لیکن اس کی سب بڑی اہمیت مقدس تبرکات کے سبب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات موجود ہیں، لیکن سب سے زیادہ اس میوزیم میں ہیں اور مستند ہیں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس مطہر، دندان مبارک، تلوار اور نعلین مبارک موجود ہیں۔حضرت فاطمہ کو جہیز میں ملا قرآن پاک کا جزدان، ردائے مبارک، حضرت امام حسن اور امام حسین، حضرت علی اور خلفائے راشدین کی تلواریں اور دیگر تبرکات کے علاوہ عصائے موسیٰ، حضرت یوسف علیہ السلام کی پگڑی اور بھی بہت سے تبرکات ہیں۔اللہ کا شکر ہے کہ ان تبرکات کی زیارت نصیب ہوئی۔

توپ کاپی سے نکلتے ہی نماز ظہر کا وقت ہو گیا تھا۔ہم پاس کی ایک قدیم مسجد میں نماز ادا کرنے گئے۔ یہ بہت پرانی مسجد تھی کئی صدی پہلے کی مسجد تھی لیکن اندر اور باہر سے ہر طرح جدید اس لیے تھی کیونکہ جدید سہولیات موجود تھیں۔کسی مسجد میں یہ میرا پہلا احساس تھا کہ کچھ اور دیر تک مسجد میں ٹھہر جائیں اور مستقل نفل ادا کرتے رہیں۔مسجد کے صدر دروازے پر دبیز چمڑے کا پردہ تھا تا کہ اے سی کی ہوا باہر نہ جا سکے۔اسی سے متصل وضو خانہ تھا۔وضو خانہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ انتہائی صاف ستھرا اور بیٹھنے کے لیے اونچی اونچی سنگ مرمر سے بنی کرسیاں، سامنے آویزاں شیشے اور ٹیشو پیپر رکھے ہوئے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ عام طور پر گھروں کے ٹوائلیٹس میں اتنی صفائی

نہیں ہوتی۔ مسجد میں داخل ہوئے تو دل خوش ہوا۔ دبیز سبز رنگ اور سرخ رنگ کی قالین بچھی ہوئی تھی۔ اتنی دیدہ زیب آرائش تھی کہ ہر طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ نماز سے فارغ ہو کر مسجد کا معائنہ کر رہا تھا تو دیکھا اوپر سے کچھ خواتین باہر نکل رہی ہیں۔ میں نے اپنے میزبان سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یہاں ہر مسجد میں عورتوں کے نماز پڑھنے کے لیے خصوصی انتظام ہوتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ جدید طرز کا لباس پہنی ہوئی، سر پر حجاب لگائی ہوئی خواتین نماز ادا کر کے باہر نکل رہی ہیں۔ میری حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ میری حیرت میں اس وقت اور بھی اضافہ ہوا جب امام صاحب کو دیکھا کہ وہ بھی جینس پینٹ اور شرٹ پہنے ہوئے ہیں۔ نماز کے وقت اوپر سے عبا پہن لیا اور گول ترکی ٹوپی لگا لی۔ مسجد سے باہر نکل کر سامنے ہی ٹرام کا اسٹیشن تھا۔ ہم ٹرام کے ذریعے ایوب سلطان پہنچے۔ وہاں ایک ریسٹورینٹ میں کھانے کے لیے بیٹھے۔ سامنے ہی سلطان ایوب مسجد تھی۔ کھانے کی ٹیبل پر میرے میزبان نے ایک بینر کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا آپ جانتے ہیں یہ کیا ہے؟ ظاہر ہے ہم دونوں نے جواب نفی میں دیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ غازہ میں مجبور اور مظلوم مسلمانوں کی امداد کے لیے بینر لگا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو انھوں نے بتایا وہ زیادہ حیرت انگیز تھا۔ انھوں نے کہا کہ ترکی کے لوگ غازہ کے مسلمانوں کی بڑی مدد کرتے ہیں۔ اس بینر کے لگتے ہی چند ہی دنوں میں اتنے پیسے اور سامان آ گئے کہ ایک جہاز میں نہیں بھیجا جا سکا۔ آپ جانتے ہیں یہ وہی فریڈم فلوٹیلا جہاز تھا جس پر اسرائیل نے وحشیانہ حملہ کیا تھا۔ جس کی ساری دنیا میں مذمت کی گئی ہے۔ خیر پر لطف ترکی کھانے کا مزہ لینے کے بعد ہم ایوب سلطان مسجد کے لیے روانہ ہوئے۔

یہ وہی مسجد ہے جہاں میزبان رسول ﷺ حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار مبارک ہے۔ ایوب سلطان مسجد شاخ زریں کے قریب قدیم شہر قسطنطنیہ کی فصیلوں کے باہر واقع ہے۔ یہ جگہ استنبول شہر کے یورپی حصے کے موجودہ ضلع ایوب میں ہے۔ یہ مسجد 1453ء میں عثمانیوں کے ہاتھوں قسطنطنیہ کی فتح کے بعد 1458ء میں تعمیر کی گئی۔ یہ مسجد عین اس جگہ تعمیر کی گئی جہاں صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ 60ء میں محاصرہ قسطنطنیہ کے دوران شہید ہو گئے تھے۔ ان کا مزار ترکوں کے لیے انتہائی مقدس و پُر عقیدت مقام ہے۔ اس کے اندر داخل ہونے کے لیے الگ دروازہ ہے اور نکلنے کے لیے الگ دروازہ۔ مرد اور خواتین ایک ہی

دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو دیکھا بڑی تعداد میں ایک طرف ٹوپیاں رکھی ہوئی ہیں اور دوسری جانب ڈھیر سارے دوپٹے لٹکے ہوئے ہیں۔ جو خواتین بغیر دوپٹہ کے جاتی ہیں انھیں دوپٹہ اوڑھنے کو دیا جاتا۔ ہم بھی سلام کے لیے حاضر ہوئے۔ اطمینان سے فاتحہ پڑھا۔ اطمینان اس لیے کہ ہندستان کی طرح وہاں مزاروں پہ ہنگامہ برپا نہیں رہتا۔

اتنی جگہوں کی زیارت کے بعد ہم تھک چکے تھے اور اپنے میزبان کا بھی خیال رکھنا تھا اس لیے ہم ایوب سلطان سے سیدھے ہوٹل آئے۔ تھوڑی دیر آرام کیا۔ سوچا اب شام ہوگئی ہوگی۔ لیکن وہاں تو دن اتنا لمبا ہوتا ہے کہ ہم دن سے تھک گئے۔ ہوٹل سے باہر آئے اور تھوڑی دیر ہم اور ڈاکٹر رضوان یوں ہی بلا وجہ گھومتے رہے۔ ہم بہت دیر تک فوٹ اور برتج پر کھڑے رہے۔ ٹرام، بس اور گاڑیوں سے آنے جانے والے لوگوں کو دیکھتے رہے۔ بہت غور کرنے کے بعد بھی ہم یہ پتا لگانے میں ناکام رہے کہ یہاں کون غریب ہے اور کون امیر۔ ہر شخص خوش لباس اور شاداں و فرحاں نظر آیا۔ عام طور پر ہمارے یہاں لوگوں کو دیکھ کر ان کی حالت زار کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہندستان میں عام شاہراہوں پر یا ریلوے اسٹیشن پر کھڑے ہو جائیں تو امیر و غریب کا فرق معلوم ہو جائے گا۔ مگر اللہ کا شکر ہے اس ملک میں کم از کم ایسی بات نہیں ہے۔ ہم نے بعد میں وہاں کے لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہاں کے لوگ معاشی اعتبار سے خوشحال ہیں۔ ایک دن ہم اور ڈاکٹر رضوان خوش گپی کرتے ہوئے ترکی کے حالات پر تبصرہ کر رہے تھے کہ ڈاکٹر رضوان نے ہم سے کہا مجھے ترکی میں ایک شخص پر بڑا رحم آتا ہے۔ میں نے پوچھا کون؟ انھوں نے کہا کہ صرف ایک شخص ایسا ہے جو سڑکوں پہ کچھ ڈھونڈتا رہتا ہے اور اسے کچھ نہیں ملتا۔ میری حیرت بڑھی تو انھوں نے بتایا کہ صفائی کرنے والے پہ! مجھے اس بات پر بے ساختہ ہنسی آئی اور واقعی غور کیا تو ایسا ہی لگا کہ صفائی کرنے والے مستقل کوڑے ڈھونڈتے رہتے ہیں اسی لیے سڑکوں پہ کوئی گندگی نظر نہیں آتی۔ مغرب بعد ہمیں ہوٹل کے لابی میں آنے کو کہا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ حیدرآباد سے انڈیا لاگ فاؤنڈیشن کی دعوت پر ایک گروپ آرہا ہے۔ ان کے ساتھ ہمیں رات کے کھانے کے لیے کہیں جانا تھا۔ شام کو جب لابی میں آئے تو حیدرآباد کے مہمانوں سے ملاقات ہوئی۔ اس گروپ میں اردو کے سینئر پروفیسر خالد سعید اور مولانا آزاد یونیورسٹی کے پبلک ریلیشن آفیسر جناب عابد

عبدالواسع بھی تھے۔ پروفیسر خالد سعید صاحب کو میں پہلے سے جانتا تھا مگر عابد عبدالواسع سے پہلی ملاقات تھی۔ ان سے مل کر ایسا لگا جیسے برسوں سے شناسائی ہے۔ خیر ہم سب جناب عیسیٰ اور نورالدین صاحب کے ساتھ آبنائے باسفورس کے کنارے ایک شاندار ہوٹل میں پرتکلف عشائیہ میں شریک ہوئے۔ سمندر کے کنارے، خوبصورت ہوٹل اور ترکی کی خوشگوار فضا میں یہ عشائیہ ایک یادگار بن گیا۔ رات ہوٹل میں سکون سے گزارا۔ دسرے دن بھی وقت نکال کر ہم جناب عثمان اولانا کے ساتھ استنبول یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پہنچے۔ وہاں اردو کے اساتذہ سے ملاقات ہوئی۔ یونیورسٹی ہمارے ہوٹل سے نزدیک ہی تھی۔ لیکن شاید ہم تنہا یونیورسٹی نہیں جا سکتے تھے۔ کیونکہ وہاں کا جو نظام دیکھا طبعیت خوش ہوئی۔ کوئی بیرونی شخص اندر داخل ہی نہیں ہوسکتا۔ اور نہ کمپاؤنڈ میں کوئی کچھ شرارت کرسکتا ہے۔ ہمیں ڈیپارٹمنٹ سے فون آنے کے بعد باضابطہ شناخت کے ساتھ اندر جانے دیا گیا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ یہاں شعبۂ ارود میں تقریباً اسی (۸۰) طالب علم ہیں تو خوشی ہوئی کہ اس شہر میں بھی اردو کی تعلیم ہوتی ہے۔ پہلی بار پروفیسر خلیل طوق آر سے یہیں ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد ہم فاتح یونیورسٹی گئے جو ایک پرائیوٹ یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی کے قیام کو ایک دہائی سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا ہے لیکن جس انداز کی عمارت تھی اور جس طرح تعلیم دی جاتی ہے یہ جان کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ یہاں تعلیم کا معیار بہتر ہے۔ یہاں کئی پروفیسرز سے ملاقات رہی۔ ترکی میں تقریباً سبھی لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ کیونکہ ہائی اسکول تک تعلیم حکومت کی جانب سے لازمی ہے اگر کوئی والدین اپنے بچوں کو اسکول نہیں بھیجتے تو انھیں جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح وہاں تمام شہریوں کے لیے لازم ہے کہ ایک خاص مدت شاید تین مہینے یا چھ مہینے کی آرمی ٹریننگ لینی ہوتی ہے۔ جب ہم انقرہ جا رہے تھے تو دیکھا کہ ایک شخص کے ساتھ کئی لوگ ڈنکا بجاتے اور خوشی مناتے کسی کو چھوڑنے آئے تھے۔ اس وقت ہمیں اس خوشی کا سبب معلوم نہیں ہوسکا۔ ہم نے سوچا شاید کوئی فٹ بال کھلاڑی ہے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ٹریننگ کے لیے جا رہا تھا۔

استنبول میں اب تک کے قیام سے اندازہ ہو گیا تھا کہ ترکی کی شبیہ بدل رہی ہے۔ ترکی کو عام طور پر لوگ یوروپی طرز کے لیے زیادہ جانے جاتے ہیں۔ لیکن اب وہاں کے لوگ اسلام کی طرف راغب ہورہے ہیں۔ ہم نے وہاں دونوں طرح کے لوگ دیکھے۔ ایک وہ جو مذہب کی

جانب جھکاؤ رکھتے ہیں اور دوسرے جو مذہبی تو نہیں لیکن مذہب بیزار نہیں ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہندستان میں لباس اور داڑھی ٹوپی سے مذہبی شخص کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ لیکن ترکی میں ایسے تہجد گزاروں کو بھی دیکھا جن کے لباس اور حلیے سے ان کے مذہبی ہونے نہ ہونے کا تعین نہیں کر سکتے۔ تقریباً لوگ داڑھی مونچھ نہیں رکھتے۔ لڑکیاں زیادہ تر جینس پینٹ اور ٹی شرٹ پہنتی ہیں۔ جن کا جھکاؤ مذہب کی جانب ہے وہ سر پر حجاب باندھتی ہیں۔ نئی نسل جو مذہب کی طرف کم لگاؤ رکھتے ہیں وہ بڑے آزاد خیال ہیں، لڑکے لڑکیوں میں اختلاط عام ہے۔ بڑے بے تکلف ہو کر آپس میں ملتے ہیں۔ ہر شاپنگ مال اور دوکان میں لڑکیوں کو کام کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے معاشرے پر یوروپی طرز حاوی ہے۔ ہمارے ترکی دوست نے بتایا کہ کچھ برسوں کی ہی بات ہے کہ یونیورسٹی اور کالج میں لڑکیاں سر پر حجاب باندھ کر نہیں جا سکتی تھیں۔ لیکن اب جو باندھنا چاہتی ہیں ان پر کسی طرح کا دباؤ نہیں ہے۔ ان تمام بے تکلفی اور آزاد خیالی کے بعد ہم نے ترکی میں جو چیز دیکھی وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔ طرح طرح کے لباس میں لڑکیاں ہر جگہ نظر آ جاتی تھیں مگر کہیں کسی کو سیٹی بجاتے یا کسی کو جملہ کستے نہیں سنا۔ کئی دنوں تک تو ہم نے کسی پولیس والے کو کسی سڑک پر نہیں دیکھا، یہاں تک کہ تاریخی عمارتوں کے آس پاس بھی پولیس کم ہی نظر نہیں آئی۔ ہمارے یہاں پولیس کی جو وحشت اور دہشت ہے وہ یہاں نظر نہیں آیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہاں عام طور پر لوگ امن پسند ہیں اسی لیے ہمارے شہروں کی طرح ہر جگہ پولیس کی گاڑیاں دوڑتی ہوئی نظر نہیں آئیں۔

استنبول میں قیام کے تیسرے روز ہم ویو پوائنٹ دیکھنے گئے۔ یہ ایشیائی حصے میں ہے۔ یہ انھیں سات پہاڑوں میں سے ایک ہے، جس کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے۔ یہ حصہ اب سیاحوں کی کشش کا مرکز بن چکا ہے۔ یہاں سے استنبول کے یوروپی حصے کا حسین منظر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں سے نیلی گنبد مسجد، آیا صوفیہ اور ساحل سمندر پر بسے شہر کے خوبصورت نظارے کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں سے دیکھتے ہوئے جو چیز سب سے زیادہ باعث کشش ہے وہ یہاں کی سرخ اور مٹیالے رنگ کی ایک جیسی عمارتیں اور ہر جگہ مسجدوں کے بلند اور دیدہ زیب مینارے اسلامی شان وشوکت کی منہ بولتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ یہاں سے واپس جاتے ہوئے ہم اس تاریخی پُل (تقسیم

برتج)سے گزرے جو یوروپ اور ایشیا کو آپس میں جوڑتا ہے یہ تقسیم کا علاقہ انتہائی خوبصورت ہے۔ پل اتنی اونچائی پر ہے کہ اس کے نیچے سے بڑے بڑے جہاز گزر سکتے ہیں۔ پل کے عین کنارے ایک انتہائی خوبصورت مسجد ہے جسے کشتی پر سوار ہو کر نزدیک سے دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ اس مسجد کا صحن عین سمندر میں واقع ہے۔ ویو پوائنٹ سے ہم اسکودر، ایشائی جانب سمندر کا وہ کنارہ جہاں سے سیاح چھوٹے چھوٹے جہازوں پر بیٹھ کر سیر کرتے ہیں۔ ہم بھی اس کنارے پر پہنچے ہمارے لیے میز بانوں نے ایک خاص کشتی کا انتظام کر رکھا تھا۔ ہمارے ساتھ انڈیا لاگ کی جانب سے حیدرآباد سے آئے مہمان بھی تھے اور ہمارے دوست جناب عابد عبدالواسع بھی ہمر ہی کا لطف بڑھا رہے تھے۔ ہم اور عبدالواسع، ڈاکٹر رضوان، پروفیسر خالد سعید، وٹل راؤ، ستیہ پرکاش اور عثمان اولا نا نے کشتی کے عرشیے پر ہی بیٹھنا پسند کیا۔ باقی لوگ جہاز کی نچلی منزل پر حسین مناظر کا لطف لے رہے تھے۔ ہوائیں اتنی تیز تھیں اور کشتی جس طرح ہچکولے لے رہی تھی کہ اوپر کھڑا ہونا مشکل تھا۔لیکن ہم لوگ اس وقت کا انتظار کر رہے تھے کہ کشتی مسجد کے کنارے پہنچے تو ہم اس کی تصویر لے سکیں۔ تقسیم برتج کراس کرتے ہی کچھ دوری سے گولڈن ہارن کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ یہ پرانے شہر کا منظر ہے۔ ہم لوگ تقسیم پل کے پاس سے ہی واپس لوٹے اس کے بعد گرلز ٹاور دیکھنے گئے۔ یہ سمندر کے بیچ ایک چھوٹے سے جزیرے پر واقع ہے۔ یہ اونچے مینار کی طرح بنا ہوا جس میں تین منزل ہے۔اس مینار کے بارے میں مشہور ہے کہ قدیم دور کے بادشاہ کو اس کے نجومی نے بتایا کہ آپ کی لڑکی کی موت سانپ کاٹنے سے ہوگی۔ بادشاہ نے اس ڈر سے سمندر کے بیچ اس کے لیے ایک گھر بنوایا۔ ہر صبح اس کا معمول تھا کہ اپنی لڑکی کے لیے پھولوں کا گلدستہ بھیجتا تھا۔ایک دن اسی گلدستے میں ایک سانپ چھپا تھا۔ جب لڑکی نے اس گلدستے کو لیا تو سانپ نے ڈس لیا اور اس کی موت ہوگئی۔اسی مناسبت سے اس ٹاور کو گرلز ٹاور کہا جاتا ہے۔

شام کی بس سے انقرہ کے لے روانہ ہوئے۔ یوں تو ہمیں قونیا جانا تھا لیکن ایک دن کا وقت تھا سوچا انقرہ دیکھتے جائیں۔لہٰذا ہم نے ایشائی حصے سے انقرہ کی بس لی۔ یہاں کی بسیں بھی کیا خوب ہیں۔ ہر طرح کی سہولت کے ساتھ ساتھ انتہائی آرام دہ۔ ہر سیٹ پر ٹیلی ویژن اسکرین موجود تھی جس میں چھ سات چینل آ رہے تھے۔استنبول انقرہ روڈ خوبصورت پہاڑ کی وادیوں سے

ہو کر گزرتا ہے راستے میں کئی جگہ ایسا محسوس ہوا جیسے ہم سرنگ سے گزر رہے ہوں کیونکہ دونوں جانب سے بلند اور ہر بھرے درختوں سے مزین پہاڑ کھڑے تھے۔ البتہ کچھ ہی دیر بعد ایک ایسے سرنگ میں ہماری بس داخل ہوئی جس کی لمبائی چار کیلومیٹر کے آس پاس تھی۔ پہاڑی سلسلوں کے درمیان کئی چھوٹے بڑے جھیل بھی قدرت کے حسین مناظر پیش کر رہے تھے۔ اس لیے ہم ٹی وی دیکھنے کے بجائے باہر کے نظارے سے لطف انداز ہو رہے تھے۔ رات دس بجے انقرہ شہر میں داخل ہوئے۔ بس اسٹینڈ کی جانب جب ہماری بس جا رہی تھی تو مجھے ایسا لگا جیسے غلط جگہ یہ بس داخل ہو رہی ہے کیونکہ یہ بس اسٹینڈ بالکل ائیر پورٹ جیسا تھا۔ دومنزلہ عمارت اور بہت ہی وسیع وعریض رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ بس اسٹینڈ کا نقشہ بالکل ائیر پورٹ جیسا تھا۔ ہم نے پہلی دفعہ ایسا بس اسٹینڈ دیکھا تو حیرت ہوئی۔ بس سے اتر کر ہم اپنے میزبان کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں دوصاحبان آئے اور انھوں نے کہا ''اِندستانی'' وہاں کے لوگ ہندستان کو اندستان کہتے ہیں۔ اس کے بعد ہم ان کے ساتھ ہو لیے۔ اکسیلیٹر کے ذریعے اوپری منزل پر گئے اور باہر نکل کر ان کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس وقت مجھے یہ شعر یاد آیا اور بار بار ڈاکٹر رضوان کو سنا کر لطف لیتا رہا:

زبانِ یارِمن ترکی و من ترکی نمی دانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ من

وجہ یہ تھی کہ جو دوصاحبان ہمیں لینے آئے تھے انھیں انگریزی بالکل نہیں آتی تھی، اور ہمیں ترکی نہیں آتی تھی۔ ہم اشاراتی زبان میں کام چلا رہے تھے۔ ترکی میں مشکل یہ ہے کہ کم ہی لوگ ترکی کے علاوہ کوئی اور زبان جانتے ہیں۔ خیر ہم گیسٹ ہاؤس گئے اور رات آرام کیا۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر شہر کی جانب جانے کا ارداہ تھا۔ اتفاق سے ایک ایسے صاحب مل گئے جنھیں عربی زبان آتی تھی۔ ان سے ڈاکٹر رضوان نے عربی میں بات کر کے شہر کے بارے میں معلوم کرنا چاہا تا کہ کم سے کم وقت میں اور ایک ہی دن میں ہم لوگ انقرہ شہر دیکھ لیں۔ ہمارے ساتھ انڈیا لاگ کے ایک دوست انقرہ کے ایک اسکول دیکھانے لے گئے۔ اس اسکول کو دیکھا جہاں ہر طرح کی جدید سہولتیں دستیاب تھیں اور اسکول کیا ہمارے یہاں تو کورپوریٹ کے ایسے دفتر بھی نہیں ہوتے۔ بہت ہی خوبصورت اور جگہ جگہ قالین بچھی ہوئی، کلاس روم میں تمام جدید ترآڈیو، ویڈیو

سہولیات، انتہائی قابل اساتذہ۔ ان سے مل کر اندازہ ہوا کہ اسکول کا ایسا بھی معیار ہوتا ہے۔ اسی اسکول کے کینٹین میں ہم نے دوپہر کا لذیز کھانا کھایا۔ اس کے بعد میوزیم اور انقرہ کی مارکیٹ کی سیر کی۔ شہر کی جامع مسجد میں نماز پڑھی ہمارے ساتھ ایک ترک بزنس مین تھے جن کی گاڑی میں ہم گھوم رہے تھے۔ یہ صرف ترکی زبان جانتے تھے اس لیے فاتح یونیورسٹی کے ایک طالبعلم کو ہمارے مترجم کے طور پر ساتھ کر دیا گیا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد منبر کے نزدیک ہی ہم کچھ دیر بیٹھے رہے۔ ہمارے میزبان نے بتایا کہ جس قالین پر آپ بیٹھے ہوئے ہیں یہ مسجد نبوی میں ریاض الجنہ کی قالین ہے اور اس کی ساتھ سرخ رنگ کی قالین بھی مسجد نبوی سے تحفے میں یہاں آئی ہے۔ چونکہ مسجد نبوی کے لیے قالین یہیں سے بن کر جاتی ہے لہذا جب وہاں قالین تبدیل کی جاتی ہے تحفے میں یہاں قالین بھیجی جاتی ہے۔ اس کے برابر ہی واٹر کنٹینر رکھا تھا جس میں زمزم تھا ہم نے شکم سیر ہو کر زمزم بھی پیا۔ نماز کے بعد ہم نے ٹرالی میں سفر کرنے کا ارادہ بنایا۔ چونکہ انقرہ نشیب وفراز کا علاقہ ہے اس لیے اس ٹرالی پر سوار ہو کر شہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ دو کیلومیٹر لمبے راستے پر ہم نے ٹرالی کے سفر کا مزہ لیا۔ شام کو انقرہ کی ایک مسجد میں عصر کی نماز کے لیے رکے۔ اسی احاطے میں ایک بزرگ کا مزار ہے جو بہت ہی قدیم ہے۔ یہ مسجد کئی سو سال پرانی تھی اس لیے وہاں مرمت کا کام چل رہا تھا۔ لیکن نمازیوں کو کوئی تکلیف نہ ہو اس لیے عمدہ قسم کے شامیانے سے ایک عارضی مسجد بنائی گئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس عارضی مسجد میں بھی تمام طرح کی سہولیات تھیں اور یہ عارضی مسجد بھی باضابطہ ایک مسجد تھی۔ اس پر اتنے پیسے خرچ کیے گئے ہوں گے کہ ہم اتنے میں ایک نئی مسجد بنا سکتے ہیں۔ خیر یہ ترکوں کی دریا دلی کا ثبوت ہے۔ البتہ یہاں مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ عارضی مسجد تھی۔ نماز کے بعد ہم مزار پر فاتحہ کے لیے حاضر ہوئے۔ رات دیر گئے ہم گیسٹ ہاؤس واپس آئے۔ علی الصباح قونیا کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ راستہ بھی ویسا ہی پر بہار تھا۔ راستے میں ہم نے دیکھا کہ ہر طرف سرسبز وشاداب کھیتی کی زمینیں تھیں اور بیچ بیچ میں چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ لیکن شاید انھیں گاؤں کہنا مناسب نہیں ہوگا کیونکہ ان کے مکانات بھی ویسے ہی خوبصورت تھے اور آنے جانے والی سڑکیں بھی نہایت عمدہ تھیں۔ چھوٹی سی آبادی کے بیچ بھی ایک مسجد ضرور تھی۔

قونیا پہنچ کر مولانا روم یونیورسٹی گئے۔ پروفیسر بہاء الدین آدم وائس چانسلر اور سر ہادتیکی لیوغلو جنزل سکریٹری سے ملاقات ہوئی انھوں نے اس یونیورسٹی کے قیام کے بارے میں ہمیں بتایا کہ یہ ابھی ایک سال پرانی یونیورسٹی ہے۔اس یونیورسٹی کے تعلیمی منصوبے کے بارے میں بتایا اور جب اس کی عمارت کی بات کی تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہی۔اس یونیورسٹی میں ابھی تعمیر کا کام چل رہا تھا۔انھوں نے یہ بتایا کہ یہ پوری عمارت اس سے پہلے ایک شاپنگ مال تھا۔ جسے ایک صاحبِ خیر نے یونیورسٹی کے نام پر وقف کر دیا ہے۔ یہ جان کر واقعی حیرت انگیز خوشی ہوئی کہ ایسے بھی لوگ ہیں جن کے اندر ایسا دینی جذبہ موجود ہے۔اس کے بعد ہم نے جمعہ کی نماز سے فارغ ہوکر کھانا کھایا اور کچھ دیر بعد مولانا روم کے مزار پر حاضری کے لیے روانہ ہوئے۔مولانا روم جن کو بار بار پڑھا اور تصوف کے حوالے سے جن کا ذکر بار بار سنا ان کے دربار میں حاضری کی خوشی تھی ہم چاہ رہے تھے جلد پہنچ جائیں۔بس میں بیٹھے دور سے ہی اس گنبد کو دیکھنا چاہتے تھے مگر سڑکوں پر ہر جگہ ہرے بھرے درخت تھے اس لیے دور سے گنبد نہیں دیکھائی دیا۔ جب ہماری بس رکی تو سامنے وہ گنبد بھی تھا اور مولانا روم کے مزار کے احاطے کی وسیع وعریض عمارت کی دیواریں۔ہم اندر داخل ہوئے۔اور پہلے مزار پر حاضری کے لیے پہنچے۔اندر داخل ہوتے ہی مارہرہ مطہرہ کہ یاد آ گئی۔ایک ہی چھت کے نیچے بہت سارے مزار تھے۔ ہماری بائیں جانب کے مزارات پر سفید رنگ کی پگڑی اور دائیں جانب کے مزارات کے سرہانے سبز رنگ کی پگڑی بندھی تھی۔ ہم نے جب دریافت کیا تو معلوم ہو کہ جو ان کے خاندان کے بزرگ ہیں ان کے مزار کے سرہانے سفید رنگ کی پگڑی ہے اور جو ان کے سلسلے کے بزرگ ہیں ان کے سرہانے سبز رنگ کی پگڑی ہے۔اور دائیں جانب بالکل آخری حصے میں مولانا روم کا مزار تھا۔ یہ مزار تقریباً چھ فٹ اونچا اور آٹھ فٹ لمبا تھا۔مزار پر قرآنی آیات لکھے ہوئے سبز رنگ کی چادر تھی اور سرہانے مزار پر ایک گول سا حصہ نکلا ہوا تھا جس پر سفید رنگ کی پگڑی بندھی ہوئی تھی۔زمین میں یہاں سے وہاں تک مزار سے بالکل متصل قالین بچھی ہوئی تھی۔ یہاں فاتحہ پڑھنے کے بعد اسی احاطے میں آگے مولانا روم کے تبرکات تھے۔کچھ ان کے کپڑے، جبہ،ٹوپی کے علاوہ ایک بہت ہی لمبی تسبیح تھی جو لکڑیوں سے بنی ہوئی تھی۔اس کے علاوہ نَے (بانسری نما آلۂ موسیقی) مضراب اور دف۔ کچھ ہی دوری پر قرآن

پاک کے کئی نادر نسخے اور مثنوی مولانا روم کے کئی نسخے تھے۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد ہم دوسرے کنارے پر ایک بڑے ہال میں داخل ہوئے جہاں انسانی شکل کے کئی لوگوں کی شبیہ بنائی گئی تھی۔ ایک گول میز کے کنارے مولانا روم اوران کے شاگرد تھے اور دوسری جانب ان کے خدام اور مطبخ تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کیوں بنایا گیا ہے۔ کسی نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تو میں نے یہ قیاس کیا کہ شاید اس لیے ہو کہ یہاں ہمیشہ پوری دنیا سے لوگ مولانا روم کے مزار پر آتے ہیں اور مسلمانوں سے زیادہ غیر ملکی اور یوروپی آتے ہیں۔ آج کے زمانے میں تصوف پر یوں بھی بہت زور ہے تو جو شخص بھی تصوف کے بارے میں کچھ جاننا یا پڑھنا چاہتا ہے تو وہ مولانا روم کو ضرور پڑھتا ہے۔ اس لیے شاید ان کی سمجھ کے لیے میوزیم کی طرز پر اس کو ڈیولپ کیا گیا ہو۔ قونیا کا صوفی رقص جو پوری دنیا میں مشہور ہے، اسے وہاں دیکھنے کا موقع تو نہیں ملا مگر اس رقص کی تصویریں پورے قونیا شہر میں دیکھنے کو ملیں۔ مزار سے متصل ایک بازار ہے جہاں سے کئی چیزیں خریدیں اور حیرت اس بات پر ہوئی کہ ہمارے یہاں نظام الدین اولیا یا خواجہ غریب نواز کے مزار پر فاتحہ کے لیے جو لقم دانہ ملتا ہے، ویسا ہی لقم وہاں ہر طرف بک رہا تھا۔ لیکن وہاں کے لقم کا جو مزہ ہے وہ یہاں نہیں ہے۔ ترکی میں بھی اسے لقم ہی بولا جاتا ہے۔ وہاں کسی مزار پر پھول چڑھانے یا فاتحہ کے لئے کچھ اندر لے جانے کی اجازت نہیں۔ مولانا روم کا مزار چونکہ ایک بڑی مسجد کے احاطے میں ہے اس لیے ان کے مزار کی چھت پر سبز رنگ کا ایک مینار بنا ہوا ہے۔ یہیں سے کچھ دوری پر ایک مسجد ہے جس میں شمس تبریزی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مبارک ہے۔ ہمیں یہاں بھی فاتحہ پڑھنے کو موقع ملا۔

شام کو ہمارے میزبان جناب عصمت صاحب کھانے کے لیے ایک شاندار ریسٹراں لے گئے اور کہا کہ چلیں آج قونیا اور ترکی کی ایک مشہور ڈش کھلاتے ہیں۔ انھوں نے ترکی پیزا کا آڈر دیا۔ کچھ ہی دیر میں پیزا کے ساتھ لذیذ چٹنی ہمارے سامنے تھی۔ یہ پیزا نان کی طرح تھا جس پر گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے واقعی بڑا لذیذ تھا۔ کھانے کے درمیان عصمت صاحب نے بتایا کہ اس پیزے کا ڈیمانڈ اب یوروپ میں بھی ہونے لگا ہے اور ترکی کے لوگ مغربی طرز کا پیزا کم ہی کھاتے ہیں۔ رات کے پر لطف کھانے کے بعد ہمیں اگلے دن کے سفر کی فکر تھی کیونکہ

دوسرے دن ہی ہمیں شام کی فلائٹ سے دہلی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ ہم نے سوچا رات ہی کو بس سے استنبول کے لیے روانہ ہو جائیں۔ لیکن ہم کافی تھک چکے تھے اس لیے یہ مشورہ ہوا کہ صبح کی فلائٹ سے استنبول جائیں گے۔ لہٰذا جب ہم نے اپنے دوست عثمان اولانا کو جہاز کے ٹکٹ بک کرنے کی گزارش کی۔ انھوں ٹکٹ بک کر کے پی این آر نمبر ایس ایم ایس کر دیا۔ اس کے بعد فون پر ہمیں بتایا کہ جہاز کا ٹکٹ بس سے سستا ہے۔ بس کا کرایہ 80 ترکی لیرا تھا اور جہاز کا صرف 59 لیرا۔ یہ ہمارے لیے حیرت کی بات تھی۔ لیکن معلوم ہوا کہ لوگ بس سے زیادہ سفر کرتے ہیں اور دور کی بسیں بہت آرام دہ اور جہاز کی طرح چائے پانی کے علاوہ لنچ وغیرہ کا بھی باضابطہ اہتمام کرتے ہیں۔ خیر ہم صبح کی فلائٹ سے گیارہ بجے استنبول پہنچ گئے۔ بھائی عثمان اولانا ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ انٹرنیشنل ائیر پورٹ جانا تھا۔ لیکن ہمارے پاس وقت ابھی بہت تھا اس لیے وہ ہمیں ترکی کے مشہور اسپائس بازار لے گئے جو سلطان فاتح برتج جو یوروپی حصے پر واقع ہے۔ یہاں ہمیں کچھ پاکستانی لوگ اردو بولتے ہوئے ہمیں کچھ خریدنے کی دعوت دے رہے تھے۔ ہم نے پہلی دفعہ یہاں کسی کو اردو بولتے ہوئے سنا۔ اس لیے ان سے رغبت ہوئی اور ان کی دکانوں سے بچوں کے لیے کچھ تحائف خریدے۔ بھائی عثمان نے بھی ترکی کی مشہور چائے کی پیالی (فنجان) خرید کر تحفے میں ہمیں پیش کیا۔ اور 4 بجے ہم انٹرنیشنل ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ ترکی کو الوداع کہتے ہوئے تکلیف ہو رہی تھی مگر اس دعا کے ساتھ جہاز پر روانہ ہوئے کہ اللہ اس ملک میں بار بار آنا نصیب کرے۔ اس کے کچھ ہی مہینوں بعد ترکی کا دوسرا سفر ہوا۔

انتلیا میں منعقدہ فیملی کانفرنس: ایک تاثر اور روداد

ترکی کے سیاحتی شہر انتلیا میں منعقدہ فیملی کانفرنس (نومبر 2010) میں شرکت اور اس سمینار کے کچھ تاثرات قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔

آج کی دنیا کو کئی اعتبار سے جانا جاتا ہے۔ اکیسویں صدی کے اس دور کو کبھی ترقی کی منتہاؤں کا دور کہا جاتا ہے تو کبھی اس کو انقلاب اور انکشافات کا دور کہا جاتا ہے۔ لیکن اس ترقی کی چکا چوند اور شاید زعم نے انسانوں کو بنیادی انسانی اقدار سے دور کر دیا ہے۔ اسی لیے کوئی بھی شخص

کسی بھی فلیٹ فارم سے انسانی اقدار کی پاسداری کے لیے باتیں نہیں کرتا۔ انسانی حقوق کی باتیں کرتے ہوئے کئی تنظیمیں مل جاتی ہیں۔ لیکن انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی بیشتر تنظیمیں یا تو جدید معاشرے کے تقاضے کے تحت ایسے انسانی حقوق کی باتیں کرتی ہیں جو معاشرے کے موجودہ مسائل پر کسی حد تک بحث تو کرتی ہے لیکن معاشرے میں انتشار، بے قراری اور امن وسکون کو غارت کرنے والے ان بنیادی مسائل کی جانب نہ تو توجہ دی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی جانب عام طور پر لوگوں کی نگاہیں جاتی ہیں۔ مثلاً آج کا معاشرہ عورتوں اور مردوں کو بہ حیثیت دوست ساتھ رہنے کے حق کے لیے باتیں تو کرتا ہے۔ لیکن اس نئے رشتے کی وجہ سے پیدا ہونے والے نئے مسائل کی جانب کم ہی نظریں اٹھتی ہیں۔ اسی طرح اور بھی کئی مسائل ہیں جو آج کے معاشرے کو اندر سے کھوکھلا کر رہے ہیں۔ لیکن ان کی جانب کم ہی لوگ، ادارے اور تنظیمیں توجہ دے رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے معاشرے کی سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ خانگی زندگی، خاندان اور کنبے کا تصور ختم ہوتا جارہا ہے۔ جس کے نتیجے میں عالمی معاشرے میں خاص کر معاشی اور اقتصادی اعتبار سے ترقی یافتہ سماج میں امن وسکون کی فضا یکسر ختم ہوگئی ہے۔ کیونکہ خاندان اور خانگی زندگی ہی اس دنیا کا وہ تاثر تھا جس نے افراد کو ایک ایسے جذباتی رشتے میں باندھ رکھا تھا جو کسی مفاد کے بغیر بے لوث ایثار اور محبت فراہم کرتا تھا۔ لیکن آج کی تیز رفتار دنیا اور ترقی نے انسانوں کو ہر طرح کی سہولیات اور آسائش تو فراہم کر دی ہے لیکن قلبی سکون چھین لیا ہے۔

آج کی دنیا کے اس انتہائی اہم اور سنجیدہ موضوع پر ترکی کی ایک بین الاقوامی تنظیم ڈائیلاگ یوریشیا فلیٹ فارم نے 25 تا 29 نومبر کو انتلیا میں سہ روزہ بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس کانفرنس میں تقریباً 50 ملکوں سے 600 سو سے زائد مندوبین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں شرکت کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کانفرنس اپنے دور کی آواز اور وقت کے اہم تقاضے کی جانب غور فکر کرنے والی کانفرنس تھی۔ اس کانفرنس کے انعقاد اور موضوع کے انتخاب کرنے والے یقیناً دور اندیش اور دور بین افراد ہی ہو سکتے ہیں، جنھوں نے اس کی ابتدا کی ہے اور اسے بحث کا موضوع بنایا۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب یہ موضوع بڑے پیمانے پر مباحثے کا عنوان بنے

گا کیونکہ وہ افراد بھی کہیں نہ کہیں سے داخلی کرب کے شکار ہیں جو ترقی کے نشے سے مسرور تھے۔ لیکن دنیا میں سب کچھ مادیت ہی نہیں۔ معاشرے کی تشکیل کے لیے جن انسانی اقدار کی ضرورت ہے، اس کی کمی بہت واضح طور پر تو نہیں لیکن کسی بے نام کمی کا احساس اس لیے ہو رہا ہے کہ لوگ قلبی سکون اور دلی خوشی سے عاری ہوتے جا رہے ہیں۔ آج کے معاشرے نے اس بات کو فراموش کر دیا ہے کہ معاشرتی زندگی میں مضبوط خانگی زندگی، خاندان، کنبہ اور خویش و اقارب دراصل خوشی و مسرت کا منبع ہیں۔ انسان کو جب تک اپنی خوشی اور غم کے اظہار کے لیے کوئی غمگسار نہیں ملتا اس وقت تک اس کے دل میں ایک اضطراب کی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ انسان کی جبلی فطرت ہے کہ وہ اپنا کسی کو ہمراز بنائے، ہمراز وہ جو بے لوث جذبات رکھتا ہو، اور یہ خانگی زندگی میں ہی مل سکتا ہے۔ لیکن اس عہد کا المیہ یہ ہے کہ اب خانگی زندگی کا تصور ختم ہوتا جا رہا ہے۔

ڈائیلاگ یوریشیا پلیٹ فارم کی اس پہل کو ایک انقلابی پہل کہہ سکتے ہیں کہ ایسے اچھوتے موضوع پر اتنے بڑے پیمانے پر بحث و مباحثہ کا موقع فراہم کیا۔ کانفرنس کا بنیادی موضوع "Reflections on Family as a Virtue with Respect to Religion, Tradition and Modernity" تھا۔ دو دنوں تک چلنے والی اس کانفرنس میں متوازی طور پر (parallel) تین سیشن چلتے رہے۔ جن میں انتہائی محنت سے لکھے گئے مقالے پڑھے گئے۔ مجموعی طور پر ان مقالوں میں مذہبی، معاشرتی، علاقائی، نظریاتی اور جدید طرز کی فیملی لائف کا احاطہ کیا گیا تھا۔ کانفرنس کی اختتامی تقریب میں مجموعی طور پر ان کا جائزہ لیا گیا اور کئی تجاویز بھی منظور کی گئیں۔ اس تناظر میں یہ بات نکل کر سامنے آئی کہ فیملی لائف پر کئی بے جا جبر ہیں۔ موجودہ دور میں انسان کے ذہنی اضطراب کی وجہ فیملی لائف کے ختم ہوتے اقدار ہیں۔ بہت سے قدیم تصورات اور روایات نے بھی فیملی لائف کو پھلنے پھولنے سے محروم رکھا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ فیملی کو ایک صحیح تناظر میں دیکھا جائے۔

کانفرنس کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ منتظمین نے بڑی فیاضی، فراخدلی سے اس کا انتظام وانصرام کیا تھا۔ انتلیا کے سب سے مشہور ہوٹل ریکسوس میں مندوبین کو ٹھہرایا گیا۔ یہیں تین دنوں کا سیمنار رہوا۔ یوں تو ترکوں کی ضیافت مشہور ہے۔ لیکن ہم نے یہاں جو دیکھا وہ لفظوں میں نہیں بیان

کیا جا سکتا۔ مہمانوں کے قیام کا بہتر سے بہتر انتظام اور طعام کا ایسا انتظام کہ ہمیں کسی طور پر اسے کانفرنس کا کھانا نہیں کہہ سکتے۔ انواع واقسام کے مشروبات، میوے اور پھل، مختلف علاقوں کے کھانے، طرح طرح کی میٹھائیاں۔ بلا مبالغہ اس سیون اسٹار ہوٹل کے خوبصورت لانج میں کتنے انواع واقسام کے کھانے تھے کہ ہم نے کئی بار گننے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ یہ ہوٹل بھی اس قدر حسین قدرتی مناظر کے درمیان واقع تھا کہ بس دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک جانب سمندر اور دوسری جانب ہرے بھرے باغات تھے اور خوبصورت پہاڑی سلسلے۔ ظاہر ہے منتظمین نے دور سے آئے مہمانوں کے استقبال اور ضیافت کے لیے سب سے عمدہ جگہ کا انتخاب کیا۔ یہ ان کے طرز ضیافت کی ادا ہے۔

تیسرے دن یعنی 29 نومبر کو ڈائیلاگ یوریشیا پلیٹ فارم کی 9 ویں جنرل میٹنگ تھی۔ یہ دو سال کے وقفے کے بعد ہوتا ہے۔ اس میں نئے صدر کا انتخاب بھی ہونا تھا۔ اس مٹینگ میں ممبر ممالک نے شرکت کی۔ ہندستان سے ہم نے Observer کی حیثیت سے شرکت کی۔ اب تک ہندستان کی شرکت نہیں ہوئی تھی۔ جناب الیاس تاس اور عثمان صاحب کے ہم مشکور ہیں کہ انھوں نے ہمیں یہ موقع فراہم کیا۔ اس تنظیم کی خاص بات یہ ہے کہ یوروپ اور ایشیا کے درمیان جو تہذیبی اور معاشرتی مشترک قدریں ہیں، ان پر بات ہوتی ہے۔ اس کو اگر وسیع پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ یوروپ اور ایشیا کے درمیان ایک پل کی مانند ہے جو مختلف ممالک کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرتا ہے تاکہ سب مل کر اس دنیا کی تعمیر وترقی کے حوالے سے سوچ سکیں اور مستقبل میں ترقی پذیر دنیا کو امن وامان کی راہ دکھا سکیں۔ اپنے مشاہدے کی بنیاد پر میں اخیر میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ ہم اس میں شریک ہوئے اور نئے تجربات کے ساتھ ہندستان آئے۔ اور یہ بھی امید کرتے ہیں کہ آئندہ ہندستان بھی ایک ممبر ملک ہوگا۔

استنبول میں اردو تدریس کی صد سالہ تقریب

2015 میں استنبول کا تیسرا سفر بہت بامعنی اور مفید رہا۔ یہ اردو تدریس کی سو سالہ تقریب کا موقع تھا۔ ترکی میں اردو تدریس کے سو سال مکمل ہونے پر استنبول یونیورسٹی شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر خلیل طوق آر نے بڑے پیمانے پر اس تقریب کا اہتمام کیا۔ بارہ اکتوبر سے چودہ اکتوبر تک ایک عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس میں ہندستان، پاکستان، امریکہ، کناڈا، جرمنی، روس،

بنگلہ دیش، ایران اور یوروپ کے بیشتر ممالک سے اردو کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ کو مدعو کیا گیا تھا۔تقریباً 80 غیر ملکی مندوبین نے شرکت کی۔ترکی کے ان تمام شعبے کے اساتذہ بھی شریک ہوئے جہاں جہاں اردو کی تدریس ہوتی ہے۔اس شاندار عالمی کانفرنس میں انھوں نے مہمانوں کے لیے بھی بہت عمدہ انتظامات کیے تھے۔کسی کی زبان پر حرف شکایت نہیں تھی۔تین دنوں تک اردو کی محفل سجی۔منفرد موضوعات پر اچھے مقالے پیش کیے گئے۔ ہندستان سے بھی شرکا کی اچھی تعداد تھی۔ پروفیسر خلیل طوق آر کی کارکردگی اوران کے کارناموں اورخدمات کی ستائش اوراعتراف کے لیے ہم نے انھیں ایک اعزازی سنداورشیلڈ پیش کیا۔افتتاحی تقریب میں مجھے خصوصی لیکچر کی دعوت دی گئی تھی۔اس کانفرنس میں بہت سے مہجری ادیبوں سے ملنے کا موقع ملا۔یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات نے بھی جی جان لگا کر محنت کی اوراس کانفرنس کو کامیاب بنایا۔میرا خیال ہے کہ اردو کی بستیوں میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی منفرد اور کامیاب کانفرنس تھی۔

ترکی میں اردو کا اورسب سے بڑا شعبہ استنبول یونیورسٹی میں قائم ہے جو 1974 میں قائم ہوا۔ یہاں بی۔اے۔، ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ترکی میں سب سے فعال یہی شعبۂ اردو ہے۔ یہاں کے نامی گرامی استاد پروفیسر خلیل طوق آر ہیں جواردو کے اچھے نثر نگاراورشاعر بھی ہیں انھوں نے پچاس سے زائد کتابوں کی تصنیف وتالیف اورترجمہ کیا ہے۔دیار غیر میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے حکومت پاکستان نے اردو کے لیے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ایک سال قبل تمغۂ امتیاز سے نوازا ہے۔خلیل طوق آر اردو کے ان ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اردوزبان کے ساتھ ساتھ اردو تہذیب وثقافت کوفروغ دیا ہے۔وہ جتنے نفیس انسان ہیں اتنی ہی نفیس ان کی اردوزبان اورلب ولہجہ ہے۔ان کے علاوہ پروفیسر جلال سوئیدان، ڈاکٹر درمش بلغور، ڈاکٹر کارداش ذکائی، آرزو سورین اور خدیجہ گورگن اس شعبے سے وابستہ ہیں۔اس شعبے میں ایک ہندستانی استاد ڈاکٹر راشدالحق بھی ہیں جو کئی برسوں سے یہاں اردو تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ بیک وقت اردواورفارسی دونوں زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں۔اس شعبے نے تحقیق،تنقیداورشاعری کی سمت میں بڑے کام کیے ہیں۔ یہاں اکثر و بیشتر ادبی سیمناروں کا بھی انعقاد کیا جاتا رہا ہے۔پروفیسر خلیل طوق آر نے ہی 2015 میں اردو کا جشن صد سالہ پروگرام کا اہتمام کیا تھا۔ان کی مقبولیت کے سبب ہی دنیا بھر کے مندوبین

نے ان کی دعوت قبول کر کے شرکت کی تھی۔

ترکی میں اردو تدریس کا سلسلہ سب سے پہلے انقرہ یونیورسٹی میں 1956 سے شروع ہوا۔ پاکستانی حکومت نے اس سلسلے میں بڑی مدد کی اور اپنے ملک سے ڈاکٹر داؤد رہبر کو یہاں اردو تدریس کے لیے بھیجا انھوں نے اردو کورسیز کو مرتب کیا اس طرح یہ شعبہ ترقی کرتا گیا۔ اردو کے پہلے ترک استاد شوکت بولو ہیں ان کی سبکدوشی کے بعد ڈاکٹر سلمی بینلی نے انقرہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو کا عہدہ سنبھالا۔ اس درمیان پاکستان سے کئی اردو کے اساتذہ جاتے رہے۔ فی الوقت یہاں ڈاکٹر گلسرین ہالی جی اوز کان، ڈاکٹر آسمان بیلن اوز جان اور ایمیل سیلیم اردو کی استاد ہیں۔ یہاں بی۔اے، ایم۔اے اور پی ایچ ڈی کی سطح تک اردو کی تعلیم کا نظم ہے۔لیکن یہاں بھی پی ایچ ڈی کے مقالے ترکی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔

سلجوق یونیورسٹی جوقونیا میں واقع ہے یہاں بھی اردو کا بڑا شعبہ ہے جو ڈاکٹر ایرکن ترکمان کی کوششوں سے 1985 میں قائم ہوا۔ یہاں بھی ایم۔اے تک کی تعلیم کا نظم ہے اس شعبے میں اردو کے طلبہ وطالبات کی خاطر خواہ تعداد ہے۔ یہاں بھی ایم۔اے کے مقالے ترکی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ یہاں کے اساتذہ میں ڈاکٹر نوریے بلک، ڈاکٹر درمش بلغور، ڈاکٹر خاقان قیومجو، ڈاکٹر رجب درگن کے نام اہم ہیں۔

ان کوائف سے اندازا ہوتا ہے کہ ترکی میں اردو کی اعلیٰ سطح پر اردو کی تدریس بڑے پیمانے پر ہورہی ہے۔ یہاں مختلف اصناف نثر ونظم پر سو سے زائد پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جاچکے ہیں۔ کچھ مقالے جستہ جستہ شائع بھی ہوئے ہیں جن سے کم از کم ترکی جاننے والے مستفید ضرور ہوئے ہیں۔ ان تمام یونیورسٹیز سے حکومت پاکستان کے گہرے روابط ہیں۔ ہندستان کو بھی ان سے روابط پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ان اساتذہ کے لیے مشکل یہ ہے کہ یہاں اردو بولنے کا رواج کم ہے اسی لیے زیادہ تر یہ اپنی زبان میں باتیں کرتے ہیں اسی لیے کچھ اساتذہ بہت روانی سے اردو نہیں بول پاتے۔لیکن مقام شکر ہے کہ اردو کی تدریس کا سلسلہ جاری وساری ہے۔

○○○

جاپان کا یادگار سفر

27 مئی 2011 کی شام جب ہم جاپان کے لیے روانہ ہوئے تو ذہن میں کئی طرح کے سوالات تھے۔ پہلے تو یہ بات بار بار ذہن میں آرہی تھی کہ جاپان برصغیر کے مقابلے تہذیبی اعتبار سے کئی معنوں میں مختلف ہے۔ان کے کھانے پینے اور طرز زندگی سب کچھ ہم سے مختلف ہے۔ ہمارے وہ دوست جو اکثر جاپان آتے جاتے رہتے ہیں، ان سے یہ معلوم ہوا تھا کہ جاپان کی تہذیب یہ ہے کہ وہ آپ سے جس قدر بھی قریب ہوں اور جتنا بھی گہرا رشتہ ہو، وہ کبھی اپنے گھر پر مدعو نہیں کرتے۔اولاً وہ مشرقی قدروں کے حامل نہیں ہیں اسی لیے وہ ملنے ملانے میں وقت صرف نہیں کرتے۔فون پر گفتگو اور خیریت مل جانا ان کے لیے کافی ہے۔وہ جب بھی کسی دوست یا مہمان کی ضیافت کرنا چاہتے ہیں تو وہ کسی ریسٹورینٹ میں چائے پر ملاقات کرتے ہیں جو ان کے لیے بڑی بات ہے۔ان کی معاشرتی زندگی کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے بھی ملنے جلنے کا سلسلہ نہیں رکھتے یہاں تک کہ کسی کی موت یا شادی بیاہ میں جب اپنے رشتہ داروں کے یہاں شرکت کا ارادہ کرتے ہیں تو وہ ان کے گھروں میں رکنے کے بجائے قریبی ہوٹل میں قیام کرتے ہیں اور تقریب میں شرکت کرتے ہیں جو ظاہر ہے کسی ہوٹل میں یا ہال میں ہوتی ہے۔لیکن موت کے معاملے میں وہ سیدھے اس مقررہ جگہ پر جاتے ہیں جہاں میت کو نذر آتش کیا جانا ہوتا ہے۔ اسی لیے موت کی خبر دیتے وقت رشتہ داروں کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کہاں اور کتنے بجے آخری رسومات ادا ہونی ہے۔خوشی کے موقعوں پر اپنے انتہائی قریبی رشتہ داروں کو ہی پوچھا جاتا ہے۔

ہماری طرح پورے محلے اور پڑوسیوں کو نہیں پوچھتے۔ خیر یہ ان کی معاشرتی زندگی کی قدریں ہیں۔ اگر ہم انھیں مشرقی طرز کی عینک سے دیکھیں گے تو مایوسی ہوگی۔ ان کی زندگی کے اور بھی بہت سے پہلو ایسے ہیں جو ہمارے لیے بالکل نئے ہیں۔ جن کا تذکرہ آنے والے سطور میں کیا جائے گا۔

جناب ناصر ناکاگاوا، چیف ایڈیٹر اردو نیٹ جاپان کی دعوت پر ہم جاپان کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ اردو نیٹ آن لائن نیوز پیپر اور جاپان میں مقیم پاکستانیوں کا بہت ہی اعلیٰ پائے کا ترجمان ہے۔ یہ ترجمان گذشتہ کئی دہوں سے نیٹ پر شائع ہو رہا ہے۔ حیرت اس بات کی ہے کہ ان برسوں میں اس کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ یہ تقریباً پچاس ممالک میں پڑھا جاتا ہے اور جاپان میں اس کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ ہر شخص اگر چہ مصروف ترین زندگی گزار رہا ہے لیکن ہر صبح وہ نئی تحریروں کا انتظار کرتا ہے اور لوگ اس پر تبصرہ کرتے ہیں۔ فون پر اپنے احباب کو بتاتے ہیں کہ آج کیا خاص بات نیٹ پر موجود ہے۔ میں برسوں سے اس اخبار کو پابندی سے پڑھتا ہوں اور اس کے لیے اپنے کالم بھیجتا ہوں۔ اب تک میرے بے شمار کالم اس اخبار میں شائع ہو چکے ہیں۔ اسی تحریری لین دین کے حوالے سے ناصر ناکاگاوا صاحب سے ہماری فون پر ملاقات رہی۔ فروری دو ہزار گیارہ میں انھوں نے بتایا کہ گذشتہ سال کی طرح اس سال بھی اردو نیٹ جاپان اپنی دوسری سال گرہ کی تقریب منانے جا رہا ہے اور ہماری خواہش یہ ہے کہ اس تقریب میں آپ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوں۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد ان کا میل بھی آیا کہ ادارہ اردو نیٹ، جاپان نے آپ کو 2010 کے بہترین لکھاریوں میں شامل کیا ہے اور آپ کو جیوری ممبرس نے ایوارڈ کے لیے نامزد کیا ہے۔ ان کی پر خلوص دعوت اور بار بار فون کو میں نظر انداز نہ کر سکا اور جاپان جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اتفاق یہ ہے کہ اس پروگرام کو 28 مارچ کو ہونا تھا اس لیے ہم نے ویزا کے لیے پہلے ہی اپلائی کر دیا لیکن ۱۱ مارچ کو جس دن ہمیں ویزا ملا اسی دن وہاں سونامی کی تباہی آئی لہٰذا ہمارا پروگرام ملتوی ہو گیا اور یہ پرگرام 28 مئی کو منعقد ہوا۔

28 مئی کی صبح ہم ٹوکیو کے نریتا ائیر پورٹ پہنچے۔ بھائی ناصر نے ہمیں دہلی سے روانگی کے وقت ہی بتا دیا تھا کہ جناب اصغر حسین صاحب جو جاپان میں غیر مقیم پاکستانیوں میں انتہائی معزز

اور محترم شخصیت کے مالک ہیں وہ آپ کے استقبال کے لیے ہوں گے۔ انھوں نے ان کا فون نمبر بھی ہمیں دیا۔ میں نے دہلی ہی سے ان سے بات کی کہ آپ زحمت نہ کریں لیکن ان کی خواہش تھی کہ دہلی سے آنے والے مہمانوں کا ہم استقبال کریں۔ ہماری فلائٹ موسم کی خرابی کی وجہ سے ایک گھنٹے لیٹ ہو چکی تھی اور اصغر صاحب وقت سے پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ جیسے ہی ہم باہر نکلے ان کو میں نے اس لیے پہچان لیا کہ اردو نیٹ جاپان میں ان کی تحریریں پڑھی تھیں اور ان کی تصویریں بھی دیکھی تھی۔ اصغر صاحب ہم سے اس طرح گلے ملے جیسے صدیوں کی ملاقات رہی ہو۔ ان کا والہانہ انداز دیکھ کر ہم بہت خوش ہوئے اور وہیں سے اجنبیت کا احساس ختم ہونے لگا۔ جب ہم پارکنگ میں پہنچے تو وہاں پرفیسر منجوشری چوہان سے ملاقات ہوئی، وہ ہمیں دیکھ کر اور ہم ان کو دیکھ کر حیرت و خوشی میں ڈوب گئے۔ پرفیسر منجوشری جے این یو میں جاپانی زبان کی استاد ہیں اور ہمارے پڑوس میں رہتی ہیں۔ ان کے جاپان آنے کی وجہ تو ہمیں معلوم تھی کہ وہ اکثر یہاں آتی جاتی رہتی ہیں کیونکہ وہ یہاں کی زبان اور تہذیب سے جڑی ہیں۔ لیکن جب ہم نے اپنی آمد کی وجہ بتائی تو وہ اپنی حیرت کو چھپا نہیں سکیں کہ جاپان میں بھی اردو کی بستی ہے اور اتنی مقبول ہے۔ ان سے ملاقات کے بعد ہم اصغر صاحب کی شاندار گاڑی میں بیٹھ کر ٹوکیو کے لیے روانہ ہوئے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور ہوا میں خنکی تھی۔ ایئر پورٹ سے باہر نکلتے ہی جس شاہراہ پر ہماری گاڑی دوڑ رہی تھی اس کی خوبصورتی جاذب نظر تھی کیونکہ جس طرح کی ہریالی تھی وہ ہم نے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھی تھی۔ سڑکیں کشادہ اور ہر جانب بہت ہی سلیقے سے لگائے گئے درخت تیز ہواؤں کے ساتھ جھوم جھوم کر گویا ہمیں دعوت نظارہ دے رہے تھے۔ سڑکیں اتنی صاف ستھری تھیں کہ کہیں بھی بغیر بستر بچھائے آرام کیا جا سکتا ہے۔ اصغر صاحب نے بتایا کہ ایک ایک درخت اور پھول کے پودے سب کے سب کمپیوٹرائزڈ ہیں۔ بلدیہ کے پاس ہر ایک کا ریکارڈ موجود ہے اس لیے اگر کبھی تیز ہواؤں میں کوئی درخت سڑک پر گر گیا تو اسے ہٹانے میں کوئی تاخیر نہیں ہوتی۔ نریتا سے ٹوکیو شہر کی دوری ایک گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ ہم ان خوشنما مناظر کو دیکھتے ہوئے ٹوکیو شہر کے وسط میں واقع اَپا ہوٹل پہنچ گئے۔ اس وقت جاپان میں دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور ہندستان میں صبح کے آٹھ بجے تھے۔ چونکہ ہم دہلی سے شام کے سات بجے نکلے تھے اور نو بجے

رات ہماری فلائٹ پرواز بھر چکی تھی۔لہذا پوری رات ہم سفر میں رہے۔آنکھوں میں نیند اتری ہوئی تھی۔سوچا کچھ دیر ہوٹل میں آرام کرلیں گے اس کے بعد شام کے فنکشن میں شریک ہوں گے۔لیکن ہوٹل کے ریسپشنسٹ نے بتایا کہ ہم تین بجے سے پہلے چیک اِن نہیں کر سکتے۔وہاں ہوٹلوں میں گیارہ بجے چیک آؤٹ کا ٹائم ہوتا ہے اس لیے شام کو تین بجے کے بعد سے ہی نئے مہمانوں کا استقبال کیا جاتا ہے۔لہذا ہم نے سامان وہیں کاؤنٹر پر رکھا اور اصغر صاحب نے یہ کہا کہ ہم شہر کے کسی ریسٹورینٹ میں کھانا کھائیں گے اور واپس آئیں گے۔لیکن ہوٹل سے باہر نکلتے ہی ان کا ارادہ بدل گیا انھوں نے ہمیں بتایا کہ ہوٹل کے سامنے سڑک کی دوسری جانب جو اپارٹمنٹ ہے اسی میں ان کا فلیٹ اور آفیس بھی ہے۔اس لیے ہمیں وہ اپنے آفیس لے گئے۔ارادہ یہ تھا کہ ہم یہاں فریش ہونے کے بعد شہر کی جانب جائیں گے۔خیر ہم ان کے ساتھ پانچویں منزل پر واقع ان کی آفیس پہنچے۔پہلے ہمیں یہ خیال آیا تھا کہ آفیس میں کیسے فریش ہو سکتے ہیں۔لیکن آفیس میں ہر طرح کا انتظام تھا۔اور آفیس کے بالکل سامنے ہی ان کا گھر بھی تھا۔ہمیں پہلے سے معلوم تھا کہ جاپان میں عموما چھوٹے چھوٹے گھر ہوتے ہیں۔ بالخصوص ٹوکیو شہر میں۔آفیس دیکھ کر بھی اندازہوا۔لیکن اصغر صاحب نے بتایا کہ ٹوکیو میں اتنی بڑی آفیس بھی شاید باید ہی کسی کے پاس ہوتی اور اگر کوئی کورپوریٹ ادارہ ہوتو اور بات ہے لیکن ذاتی آفیس ہونے کے لحاظ سے یہ کافی کشادہ جگہ تھی۔جیسے ہی ہندستانی طرز میں ہم منہ ہاتھ دھو کر بیٹھے وہ چائے اور لوازمات کے ساتھ آفیس میں داخل ہوئے۔یہ لوازمات بھی دوپہر کے کھانے سے زیادہ تھے۔مجھے اندر سے یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ اصغر صاحب بھی پچھلے ستائیس سال سے جاپان میں رہ رہے ہیں۔انھیں جاپانی شہریت بھی مل چکی ہے اور ان کی اہلیہ بھی جاپانی ہیں تو ان کے یہاں بھی جاپانی قدریں در آئی ہوں گی۔لیکن انھیں اس کے برعکس پایا۔بنیادی قدریں ابھی بھی ان کے اندر موجود تھیں۔میں ان خیالات میں غلطاں ہی تھا کہ ان کے صاحبزادے ابراہیم مزید کھانے پینے کی چیزیں لے کر آگئے۔ابراہیم دیکھنے میں اور ملنے جلنے میں بالکل جاپانی نظر آئے۔مشکل سے اردو میں ہم سے بات کی اور اپنے بارے میں بتایا۔جاپان میں یہ ہماری پہلی ضیافت تھی جو ہمارے ذہن میں موجود تصورات سے بالکل برعکس تھا۔اس کے بعد یہ ارادہ ہوا کہ ہم تھوڑی دیر بعد کھانا کھانے باہر جائیں گے۔لیکن

کھانے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس لیے بیٹھے گفتگو کرنے لگے۔ لیکن ہم اپنی نیند نہیں چھپا سکے تو انھوں نے اسی آفیس میں ہمارے سونے کا انتظام کر دیا۔ ہم بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے فوراً ہی سو گئے۔ دو گھنٹے بعد جاپان میں پاکستانی طرز کی چائے پی اور ہوٹل منتقل ہو گئے۔

شام کو چھ بجے اصغر صاحب ہوٹل آئے اور ہم ان کے ساتھ سائتاما پری فیکچر کو روانہ ہوئے جہاں اردو نیٹ کی یہ تقریب ہونی تھی۔ جاپان میں جیسا کہ پہلے عرض کیا کوئی بھی کسی کو اتنا وقت نہیں دیتا اور نہ ہی یہ رواج ہے کہ کوئی آپ کو اپنی گاڑی میں گھمائے، یہاں تک کہ جاپان میں مقیم ہندستانی اور پاکستانی بھی اسی رنگ میں رنگ چکے ہیں۔ لیکن یہ اصغر صاحب کی مہمان نوازی تھی کہ جب تک ہم جاپان میں رہے وہ ہمارے ساتھ صبح سے شام تک رہے اور انھیں کی بدولت بہت کم وقت میں زیادہ سے زیادہ جاپان شہر کی ترقیات اور تہذیب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ سائتاما کے جے یو ہال میں جب ہم پہنچے تو ناصر صاحب نے پرتپاک خیر مقدم کیا۔ ان سے مل کر یہ نہیں لگا کہ ہم پہلی دفعہ ان سے مل رہے ہیں یا ان کو دیکھ رہے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں پروگرام شروع ہوا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پورا ہال بھرا تھا۔ جن کو ہال میں کھڑے رہنے کی جگہ نہیں ملی وہ باہر ہی کھڑے رہے۔ بہت دور دور سے لوگ شرکت کے لیے یہاں آئے تھے۔ کچھ لوگ تو چار سو پانچ کیلومیٹر کی دوری بھی طے کر کے آئے تھے۔ یہاں موجود سب کے سب پاکستانی حضرات تھے جو مختلف بزنس سے جڑے ہوئے تھے۔ ان میں زیادہ تر وہ حضرات تھے جو گاڑیوں کے بزنس سے وابستہ تھے۔ انھیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ یہ لوگ آپس میں بہت متحد ہیں اور ان کو آپس میں جوڑنے کا کام اردو نیٹ جاپان بھی انجام دے رہا ہے۔ کئی معمر اور بزرگ شخصیات بھی اس پروگرام میں موجود تھیں۔ ان کے اندر بھائی چارگی اور جو دینی جذبہ دیکھا وہ قابل رشک تھا۔ ان تمام حضرات نے کھلے دل سے ہمارا استقبال کیا۔ ہر شخص نے یہ کوشش کہ معانقہ اور مصافحہ ضرور کریں۔ اس پروگرام میں پاکستان شوبز کی مشہور شخصیت جناب تنویر جمال صاحب اور پاکستان ایمبیسی کے ڈپٹی چیف آف مشن جناب امتیاز صاحب اور کئی اہم شخصیات نے شرکت کی۔ اس تقریب میں چار اہم شخصیات کو ایوارڈ سے نوازا گیا، جناب رفاقت شاہ کے ہاتھوں مجھے بھی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا اور اعزازی سند چیف ایڈیٹر اردو نیٹ جاپان نے دی۔ تقریب کے اختتام پر شاندار عشائیے کا

اہتمام کیا گیا تھا۔کراچی طرز کی بریانی کا احباب نے خوب لطف اٹھایا۔

دوسرے دن ہمیں جیو نیوز، اخبار جہان اور جنگ نیوز کے سینئر صحافی عرفان صدیقی نے سائتاما پرفیکچر کے شہر یاشیو کے مشہور کراچی ریسٹورنٹ میں ظہرانے پر مدعو کیا تھا جس میں پاکستان کے مشہور فلم ساز تنویر جمال کے علاوہ چیف ایڈیٹر اردو نیٹ جاپان، سینئر پاکستانی نژاد جاپانی اصغر حسین نشی ٹریڈنگ اور وہاں مقیم نامور ہستیوں نے شرکت کی۔ یہاں ہم دیر تک ہند و پاک کے رشتے ، ہند و پاک کی فلمیں اور صحافتی رویے پر بات چیت کرتے رہے۔اس کے بعد الکرم ریسٹورینٹ میں لذیز چائے پینے کے بعد رخصت ہوئے۔ رات کو جاپان میں مقیم انتہائی سینئر حضرات اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے نے ہمارے اعزاز میں ٹوکیو کے کراچی ریستوران میں عشائیہ کا اہتمام کیا تھا۔ٹوکیو کے معروف علاقے شنجو کو میں واقع یہ وہی مشہور کراچی ریستوران ہے۔ جہاں سینئر پاکستانی حضرات ہر جمعہ کے روز اپنی دینی ودرسی نشست کا اہتمام کرتے ہیں۔عشائیہ میں اسلامک سینٹر جاپان کے سابق ڈائریکٹر اور ٹوکیو کی چووؤ یونیورسٹی میں عربی کے لیکچرار حافظ سلیم الرحمٰن خان ندوی، بین الاقوامی شہرت یافتہ اور اسلامک اسکالر حسین خان، جاپان میں اردو کے معروف ادیب وشاعر محمد مشتاق قریشی، سینئر پاکستانی سائنسدان ڈاکٹر سید مطلوب علی، سینئر پاکستانی نژاد جاپانی شہری اور نشی ٹریڈنگ کے صدر اصغر حسین، ٹوکیو یونیورسٹی مطالعاتِ خارجی میں شعبۂ اردو کے پروفیسر عامر علی خان نے شرکت کی، اردو نیٹ جاپان کے چیف ایڈیٹر ناصر ناکاگاوا اور شاہد رحمان بھی موجود تھے۔

جاپان میں مقیم پاکستانی حضرات کے خلوص اور بھائی چارگی کو میں سلام پیش کرتا ہوں جنھوں نے ہر طرح سے ہماری دلجوئی کا خیال رکھا۔اکثر ہمیں شرمندگی کا احساس بھی ہوا کہ ہم چھوٹے لوگوں کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جارہا ہے اور اس قدر عزت افزائی کی جارہی ہے۔ جاپان میں مسلمانوں کی کئی تنظیمیں ہیں۔تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی تمام تنظیموں نے ہماری دعوت کرنی چاہی مگر ہمارے پاس وقت کم تھا۔اگر ان تمام دعوتوں کو منظور کرتا تو ہمیں وہاں ایک مہینے سے بھی زیادہ رہنا پڑتا۔اس لیے میں نے ناصر صاحب اور اصغر صاحب کے حوالے یہ کام چھوڑ دیا کہ وہ جہاں چاہیں ہمیں لے جائیں۔ہم ان تمام میز بانوں سے معذرت کا اظہار بھی کرتے ہیں

جن کی دعوت قبول نہیں کر سکے۔ 30 جون کو ہم منہاج القرآن انٹرنیشنل، کی دعوت پر ایبارا پری فیکچر کے باندوشہر پہنچے۔ جہاں زیر تعمیر مسجد میں نماز عشا ادا کی اور ناظم اعلیٰ محمد انعام الحق، صدر محمد سلیم خان، حضرت حسین، حنیف مغل کی ضیافت سے سرفراز ہوئے۔ جاپان سفر کی آخری شام کو پاکستان ایسوسی ایشن جاپان نے کھانا گاوا پری فیکچر کے مشہور شہر کاواسا کی میں ہندستانی ریسٹورنٹ میں عشائیہ کا اہتمام کیا۔ ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری الطاف غفار کے علاوہ کئی معزز ہستیوں سے ملنے کا موقع ملا۔ اس طرح ہمیں بالکل ایسا نہیں لگا کہ ہم ہندستان سے دور کسی اجنبی شہر میں ہیں۔ جاپانی کھانوں سے پہلے سے ڈرا ہوا تھا اس لیے ہم نے کچھ کھانے کی چیزیں بھی ساتھ رکھ لی تھیں جو اسی طرح واپس لے کر آیا۔

اس سفر میں جو سب سے اچھی چیز ہمیں لگی وہ یہ کہ اپنے ملک سے دور پاکستانی احباب جو بڑی تعداد میں جاپانی شہریت حاصل کر چکے ہیں وہ اسلام اور اسلامی تہذیب سے بڑی مضبوطی سے جڑے ہوئے ہیں۔ جاپان میں آج کی تاریخ میں ایک سو مسجدیں اور ساٹھ مصلے موجود ہیں۔ ان تمام مسجدوں میں نمازی بھی موجود ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کے حوالے سے ہی آپس میں اتنے متحد ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ 80 کی دہائی سے پہلے ایک دو مسجدیں تھیں۔ جاپان میں سب سے پہلے ترکوں نے 1936 میں ایک مسجد بنائی تھی۔ جو کچھ دنوں بعد عمارت کے کمزور ہونے کے سبب حکومت کی جانب سے بند کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد پھر پاکستانی حضرات نے کوشش کر کے کئی زمینیں حاصل کیں اور مسجدوں کی تعمیر کی۔ پرانی مسجد کی جگہ ٹوکیو شہر میں ٹوکیو جامع مسجد ترکی طرز تعمیر کی شاندار مسجد ہے۔ اس عمارت کی زیب وزینت کے سبب جاپانی لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں کیونکہ اس طرز کی عمارتیں جاپان میں کہیں موجود نہیں ہیں۔ جس وقت ہم اس کی زیارت کو گئے وہ ظہر کا وقت تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد دیکھا کہ تقریباً بیس پچیس خواتین کا گروپ مسجد میں داخل ہوا۔ یہ بڑی حیرت سے مسجد کے نقش ونگار کو دیکھ رہی تھیں اور اسلام کے بارے میں سوالات کر رہی تھیں۔ اصغر صاحب ہمارے ساتھ تھے جنھوں نے جاپانی زبان میں ان کو اسلام اور مسجد کے بارے میں بتایا اور وہ بڑے غور سے اس کو نہ صرف سنتی رہیں بلکہ کئی سوالات بھی کیے۔ بعد میں اصغر صاحب نے بتایا کہ اس طرح کے گروپ یہاں مسجد دیکھنے آتے رہتے ہیں، ان میں کئی لوگ

اسلامی سینٹر بھی جاتے ہیں اور بڑی تعداد میں لوگ مسلمان بھی ہورہے ہیں۔ ہم یہ گفتگو کرہی رہے تھے کہ اتنے میں ایک خاتون مسجد میں داخل ہوئیں۔ پہلے تو یہ خیال آیا کہ وہ کوئی پاکستانی یا ترکی خاتون ہوں گی۔ کیونکہ وہ حجاب میں تھیں۔ لیکن جب ان سے ہماری ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ جاپانی ہیں اور اسلام قبول کرنے کے مرحلے سے گزر رہی ہیں۔

جاپان میں اس وقت تقریباً پندرہ ہزار پاکستانی ہیں جن کو جاپان کی شہریت ملی ہوئی ہے۔ ان میں سے 90 فیصد یا اس سے بھی زیادہ لوگوں نے جاپانی خواتین سے شادیاں کی ہیں اور انھیں مشرف بہ اسلام کیا ہے۔ یہاں کے رواج کے مطابق شادی کے بعد شوہر خواتین کے Sir name کو اپنے نام کے ساتھ لگاتے ہیں جیسے ناصر ناکاگاوا۔ ان کے بچے جاپانی طرز زندگی کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذب کو بھی اپنا رہے ہیں۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے اسلامی سینٹر کا قیام بھی کیا ہے اور کئی مسجدوں میں بھی اسلامی تعلیم کا اہتمام کر رکھا ہے۔ دنیا کے مہنگے شہروں میں جاپان اور انگلینڈ کا نام آتا ہے۔ یہاں زمینیں جتنی مہنگی ہوتی ہیں اس سے زیادہ عمارت کی تعمیر پر خرچ آتا ہے۔ کیونکہ جاپان میں زلزلے سے بچنے کے لیے جس طرح کی عمارتیں بنائی جاتی ہیں وہ قابل دید ہیں۔ ظاہر ہے مسجد بھی انھیں اصولوں کو ذہن میں رکھ کر بنائی گئی ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ کئی صاحبان ایسے ہیں جنھوں نے تنہا اپنے پیسوں سے زمین بھی خریدی اور مسجد بھی بنائی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ حضرات بڑے متمول ہیں۔ اللہ ان کی روزی میں اور برکت عطا فرمائے۔

جاپانی لوگوں کی کئی ایسی خصوصیات ہیں جو دوسری قوموں میں نہیں ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ کچھ اچھی خصوصیات ان کے اندر بھی در آئی ہیں۔ جاپانی قوم صبر و تحمل کی حامل ہیں۔ ان کے اندر ایمانداری بھی ایسی پائی جاتی ہے جسے دیکھ کر اور سن کر ہمیں رشک آیا۔ اصغر صاحب نے ہمیں بتایا کہ ہم آپ کو جاپان کی ایک ایسی چیز دیکھانے لے جارہے ہیں جسے دیکھ کر آپ کو حیرت ہوگی۔ ہم ان کے ساتھ شہر کے بیرونی علاقوں میں گئے۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں ہر عمر کے لوگ کام کرتے ہیں۔ یہاں نوکر چاکر کا تصور نہیں ہے۔ سارا کام لوگ خود کرتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگوں کے پاس بھی ڈرائیور نہیں ہوتے۔ بڑی بڑی کمپنیوں میں بھی چپراسی نہیں ہوتے۔ اگر کمپنی کے مالک یا منیجر کو پہچاننا ہو تو بہت آسان ہے۔ جسے آپ دیکھیں کہ سب سے پہلے آفس میں آتا ہے۔ آفس

اور ٹوائلیٹ کی صفائی کرتا ہے۔ تمام میزیں اور کرسیاں صاف کرتا ہے سمجھ لو یہی مالک یا یہی منیجر ہوگا۔ یہ سن کر حیرت کی انتہا نہیں رہی لیکن یہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے علاوہ مساوات کا جو تصور ان کے یہاں ہے وہ شاید کم ہی ممالک میں ہو۔ ایک طرح کے مکانات اور ایک طرح کی طرز زندگی۔ آپ کے ساتھ چلتے ہوئے یا میٹرو میں سفر کرتے ہوئے لوگوں کے لباس سے آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ کون کس رتبے کا ہے۔ آپ کے برابر بیٹھا شخص کسی ریسٹورینٹ میں کام کرنے والا بھی ہوسکتا ہے یا کسی بڑی کمپنی کا مالک بھی ہوسکتا ہے۔ یہاں سڑک صاف کرنے والوں کے پاس بھی چمچاتی گاڑیاں ہیں اور بڑے لوگوں کے پاس بھی۔ یہاں کسی فری فیکچر کا گورنر بھی کسی جگہ آپ کے ساتھ آئس کریم کھانے کے لیے لائن میں کھڑا ہوسکتا ہے۔ یہ وہاں کی زندگی کے لیے کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے یہاں سب برابر ہیں۔ یہاں بڑے عہدے اور سیاسی لوگ کسی طمطراق میں نہیں رہتے وہ بھی عام شہری کی طرح کہیں بھی کسی جگہ کوئی کام کرتے ہوئے یا لائن میں کھڑے نظر آجائیں گے۔ یہ پہلو جاپان کی زندگی کا ایسا پہلو ہے جو اس کی ترقی کا ضامن ہے اور تمام شہریوں کو زندگی میں اطمینان وسکون عطا کرتا ہے۔ یہاں کوئی اور کسی طرح کا کام کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہاں ہمیں اس بات پر بہت تعجب ہوا جو اصغر صاحب نے ہمیں دیکھایا۔ شہر کے بیرونی علاقوں میں لوگ خود سے کھیتیاں کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو معمر ہیں اور ضعیف ہیں وہ اپنے کھیتوں سے پھل سبزیاں توڑ کر لاتے ہیں اور اس کی آس پاس کسی ٹھیلے پر سب کچھ رکھ کر چلے جاتے ہیں اور ساری چیزوں کے سامنے اس کی قیمت لکھ کر رکھ دیتے ہیں اور پاس ہی ایک باکس رکھا رہتا ہے۔ لوگ آتے ہیں اور اپنی ضرورت کی چیزیں لیتے ہیں اور اس کی قیمت اس باکس میں ڈال کر چلے جاتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ لوگ بغیر قیمت دیے کوئی سامان لے گئے ہوں یا کبھی ایسا ہوا ہو کہ ان کے پیسوں کا باکس کسی نے غائب کر دیا ہو۔ ہم لوگوں کو یہ دیکھ کر مکے اور مدینے کی زندگی کے واقعات یاد آ گئے جب لوگوں میں اس قدر ایمانداری ہوا کرتی تھی۔ میں دیر تک سوچتا رہ گیا کہ جو خصوصیت مسلمانوں میں ہونی چاہیے تھی وہ ان جاپانیوں میں موجود ہے۔

اسی طرح ایک اور بات ہمیں بتائی گئی کہ یہاں اگر کسی جگہ آپ کی کچھ بھی اور کتنی ہی

قیمتی چیز غلطی سے چھوٹ گئی تو آپ مطمئن رہیں وہ کبھی غائب نہیں ہوگی۔ یہاں کچھ فاصلے پر ایسی پولیس چوکیاں بنی ہوئی ہیں جہاں لوگ اس طرح کی کھوئی ہوئی چیزوں کو جمع کراتے ہیں۔فرض کریں اگر آپ کا پیسوں سے بھرا پرس بھی غلطی سے کہیں گر گیا تو جس شخص کو وہ پرس ملے گا وہ اسے اسی طرح پولیس کے پاس جمع کرا دیتا ہے۔ پولیس کے سامنے ہی اس پرس کو کھولا جاتا ہے اور اس میں موجود رقم کی تفصیلات لکھ لی جاتی ہے۔جس کی ایک کاپی پانے والے کے پاس رہتی ہے اور دوسری کاپی پولیس کے پاس۔اس کے بعد اس میں اگر فون نمبر موجود ہوا تو رابطہ کیا جاتا ہے اور اگر نہیں ہوا تو چھ مہینے تک انتظار کیا جاتا ہے۔کھونے والے شخص کو اگر ذرا بھی یاد آ جائے کہ یہ فلاں جگہ کھوئی ہوگی تو وہ اس طرح کی چوکیوں میں معلوم کرتا ہے اور اس طرح اسے اپنی کھوئی ہوئی چیز مل جاتی ہے۔ وہاں کا یہ قانون ہے کہ کھوئی ہوئی چیز حاصل کرنے والا اس میں موجود جو بھی رقم یا چیز ہوگی اس کا بیس فی صد پانے والے کو دے گا۔لیکن معلوم یہ ہوا کہ کوئی شخص معاوضہ لیتا نہیں ہے۔اور اگر کھونے والے کا پتہ نہیں چل سکا تو چھ مہینے کے بعد وہ چیز پانے والے کی ملکیت بن جاتی ہے۔ جاپانی تہذیب کی یہ خصوصیت ایسی ہے جو ان کی ایمانداری پر دلالت کرتی ہے۔اسی طرح وہ حکومت کو ٹیکس ادا کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور خود سے ملک کی چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہمارے دوستوں نے یہ بتایا کہ سونامی کے بعد جب جاپان میں بجلی کی قلت ہوئی تو حکومت نے لوڈ شیڈ ینگ کا اعلان کیا۔منصوبہ یہ تھا کہ تین مہینے میں اگر تین تین گھنٹے کی لوڈ شیڈ ینگ ہوگی تو ہم بجلی کی کھپت پر قابو پا سکتے ہیں۔حکومت کے اعلان کے بعد لوگوں نے اپنے اپنے گھروں میں اس طرح بجلی کی بچت کی کہ صرف بیس دنوں میں بجلی سرپلس ہوگئی اس کے بعد حکومت کو لوڈ شیڈ ینگ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں جن کو دیکھ کر رشک آیا۔

ٹوکیو شہر اپنی عمارت سازی اور شہر کی خوبصورتی کے لحاظ سے بھی دنیا کے خوبصورت شہروں میں سے ایک ہے بلکہ سرفہرست ہے۔ جاپان جزیرے پر واقع ہے۔لیکن سمندر کو جس طرح انھوں نے مسخر کیا ہے وہ مثالی ہے جا بجا سمندر میں ٹنل بنے ہوئے ہیں۔سمندر کی وجہ سے جو ڈھائی سو کیلو میٹر کی دوری تھی اسے صرف پچیس کیلو میٹر میں تبدیل کر دیا ہے۔سمندر میں دس کیلو میٹر تک سرنگ

اس کے بعد سمندر کے درمیان ایک کار پارکنگ اوراس تفریح گاہ بنائی ہے۔اسے اکوالائن کے نام سے جانا جاتا ہےاس کے بعد سمندر میں پندرہ کیلومیٹر تک پل بنایا گیا ہے۔آمدورفت کواتنا آسان بنایا ہے کہ یہی ان کی ترقی کا ذریعہ بن گیا۔ایک ایک سڑک پر کئی منزلہ پل اور کشادہ سڑکیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہم ان سے کتنے پیچھے ہیں۔ایمانداری اور دیانتداری سے کام کرنا اور کام کے وقت کوئی بہانہ نہ کرنا اور بلاوجہ چھٹی نہ لینا یہ وہاں کی تہذیب ہے۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جس کے سبب جاپان دنیا الگ اپنی شناخت رکھتا ہے۔ یہ سفر بہت مختصر رہا لیکن اس کے بعد بھی ناصر صاحب کی دعوت پر دوبارہ جاپان جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ سفر بھی اسی طرح کی خوشگوار یادوں میں بسا ہوا ہے۔ ناصر صاحب کی انسان دوستی اور ادب نوازی بے مثال ہے۔اللہ ان کو سلامت رکھے۔

جاپان کا دوسرا سفر

جاپان کا دوسرا سفر 2016 میں ہوا۔ یہ موقع تھا جناب ناصر ناکاگاوا کی دوسری کتاب ’’دنیا میرے آگے‘‘ کی تقریب رونمائی کا۔ ناصر صاحب کا یہ دوسرا سفر نامہ ہے اس سے پہلے ان کا سفرنامہ ’’دیس بنا پردیس‘‘ شائع ہو چکا تھا۔اس تقریب میں ہندستان سے میں بطور مہمان خصوصی شریک ہوا۔ کناڈا سے مشہور کالم نگار، شاعرہ، افسانہ نگار اور ٹی وی اینکر محترمہ روبینہ فیصل اور دوحہ قطر سے موسیقی کے حوالے سے مشہور نام جناب نزاکت علی خان شریک ہوئے۔ جاپان میں اردو زبان کے پروفیسر ہیروجی کھاتاؤ کا شریک ہوئے۔ پروفیسر ہیروجی کھاتاؤ کا اردو کے جاپانی پروفیسر ہیں جواب سبکدوش ہو چکے ہیں۔ یہ بہت سلیس اردو بولتے ہیں اور اردو شعرا کے کلام کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔انھیں پاکستانی حکومت کی جانب سے ان کی اردو خدمات کے پیش نظر ’تمغۂ امتیاز‘ سے نوازا جا چکا ہے۔ان سے میری کئی بار کی ملاقات رہی ہے۔ ماہ اگست کی 30 تاریخ کو یہ تقریب سائتاما پریفکیچر کے شہرکوشی گایا کے مشہور آکشن ہال ٹوکیوجے یو، جاپان میں منعقد ہوئی۔اس تقریب میں خصوصی طور پر وہ تمام افراد مدعو تھے جو جاپان میں مقیم ہیں اور اردو نیٹ جاپان سے جڑے ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ قرب وجوار کے علاقے سے بڑی تعداد میں ناصر صاحب کے دوستوں نے شرکت کی۔روبینہ فیصل نے اس موقعے سے ناصر ناکاگاوا پر ایک

تفصیلی مضمون پڑھا جس میں انھوں نے ناصر کی ادبی، علمی اور صحافتی خدمات کے علاوہ سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں پر بھرپور روشنی ڈالی۔ انھوں نے اس بات کو سراہا کہ اپنے ملک سے ہجرت کر کے دوسرے ملک کی شہریت حاصل کر لینے کے بعد بھی اپنی تہذیبی جڑوں سے منسلک رہنا بڑی بات ہوتی ہے۔ جاپان جیسے ترقی یافتہ ملک میں اپنی زبان اور تہذیب کی خدمت یقیناً قابل ستائش ہے۔ روبینہ کے علاوہ ڈاکٹر عبدالرحمان صدیقی اور کئی احباب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں میں نے ناصر صاحب کی خدمتوں کا اس لیے اعتراف نہیں کیا کہ وہ میرے دوست اور بھائی ہیں بلکہ سچائی یہ ہے کہ وہ اپنے معاش کے لیے کسی اور پیشے سے جڑے ہوئے ہیں لیکن گزشتہ دو دہائیوں سے جس طرح وہ ادب اور زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی اسی سرگرمی کے سبب دنیا بھر میں موجود احباب ان کو جانتے ہیں اور ان سے ادبی روابط ہیں۔ عالمی سطح پر کئی بڑے سیمیناروں میں شریک ہو چکے ہیں۔ اردو زبان و تہذیب سے ان کی محبت قابل ستائش ہے۔

اس پروگرام کے اختتام پر ہم نے کئی دن جاپان میں رکنے کا ارادہ کیا تا کہ کچھ مقامات کی تفریح ممکن ہو سکے۔ اس بار جناب طیب علی خان اور ناصر صاحب نے میری وجہ سے تین دنوں کی چھٹی لے رکھی تھی۔ ورنہ جاپان جیسے ملک میں تو لوگ عید کے دن بھی اپنے آفس جاتے ہیں۔ صرف اتوار ہی انھیں نصیب ہوتا ہے جب وہ اپنی ذاتی کام کر پاتے ہیں۔ میں ناصر صاحب اور ان کے دوست طیب علی خان صاحب کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے وقت نکالا۔

پروگرام کے دوسرے دن ہم نے ٹوکیو یونیورسٹی برائے خارجی مطالعات کے پروفیسر ہاگیتا ہیروشی، شعبۂ اردو سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ اس ملاقات کے لیے میں نے ایک ہفتہ قبل ہی پروفیسر ہاگیتا سے وقت طے کیا تھا۔ انھیں ناصر صاحب کی کتاب کی رونمائی میں بھی شریک ہونا تھا مگر وہ ممبئی سے لوٹ نہیں پائے تھے اس لیے انھوں نے معذرت کر لی تھی۔ ناصر صاحب نے میرے بارے میں بتایا تھا۔ ان سے میرا غائبانہ تعارف تھا۔ ان احباب کے ہمراہ جیسے ہی ہم یونیورسٹی میں گیٹ پر پہنچے انھیں فون پر اطلاع دی تو پروفیسر ہاگیتا نے گیٹ پر رکنے کی ہدایت کی اور وہ خود گیٹ تک تشریف لائے اور اپنے ساتھ ساتویں منزل پر اپنے چیمبر لے گئے۔ انھوں نے

پہلے سے پرتکلف چائے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ چائے نوشی کرتے ہوئے انھوں پروفیسر خواجہ اکرام کا ویب سائٹ کھولا جو انھوں نے اپنی پسندیدہ فہرست میں محفوظ کر رکھی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ دیارِ غیر میں اردو کا ایک جاپانی پروفیسر مجھے اتنے قریب سے جانتے ہیں۔ پروفیسر ہاگیتا کو میں نے اپنی کچھ کتابیں پیش کیں اور ناصر صاحب نے اپنی کتابیں۔ یہ تحفے انھیں بہت اچھے لگے اور کہا کہ ہمارے لیے کتابوں سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے درسی مقصد کے لیے جو کتابیں تیار کی تھیں وہ ہمیں عنایت کیں۔ دیر تک ان سے جاپان میں اردو تدریس پر بات ہوتی رہی۔ میں نے ان کو جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے معاہدے کی بات بتائی تو وہ خوش ہوئے اور جلد ہی انھوں نے ہماری یونیورسٹی سے معاہدہ کرلیا۔ اب ہر سال ان کی یونیورسٹی سے اردو کے طلبہ وطالبات یہاں آتے ہیں۔ دیر تک باتیں کرنے کے بعد وہ مجھے اپنے کلاس روم کی طرف لے گئے اور ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا اور وہاں چلنے کو کہا۔ دیکھا تو اس دیوار پر بہت ہی خوبصورت عربی خطاطی کی گئی تھی۔ ان سے تقریباً دو گھنٹے ملاقات کے بعد رخصت ہوئے۔

جاپانیوں کے انکشافات اور ترقی کے حوالے سے بہت کچھ جانتا تھا اور ناصر صاحب نے بہت کچھ بتایا اب موقع تھا ایک مصنوعی جھیل دیکھنے کا۔ یہ کوشی گایا لیک ٹاؤن کہلاتا ہے۔ کسی کو اگر نہ بتایا جائے تو ایسا لگے گا کہ واقعی یہ قدرتی جھیل ہے۔ مگر یہ بالکل مصنوعی جھیل تھا۔ ٹوکیو سے کچھ دوری پر یہ لیک ٹاؤن کافی وسیع علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے ارد گرد سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ طیب علی خان اور ناصر صاحب کی معیت میں یہ تفریح کافی سہانی رہی۔ اس سے پہلے جاپان کی مشہور ڈش (غذا) سوشی کے بارے میں ناصر صاحب نے بتایا کہ گذشتہ سفر میں آپ رواروی میں تھے اس لیے یہ غذا نہیں کھا سکے۔ آپ جاپان آئیں اور سوشی نہ کھائیں تو سفر ادھورا رہتا ہے۔ وہ ہمیں کوشی گایا کے مشہور سوشی ریسٹورینٹ میں لے گئے۔ یہ ریسٹورینٹ خودکار تھا۔ آپ ٹیبل پر بیٹھ جائیں اسی پر ایک ٹیب لگا ہے۔ اپنی پسند کی مچھلی کا آڈر دیں وہ خود بخود کچھ دیر میں کمپیوٹرائز سسٹم کے ذریعے آپ کے ٹیبل پر موجود ہوگی۔ یہ نظام دیکھ کر حیرت ہوئی۔ تمام چیزیں جاپانی زبان میں تھیں اس لیے جاپانی نہ جاننے والے شاید آڈر دینے سے قاصر رہیں کیونکہ وہاں کوئی ویٹر نہیں تھا۔ ناصر صاحب نے طرح طرح کی مچھلیوں کا آڈر دیا اور ہم نے پہلی دفعہ شوق سے سوشی

کھائی۔سوشی دراصل کئی طرح کی مچھلیاں ہیں۔زیادہ تر کچی ہوتی ہیں اورنیم پختہ،اسے چاول یا کسی سبز پتے پر پیش کیا جاتا ہے۔سوشی کے بارے میں ہم نے سن رکھا تھا اور تکلف بھی تھا کہ کچی مچھلیاں کیسے کھائی جائیں گی۔مگر جیسا سنا تھا ویسا بالکل نہیں تھا۔بہت ہی لذیز سوشی ڈش تھا۔

دوسرے دن جاپان انٹرنیشنل جرنلسٹ ایسوسی ایشن اور پاکستان ایسوسی ایشن جاپان کی جانب مجھے استقبالیہ دیا گیا۔عشائیہ کے اہتمام میں انھوں نے مخصوص احباب کو دعوت تھی ایک گھنٹے تک اردو کی ادبی کی تاریخ،جاپان اوراردو،ہندستان اور پاکستان کے تہذیبی روابط پر بات چیت ہوتی رہی۔سوال وجواب کا سیشن بھی بہت دیر تک چلا اس کے بعد کوشی گایا کے مشہور پاکستانی ریسٹورینٹ نیو ہاٹ مصالحہ میں پر تکلف عشائیہ ہوا۔اسی موقعے سے جاپان انٹرنیشنل جرنلسٹ ایسوسی ایشن کی جانب سے مجھے ایک یادگاری شیلڈ بھی دی گئی۔ایک دن سلیم احمد شاچو نے دعوت دی۔ناصر صاحب کے ہمراہ ہم جاپانی طرز کے روایتی ریسٹورینٹ میں گئے۔یہاں پہنچ کر عجب منظر دیکھا۔اس ریسٹورینٹ میں آنے والوں کا دروازے پر ڈھول اور میوزک بجا کر استقبال کیا جاتا ہے۔اندر جا کر دیکھا تو لگا کسی قدیم زمانے کی عمارت میں داخل ہو گئے ہیں۔میز کرسیاں بھی اسی طرح کی تھیں اوراندر کی زیب وآرائش بھی قدیم جاپانی طرز کا تھا۔یہاں کھانا کھانے سے زیادہ اس ریسٹورینٹ میں آکر اچھا لگا۔اسی دن ہمارے پاس کچھ وقت تھا تو ہم بازار کی طرف گئے۔خریدا تو کچھ نہیں کیونکہ یہ شہر بہت مہنگا ہے اور ہندستان کے مقابلے میں تو کئی گنا زیادہ،اس لیے صرف ہم نے بازار کی رونق دیکھی اور دیر تک تفریح کرتے رہے۔اس کے بعد ناصر صاحب ہمیں اپنے گھر لے گئے۔اپنا دفتر دیکھایا جہاں سے وہ اردو نیٹ جاپان کی سرگرمی کرتے رہتے ہیں۔گھر کی نچلی منزل میں آئے تو انھوں نے بھابھی اور بچوں سے ملاقات کرائی۔انھوں نے شام کی مناسبت سے پکوڑے اور سینڈوچ بنا رکھی تھی۔ایک جاپانی خاتون کے ہاتھوں پکوڑے کی لذت جاپانی سے زیادہ پاکستانی لگی۔وہ بہت ملنسار خاتون ہیں۔جب سے ناصر صاحب کو جانتا ہوں وہ بھی مجھے نام سے جانتی ہیں۔اگلے دن علی الصباح ہمیں ائیر پورٹ جانا تھا ناصر صاحب نے بھری آنکھوں سے رخصت کیا۔میں جناب ناصر صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے سفر کے تمام اسباب مہیا کرائے۔اللہ ان کو شاد وآباد رکھے۔(آمین)

○○○

امریکہ نامہ

امریکہ کا نام سنتے ہی بیک وقت کئی سوالات اور کئی باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ یہ معاملہ صرف امریکہ کے ساتھ ہی ہے کیونکہ امریکہ آج کی دنیا کا سب سے طاقتور ملک ہے۔شاید اسی طاقت کے سبب کمزور مما لک اس سے پریشان ہیں یا اگر پریشان نہیں ہیں تو اس سے خوفزدہ ضرور ہیں۔اسی سبب امریکہ آج کی دنیا کا واحد ایسا ملک ہے جس کے لیے سب سے زیادہ نفرت پائی جاتی ہے۔ایک نہیں کئی سروے سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے۔دوسری بڑی حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی ایسا اخبار نہیں جس میں کسی نہ کسی طور پر امریکہ کے حوالے سے کوئی خبر نہ ہو۔ یہ اور اس طرح کی کئی ایسی باتیں ہیں جس کی وجہ سے امریکہ ہمیشہ چرچے میں رہتا ہے۔موجودہ حالات کے پیش نظر اور مختلف رپورٹس کے حوالے سے بھی امریکہ اس لیے زیر بحث رہتا ہے کہ امریکہ کو ہی دہشت گردی سے آج سب سے زیادہ خطرہ ہے۔اسی لیے امریکہ اس کی مدافعت کے لیے ایسی اور اتنی احتیاطی تدابیر کرتا ہے کہ لوگوں کو اس سے اکثر پریشانی اور بدگمانی ہوتی ہے۔خاص طور پر امریکہ جانے والے شوق میں امریکہ کا سفر ضرور کرتے ہیں لیکن ہر سفر کرنے والے کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ نجانے وہاں پہنچنے پر کس طرح کی تلاشی لی جائے گی اور کیا سلوک کیا جائے گا؟ کیونکہ اس طرح کی خبریں اکثر آتی رہتی ہیں کہ ہندستان کے کئی وزیروں اور مشہور فلمی ہستیوں کو بھی سخت تلاشی سے گزرنا پڑا ہے۔امریکہ میں لی جانے والی تلاشی کے حوالے سے بھی طرح طرح کی خبریں دنیا میں سرگرم رہتی ہیں اور خاص طور پر مسلمانوں کے حوالے سے تو یہ خبر زیادہ ہی سرگرم رہتی ہے کہ

مسلمانوں کے ساتھ کچھ زیادہ ہی سختی کی جاتی ہے۔

انھیں تمام واہموں اور اندیشوں کے ساتھ ہم نے بھی امریکہ جانے کا ارداہ کیا۔ 14 اپریل 2011 کی رات ہم اور ڈاکٹر رضوان الرحمان اور ڈاکٹر اشتیاق احمد جے این یو سے ڈیویس اینڈ ایلکنس کالج، ویسٹ ورجینیا کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ایک سمینار میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے۔ دل میں طرح طرح کے خیالات تھے اور ایک طرح کا خوف بھی تھا کہ نجانے کیا ہو؟ کئی احباب نے یہ بھی کہا تھا کہ امریکہ کا ویزا مل جانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ امریکہ میں داخل بھی ہو جائیں گے۔ اصل مرحلہ تو اس وقت شروع ہوتا ہے جب آپ ائیر پورٹ پر اترتے ہیں۔ خیر ہم اپنے طور پر مطمئن تھے۔ ڈاکٹر رضوان میرے اچھے دوست ہیں ہر طرح کی باتیں اُن سے شئیر کرتا ہوں لیکن میں نے اپنے دل کے اندیشے کو ان سے کبھی ظاہر نہیں کیا۔ لیکن امریکہ جانے کا میرا جو تجربہ ہے وہ ان اندیشوں سے بالکل الگ ہے۔ البتہ جس بات نے سب سے زیادہ بدحظ کیا وہ خود دہلی ائیر پورٹ پر ائیر انڈیا کے اسٹاف کا برتاؤ تھا۔ ہم وقت سے تین گھنٹہ پہلے ہی ائیر پورٹ پہنچ گئے لیکن حیرت بھی ہوئی اور ہمیں غصہ بھی آرہا تھا کہ چیک اِن کے لیے بیک وقت کئی کاؤنٹر کھلے ہوئے تھے لیکن وہاں جس طرح کے ناتجربہ کار اسٹاف موجود تھے وہ ائیر انڈیا کے لیے باعث شرم ہے۔ بلا مبالغہ ہم لوگ صرف ایک فیملی کے بعد تھے لیکن ہمارے اور ان کے چیک اِن میں کئی گھنٹہ لگ گیا۔ ہم نے بار بار ان کے سینئر سے شکایتیں بھی کیں لیکن لاحاصل۔ خیر یہ مرحلہ طے ہوا اس کے بعد امیگریشن کے لیے لائن میں لگے۔ یہاں ہم سے اتنی تفتیش ہوئی کہ کہاں جارہے ہیں؟ کیوں جارہے ہیں؟ کہاں رکیں گے؟ کب واپس آئیں گے؟ اس کے بعد ہمارا دعوت نامہ دیکھا گیا۔ یونیورسٹی کا آڈر دیکھا گیا اس کے بعد خاتون امیگریشن آفیسر نے بادل نخواستہ ہمارے پاسپورٹ پر مہر لگائی۔ ان کاروائیوں میں اتنی دیر ہوئی کہ جہاز کی روانگی سے صرف پانچ منٹ پہلے ہم جہاز میں داخل ہو سکے۔ لیکن ہماری طرح اور بھی کئی مسافر تھے۔ اس لیے پورے ایک گھنٹے تاخیر کے بعد تمام مسافر جہاز میں پہنچے تب جہاز روانہ ہوا۔ دہلی میں ائیر انڈیا اور امیگریشن آفیسر کے اس سلوک اور برتاؤ سے ہم بہت بدحظ اور پریشان ہوئے۔ اب رات کا ایک بج چکا تھا۔ ہم نے کئی روز پہلے ہی فرنٹ رَو کی سیٹیں ریزرو کرالی تھیں اس لیے ہم لوگ بہت

آرام سے بیٹھ گئے اور اب ذہن پہ یہ بار تھا کہ پندرہ گھنٹے کا سفر کیسے کٹے گا۔ لیکن ہم تین احباب تھے اس لیے باتوں باتوں میں سفر خوشگوار ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ہماری زندگی میں پہلی ایسی رات تھی جو بیس گھنٹے کی تھی۔ تقریباً بارہ ہزار کیلو میٹر کی دوری اور پانچ ٹائم زون سے گزرنا تھا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ہم لوگوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔ ہندستان میں اس وقت شام کے پانچ بج رہے ہوں گے اور امریکہ میں اس وقت صبح کے ساڑھے سات بجے تھے۔ پرواز میں یہ اعلان ہوا کہ ہم اب جلد ہی نیو یارک کے جان کنیڈی ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں۔ ہمارا اشتیاق بڑھا سوچا نیو یارک کا طائرانہ منظر دیکھ لیں لیکن اس قدر بادل اور کہرا تھا کہ اوپر سے کچھ نظر نہیں آیا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد ہمارا جہاز کینڈی ایئر پورٹ پر لینڈ کر گیا۔ کچھ ہی دیر میں ہم امیگریشن کاؤنٹر پر کھڑے تھے۔ یہاں پہنچ کر دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں کہ اب نجانے یہاں کیا سلوک ہو؟ دل ہی دل میں ڈھیر ساری دعائیں پڑھیں۔ لیکن جو ہم نے سنا تھا سب غلط ثابت ہوا۔ امیگریشن کاؤنٹر پر کوئی سوال نہیں پوچھا گیا اور نہ تلاشی کے لیے کسی مشین سے گزرنا پڑا۔ اس طرح ہم جلد ہی وہاں سے باہر نکلے چونکہ دو گھنٹے کے بعد واشنگٹن کے لیے فلائٹ لینی تھی اس لیے باہر نکلتے ہی خود کار (بغیر ڈرائیور) میٹرو پر سوار ہوئے اور ٹرمینل سیون پر پہنچے۔ ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد یونائیٹڈ کی فلائٹ پر سوار ہوئے۔ جہاز دیکھ کر حیرت ہوئی کیونکہ یہ چھوٹا جہاز تھا جس میں صرف 34 سیٹیں تھیں وہ بھی آدھی سے زیادہ خالی۔ خراب موسم کے سبب ہچکولے کھاتے تقریباً ایک گھنٹے میں ہم لوگ واشنگٹن ڈیلس ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ یہاں ڈاکٹر لاکھن گوسائیں کی اہلیہ شیلی ہمارے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ ڈاکٹر لاکھن گوسائیں جو جان ہاپکینس یونیورسٹی میں ساؤتھ ایشین لینگوئج پروگرام میں ہندی اردو کے استاذ اور اس شعبے کے کوآرڈینیٹر بھی ہیں۔ انتہائی مخلص دوست، جے این یو میں طالب علمی کے زمانے میں ہم ساتھ ساتھ تھے۔ بہت دنوں کے بعد ان سے ملنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔ ہم بہت خوش تھے لیکن ہم سے زیادہ وہ لوگ خوش تھے۔ دہلی سے روانگی سے قبل ہی ان کے کئی فون آ چکے تھے۔ انھوں نے بار بار ہمیں امریکہ کے سفر کے حوالے سے اہم ہدایتیں دیں۔ ان کی اہلیہ شیلی نے بھی کئی بار فون پر بات کی اور ہمارے منع کرنے کے بعد بھی وہ ایئر پورٹ آئیں۔ ان کے اس اخلاص کو دیکھ کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی کیونکہ امریکہ میں کہاں کسی کے پاس

اتنا وقت ہوتا اور اگر کسی کے پاس وقت بھی ہوتا ہے تو وہ امریکی مزاج میں ڈھل چکا ہوتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر لاکھن اور ان کی اہلیہ تو بالکل نہیں بدلے تھے۔ وہی مشرقی مزاج اور انداز، مہمانوں کے استقبال کا وہی والہانہ انداز۔ یہ سب دیکھ کر ہمیں مشرقی تہذیب کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ دہلی سے نکلے ہوئے اب تک تیس گھنٹے سے بھی زائد ہو چکے تھے۔ شیلی نے جلدی سے ہمارے لیے کھانا تیار کیا اتنے میں ڈاکٹر لاکھن یونیورسٹی سے گھر آ گئے۔ ہم کچھ زیادہ ہی بھوکے تھے اس لیے کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم گیسٹ روم میں آ گئے۔ ہم تھکے ہوئے تھے اس لیے سوچا جلد ہی سو جائیں گے مگر ڈاکٹر لاکھن سنگھ نے جو دلچسپ گفتگو شروع کی تو محفل زعفران زار ہو گئی۔ یونہی خوش گپیوں میں دوپہر سے شام ہو گئی۔ واشنگٹن میں یہ ہماری پہلی رات تھی سوچا کچھ چہل قدمی ہو جائے۔ یہ طے کیا گیا کہ ہم رات میں وائٹ ہاؤس دیکھیں گے کیونکہ ہم لوگوں کا قیام اسی 16 اسٹریٹ پر تھا جس پر وائٹ ہاؤس واقع ہے جو قیام گاہ سے محض دو کیلومیٹر کی دوری پر تھا۔ لہذا ہم باہر آئے لیکن اتنی سرد ہوائیں چل رہی تھیں کہ ہمت نہیں ہوئی اور واپس گیسٹ ہاؤس آ گئے۔ ہمیں بالکل بھوک نہیں لگی تھی لیکن شیلی اور ڈاکٹر لاکھن کے اصرار نے مجبور کر دیا۔ ڈاکٹر رضوان اور ڈاکٹر اشتیاق تو نیند کے غلبے میں تھے لیکن میں ڈاکٹر لاکھن کی دلچسپ گفتگو میں محو تھا۔ ان کی گفتگو سے امریکہ کے حالات، امریکہ میں اردو- ہندی تعلیم کے اداروں اور اساتذہ کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی۔ تقریباً دس سال سے لاکھن امریکہ میں ہیں اس لیے امریکی تہذیب وتمدن پر ان کی گہری نظر ہے۔ ساتھ ہی ساؤتھ ایشیائی ممالک کے احوال پر بھی بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان سے گفتگو کے بعد میری کئی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں تقریباً تمام ممالک کی زبانیں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں خاص طور پر ان ممالک کی زبان وتہذیب پر گہری نظر ہے جو ممالک آج سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے اہم ہیں۔ میں نے ائیر پورٹ پر ہونے والے سلوک اور تلاشی کے حوالے سے جاننا چاہا تو انھوں نے یہ بتایا کہ یہاں کی ایجنسیاں بہت باخبر ہوتی ہیں اس لیے ہر آنے والے کی انھیں پوری خبر رہتی ہے۔ باوجود اس کے جن پر ذرا بھی شبہ ہوتا ہے انھیں مزید تفتیش کے لیے روک لیتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کی یہ پالیسی ہوتی ہے کہ ہر دو تین آدمیوں کے بعد کسی ایک کو وہ ضرور روک لیتے ہیں۔ اس کا ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہاں

آنے والے نفسیاتی دباؤ میں رہیں۔ان کی یہ بات ہمیں اس لیے بھی درست لگی کہ ہم لوگوں نے خود دیکھا کہ ہم سے آگے لائن میں کھڑے دو تین لوگوں کو کسی الگ روم میں لے جایا گیا اور تفتیش کی گئی۔اس کے علاوہ جن پر انھیں کوئی شک ہوتا ہے یا کسی کے حوالے سے کوئی خبر رہتی ہے تو ملتے جلتے نام والے لوگ بھی تفتیش کے عتاب کا شکار ہوتے ہیں۔امریکہ سے واپسی پر نیویارک ائیر پورٹ پر تلاشی کا ایک عبرتناک منظر دیکھنے کو ملا۔ایک نوجوان کی سرعام جس طرح تلاشی لی جارہی تھی وہ بے عزتی سے کم نہیں تھی۔بار بار طرح طرح سے تلاشی لی گئی۔حالانکہ اس کے پاس سے کچھ برآمد نہیں ہوا۔بعد میں معلوم ہوا کہ کسی اطلاع کی بنیاد پر اس کی یہ درگت ہوئی۔حالانکہ ویزا دیتے وقت بھی امریکی ایمبیسیاں ہر طرح کا احتیاط برتتی ہیں اکثر لوگوں کو مہینوں کے بعد ویزا ملتا ہے لیکن اللہ کا شکر ہے میرے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہوا۔ مجھے دوسرے دن ہی دس سال کا ویزا مل گیا تھا۔میری اور ڈاکٹر لاکھن کی گفتگو طویل ہوتی جارہی تھی ۔میرے دوست ڈاکٹر رضوان اور ڈاکٹر اشتیاق صوفے پر ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ہمیں اس کا خیال بھی نہیں رہا اور ہم محو گفتگو تھے۔ ہند و پاک اور کئی اہم ممالک کے سفید پوشوں کی بات ہورہی تھی۔یہ مذہبی اور سیاسی سفید پوشوں کی کہانی تھی کہ کس طرح وہ اپنے اپنے ملکوں کا سودا یہاں آکر کرتے ہیں اور اپنے ملک میں واپس جا کر سب سے بڑے محبّ وطن کہلاتے ہیں۔یہ میری حیرت ہی تھی کہ میری آنکھوں سے نیند غائب ہوگئی کیونکہ وہ بڑے صحافی اور سیاسی لیڈران جو اپنے اصولوں کے لیے مشہور ہیں وہ کس طرح چند ڈالر کے عوض سب کچھ بیچ ڈالتے ہیں۔اس گفتگو سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ واقعی زمانہ بدل گیا ہے۔معیار اور اصول اور ملک وقوم کے تئیں وفاداری اب دیکھاوا ہے کیونکہ یہ وفاداری کا ٹھیکہ چلانے والے یہاں آکر اسی کا سوادا کرتے ہیں۔ہماری باتیں ختم نہ ہوتیں اگر ہم اپنے احباب کی جانب نہ دیکھتے۔وہ تکلف میں کبھی آنکھ کھولتے اور بند کر لیتے۔لہٰذا ہم نے آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔

دوسرے دن شیلی کے ہمراہ ہم لوگ واشنگٹن ڈی سی کی سیر پر نکلے کیونکہ ڈاکٹر لاکھن کو کلاس کے لیے یونیورسٹی جانا تھا اس لیے وہ دوپہر بعد ہم سے کسی خاص مقام پر ملنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔دنیا بھر میں امریکہ کا وائٹ ہاؤس اپنے رعب و دبدبے کی وجہ سے مشہور ہے۔اس لیے ہم

نے سب سے پہلے وائٹ ہاؤس ہی دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ جب ہم وائٹ ہاؤس کے قریب پہنچے تو اتفاق سے صدر امریکہ کا قافلہ گزر رہا تھا۔ قافلے کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ یہ براک اوبامہ ہیں۔ہ جب ہندستان گئے تھے تو ہر طرف ان کی سکیورٹی کا ہی چرچہ تھا اور سکیورٹی کے نام پر کئی ہوٹل، کئی شاہراہ اور کئی مارکیٹ بند کرادئے گئے۔لیکن یہاں تو سکیورٹی کا وہ تام جھام نہیں تھا، چند پولیس کی گاڑیاں آگے پیچھے تھیں اور لوگ معولی بریکیڈ کے پاس کھڑے تھے۔ہم بھی وہیں یہ نظارہ دیکھ رہے تھے اور قافلہ گزرتے ہی بریکیڈ ہٹادئے گئے۔ ہم وائٹ ہاؤس کے بالکل نزدیک کھڑے اس ہاؤس کو دیکھ رہے تھے جس کا نقشہ ہمارے ذہنوں میں کچھ اور تھا۔ ہم نے سوچا تھا وائٹ ہاؤس کافی بڑا ہوگا۔لیکن ہمیں مایوسی ہوئی کہ ساری دنیا پر حکمرانی کرنے والے کا قلعہ اتنا چھوٹا کہ ہمارے راشٹر پتی بھون کا ایک کونہ لگ رہا تھا لیکن میڈیا میں جس طرح اس کو دیکھایا جاتا رہا ہے اس سے ہمارے ذہن میں یہ تصور تھا کہ کافی بڑا ہوگا۔لیکن اسے دیکھ کر یہ بھی اندازہ ہوا کہ میڈیا کسی چیز کو کس طرح چھوٹا یا بڑا کر کے دکھا سکتا ہے۔

واشنگٹن ڈی سی امریکہ کا دارالحکومت ہے۔ اس کے نام کے آگے ڈی سی کا مطلب ''ڈسٹرکٹ آف کولمبیا'' ہے جو وفاقی ضلع ہے۔واشنگٹن ڈی سی میں وائٹ ہاؤس، پینٹا گن، ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور آرگنائزیشن آف امریکن اسٹیٹس کے علاوہ مختلف ملکی و بین الاقوامی اداروں کے صدر دفاتر واشنگٹن میں ہیں۔اسی سبب یہ شہر بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے۔اس کے علاوہ نیچرل سائنس میوزیم، آرٹ گیلری، نیشنل میوزیم آف امریکن انڈین، نیشنل ایئر اینڈ اسپیس میوزیم قابل دید ہیں۔ان کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ان کے پاس تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے کوئی قابل دید پرانی عمارتیں تو نہیں ہیں لیکن جدید انکشافات اور جدید تکنالوجی کو جس سلیقے سے انھوں نے میوزیم میں تبدیل کررکھا ہے کہ وہ سیاحوں کے لیے باعث کشش ہے۔ان کو دیکھ کر اپنے ملک کی سیرگاہوں کا خیال آیا کہ ہمارے پاس اتنا کچھ ہے مگر سیاحوں کو مائل کرنے کا سلیقہ ابھی تک ہمیں نہیں آیا۔خیر ہم نے نیشنل پارک میں واقع ان تمام مقامات کی جلدی جلدی سیر کی۔اس کے علاوہ اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا کیونکہ اگر ہم لوگ صرف نیچرل سائنس میوزیم ہی قاعدے سے دیکھتے تو اس کے لیے کم از کم پورا دن چاہیے تھا۔لیکن ہمیں تو ایک ہی دن میں سب دیکھنا تھا۔تقریباً تین بجے ڈاکٹر لاکھن

گوسائیں کا فون آ گیا۔اس درمیان طفیل احمد صاحب کا کئی بار فون آ چکا تھا، وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر لاکھن کے ساتھ ہم لوگ ساؤتھ ایشیا اسٹڈیز پروجیکٹ کے ڈائریکٹر طفیل احمد صاحب سے ملنے ان کی آفیس پہنچے۔ان کے ساتھ ایک پنجابی ریسٹورینٹ میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ یہ جے این یو میں ہمارے ساتھ تھے اس کے بعد وہ بی بی سی سے منسلک ہو گئے اور اب وہ واشنگٹن میں قیام پذیر ہیں۔ میڈل ایسٹ میڈیا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے متعلق انھوں نے تفصیلات بتائیں۔ یہ انسٹی ٹیوٹ بنیادی طور پر میڈل ایسٹ کے پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کی مانیٹرنگ کرتا ہے۔خاص طور پر ان موضوعات کا باریکی سے جائزہ لیتے ہیں جن کا تعلق دہشت گردی سے ہوتا ہے۔ان تفصیلات کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ کیوں اور کس طرح امریکہ دنیا کے حالات سے باخبر رہتا ہے اور اس کے لیے وہ کتنی خطیر رقم خرچ کرتا ہے۔امریکہ دنیا سے باخبر رہنے کے لیے ہر طرح کی ترکیبیں اختیار کرتا ہے۔اس کے سپر پاور ہونے میں یہ عنصر بھی بڑا ممد و معاون ہے۔

اس کے بعد ہم لوگ جان ہاپکنس یونیورسٹی گئے اور دیر تک اردو ہندی تعلیم کے نصاب اور طریقۂ تعلیم پر بات چیت کرتے رہے۔کچھ طلبہ و طالبات سے بھی ملاقات ہوئی ان سے بھی تبادلہ خیال کیا۔ان سے مل کر ان کی تعلیم کی سنجیدگی اور عزائم کو سن کر حیرت و استعجاب بھی ہوا کہ یہ لوگ کس دور اندیشی کے ساتھ اپنے کیرئیر کا فیصلہ کرتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے کتنی جانفشانی کرتے ہیں۔یہی وہ خاص باتیں ہیں جس کے سبب امریکہ دنیا میں اپنی برتری ثابت کرنے میں کامیاب ہے۔

شام ہوتے ہی ہم لوگ ڈاکٹر لاکھن صاحب کی ہمرہی میں گیسٹ ہاؤس آ گئے اور صبح کو کلارکس برگ جانے کے لیے واشنگٹن ایئرپورٹ پہنچے۔ایلکنس، ویسٹ ورجینیا، جہاں کانفرنس ہوئی یہ علاقہ واشنگٹن سے کافی دور ہے۔تقریباً دس گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔امریکہ میں دوری کا پیمانہ یہ ہے کہ کتنے گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔وہاں کی سڑکیں کشادہ اور ٹریفک کی الجھنوں سے دور ہیں۔ گاڑیاں 70 میل کی رفتار سے چلتی ہیں۔لیکن ہمارے لیے حیرت یہ تھی کہ وہاں کے لیے سوائے ہوائی جہاز کے کوئی پبلک ٹرانسپورٹ نہیں تھا۔لہٰذا ہم نے بھی ہوائی جہاز سے ویسٹ ورجینا جانے کے لیے کلارکس برگ تک کا سفر کیا۔اس بار واشنگٹن ائیرپورٹ پر سیکورٹی سے گزرتے ہوئے اس

مشین سے بھی گزرنا پڑا جس کے بارے میں دنیا کے تمام اخبارات میں ہنگامہ بپا ہوا تھا۔لیکن ہم نے غور سے دیکھا کہ کیا اس مشین سے صرف غیر ملکی گزر رہے ہیں یا امریکی شہری بھی۔لیکن بلا امتیاز یہاں سے سبھی کو گزرنا تھا۔جوتے بھی کھولنے پڑے۔اس مرحلے سے گزر کر ہم ایئر کرافٹ پر سوار ہوئے۔اس روٹ پر چلنے والے زیادہ تر ہوائی جہاز چھوٹے ہوتے ہیں۔جس میں زیادہ سے زیادہ 34 لوگوں کے لیے سیٹیں ہوتی ہیں۔اس طرح کے جہاز پر سوار ہو کر ہم نئے تجربات سے گزرے۔ائیر کرافٹ میں صرف گیارہ لوگ تھے۔کلارکس برگ سے پہلے مارگن ٹاؤن میں ایک اسٹاپج تھا، یہاں تین لوگ اترے اور ایک خاتون سوار ہوئیں۔ہمیں اس کا اندازہ نہیں تھا کہ مارگن ٹاؤن سے کلارکس برگ کی دوری کتنی ہے؟ جہاز کے پرواز بھرتے ہی پہاڑی سلسلے شروع ہوئے۔خراب موسم کے سبب جہاز کچھ زیادہ ہی ہچکولے کھار ہا تھا اور ہماری روح فنا ہو رہی تھی کبھی ہم ڈاکٹر رضوان کی جانب دیکھ رہے تھے تو کبھی وہ ہماری جانب اور ہم نے بڑے زوروں سے اپنی اپنی سیٹیں پکڑ رکھی تھیں۔میں نے حیرت سے ڈاکٹر رضوان سے پوچھا بھائی یہ جہاز اونچائی پر کیوں نہیں جار ہا ہے۔رضوان صاحب نے خوف کے لہجے میں کہا کہ کہیں کریش تو نہیں کرے گا؟ ہم بے حد ڈرے ہوئے تھے کیونکہ جہاز کو پرواز بھرے دس منٹ ہو چکے تھے اور یہ اونچائی کی جانب بڑھنے کے بجائے ہچکولے کھاتے پہاڑیوں سے گزر رہا تھا۔اسی اثنا میں اچانک نیچے کو ڈرتے ہوئے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کلارکس برگ آ گیا۔صرف دس منٹ کی فلائٹ یعنی دہلی سے نوئیڈا کی دوری تھی۔اسی لیے مارگن ٹاؤن کے بعد یہ اونچائی پر نہیں گیا۔خیر اللہ کا شکر تھا کہ ہم کلارکس برگ پہنچ گئے۔یہ ایک چھوٹا ائیر پورٹ تھا۔وہاں سے ایلکنس تک جانے کے لیے کوئی پبلک سواری نہیں تھی۔ہمارے لیے ایک گاڑی بھیجی گئی تھی جس سے ہم ڈیوس اینڈ ایلکنس کالج پہنچے۔وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اگر ہمارے لیے گاڑی نہیں بھیجی گئی ہوتی تو ہمارا پہنچنا ناممکن تھا۔معلوم یہ ہوا کہ دوسرے شہروں سے آنے والے لوگ ائیر پورٹ پر اتر کر کرائے کی کار لے کر جاتے ہیں۔یہاں ہر جگہ آسانی سے پچاس ڈالر یومیہ کے حساب سے کار مل جاتی ہے۔لیکن ہمارے لیے مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس انٹرنیشنل لائسنس بھی نہیں تھا اور نہ رائٹ ہینڈ ڈرائیونگ کا تجربہ اور نہ ہی اس پہاڑی سلسلے کے راستے سے واقفیت تھی۔اس انداز کو دیکھ کر سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہاں کے تمام

لوگوں کے پاس خود کی گاڑیاں ہوتی ہیں اسی لیے کسی پبلک ٹرانسپورٹ کی ضرورت نہیں۔لیکن مشینی دور کا یہ انداز بھی بڑا اٹ پٹا لگا کہ ہم جیسے لوگ اگر یوں ہی بے یارو مددگار پہنچ جائیں تو کیا ہو؟

ایلکنس شہر اپنی قدرتی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ روایتی اقدار کے لیے جانا جاتا ہے۔لوگ بڑے نرم مزاج اور تحمل کے حامل ہیں۔اس شہر کی آبادی تقریباً آٹھ ہزار ہے۔تین دن کے قیام میں آس پاس جانے کا اتفاق ہوا مگر ایک حیرت مجھے اور ڈاکٹر رضوان کو ہمیشہ رہی کہ کسی گاڑی کے ہارن کی آواز نہیں سنی۔لوگ انتہائی صبر وسکون سے گاڑی چلاتے ہیں اگر آپ کسی زیبرا کراسنگ پر کھڑے ہیں تو لوگ گاڑیاں روک دیتے ہیں۔یہی حال نیو یارک اور واشنگٹن میں دیکھا۔لیکن نیو یارک اور واشنگٹن کی زندگی اس سے مختلف ان معنوں میں تھی کہ یہ زیادہ ترقی یافتہ شہر ہیں۔ یہاں دنیا کی ساری سہولتیں موجود ہیں لیکن یہ تمام سہولتیں مشینوں پر منحصر ہیں۔تقریباً تمام چیزیں خود کار ہیں۔میٹرو یا اسکائی ٹرین یا بس کسی بھی جگہ کام کرنے والے لوگوں کی جگہ مشینیں موجود ہیں۔ائیر پورٹ کے ٹرمینل پر چلنے والی میٹرو اور اسکائی ٹرینیں بغیر ڈرائیور کے ہیں جو الیکٹرونک کمانڈ سے چلتی ہیں۔گھر اور ہوٹل کے اندر کی تمام آسائشیں بھی مشینی ہی ہیں۔اگر یہاں ایک دن کے لیے بجلی چلی جائے تو شاید یہاں کی زندگی ہی رک جائے۔اسی اندازِ زندگی نے لوگوں کو مشینی بنا دیا ہے اور سوچنے سمجھنے کا انداز بھی مشینی ہو گیا ہے۔لوگوں کو انسان سے زیادہ مشین پر ہی بھروسہ بھی ہے اور یہی ان کا سہارا بھی ہے۔اسی لیے دنیا کے تمام برقی اور معدنی ذرائع کا استعمال کرنے کے اعتبار سے امریکہ اور یوروپ کے کئی ممالک پہلے نمبر پہ ہیں جو ایک اعتبار سے دنیا کے لوگوں کے ساتھ ناانصافی بھی ہے۔اسی مشینی زندگی نے لوگوں کو انسان کی طاقت وقوت کو سمجھنے کی کوشش بھی چھین لی ہے۔ان کے اس رویے نے انسانی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا کیا ہے کہ اب کچھ لوگ پیچھے کی جانب مڑ کر دیکھنے لگے ہیں۔یہ سیمنار بھی اسی فکری سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

ایلکنس ،ویسٹ ورجینیا ،امریکہ میں منعقدہ ایک کانفرنس (7 تا 10 اپریل 2011) میں ہندستان سے ہم، ڈاکٹر رضوان اور ڈاکٹر اشتیاق تین لوگ شریک ہوئے، امریکہ کے مختلف اسٹیس کے علاوہ کئی ممالک کے دانشوروں نے بھی شرکت کی۔اس کانفرنس کا بنیادی موضوع ''مشرق و مغرب میں اخلاقیات، روحانیت اور دانشوری کی روایت'' تھا۔مختلف احباب نے انسانی زندگی

کے مختلف پہلوؤں کا اپنے مقالے میں احاطہ کیا۔کسی نے سائنس کی موجودہ ترقی کے دور میں اخلاقیات کے گم ہوتے مسائل پر بات کی تو کسی نے روحانیت کے حوالے سے مشرق ومغرب کی روایتوں کا جائزہ لیتے ہوئے انسان شناسی اور انسانی دوستی کا حوالہ پیش کیا۔تین دن کے اس کانفرنس میں مجموعی طور پر انسانی اقدار کی تلاش وجستجو اور عہد حاضر کے ثقافتی اور تہذیبی انتشار اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل پر گفتگو ہوئی۔

اس کانفرنس کی تفصیل سے قبل اگر امریکی زندگی کے چند پہلوؤں پر غور کرلیا جائے تو اس کے اغراض و مقاصد کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔اس سیمنار میں جس طرح کے مقالے پڑھے گئے اس سے حیرت ہوئی کہ زیادہ تر لوگوں نے برصغیر، ایشیا اور بالخصوص ہندستانی فکر وفلسفے کو اپنا موضوع بنایا۔خاص طور پر صوفیائے کرام کی زندگی ان کے اصولوں اور ہندستانی موسیقی کے علاوہ گوتم بودھ اور ہندومیتھالوجی پر گفتگو کی۔اندازہ یہ ہوا کہ لوگ اب تہذیبی زندگی کی تلاش میں مشرق کی جانب دیکھ رہے ہیں۔اس کانفرنس میں شریک ہونے والے امریکی اساتذہ کے علاوہ وہ ہندستانی اساتذہ بھی شامل تھے جن کا تعلق ہندستان سے تھا۔اگرچہ اب وہ امریکی شہری ہیں۔ان سے ذاتی گفتگو کے دوران یہ احساس ہوا کہ لوگ اس مشینی زندگی سے پریشان ہورہے ہیں اور بہتر زندگی کی تلاش میں صدیوں پرانی تہذیب کے حامل ممالک کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا مطالعہ بڑے انہماک سے کررہے ہیں۔لیکن افسوس یہ ہوا کہ ان کے پاس ریفرنس کے لیے جو کتابیں ترجمے کی شکل میں موجود ہیں وہ ناقص اور نامکمل ہیں۔مجھے اس ضرورت کا شدت سے احساس ہوا کہ ہمارے ملک کی تہذیب وتمدن پر بہتر اور مستند کتابوں کا ترجمہ اور اس کی اشاعت مغربی ممالک کی موجودہ ضرورت بنتی جارہی ہے اس لیے ہمارے ملک کے دانشور اگر اس جانب توجہ دیں تو ہماری تہذیب وثقافت کو لوگ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔کیونکہ کئی مقالوں میں جو حوالے دیئے گئے تھے وہ یا تو غلط تھے یا ناقص اور یہ قصور اُن کا نہیں تھا بلکہ کتابوں کی عدم دستیابی کے سبب تھا۔بہر کیف وہاں جاکر تکنیکی ترقی کے اعتبار سے تو نہیں لیکن تہذیبی رنگارنگی کے اعتبار سے ہمیں اپنے ملک پر فخر کا احساس ہوا۔انھیں اقدار کی کمی کے سبب ان ممالک میں انسان گم ہوتے جارہے ہیں۔آج کی دنیا ایک طرف سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقیات کے اعتبار سے بام عروج پر ہے تو

دوسری جانب لوگ اِن ترقیات کے پس منظر میں گُم ہوتے ہوئے انسان اور انسانیت کی جانب بھی تشویش بھرے انداز میں دیکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دراصل سائنسی ترقیات ہماری زندگی میں انقلاب انگیز تبدیلیاں لے کر آئی ہیں۔ ان تبدیلیوں کا سیدھا اثر ہماری شب وروز کی زندگی پر مرتب ہوئی۔ زندگی اتنی آسان ہوگئی کہ ہم نے ان ٹکنالوجی کو اپنی زندگی کا لازمہ بنالیا اور گرد وپیش کو بھی اسی عینک سے دیکھنے لگے۔ یہ بات اگر چہ ہم ہندستانیوں کی زندگی پر مکمل طور پر صادق نہیں آتی لیکن امریکی زندگی کو دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ لوگ مشینی دور میں خود بھی مشین بن گئے ہیں اور ان کی زندگی کا انحصار بھی انھیں مشینوں پر ہے۔

امریکہ کی زندگی کے حوالے سے کچھ نئی باتوں کا انکشاف ہوا۔ ایک بات جو بڑی اچھی لگی وہ یہ کہ ہم لوگ ڈیوس اینڈ ایلکنس کالج کے جس 'گریس لینڈ اِن' میں ٹھہرے ہوئے تھے وہ ایک تھری اسٹار ہوٹل کے برابر کی سہولیات کا حامل تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ اس کالج میں ہوٹل مینجمنٹ کی تعلیم ہوتی ہے اور یہاں پڑھنے والے طلبہ وطالبات ہی اس کا پورا مینجمنٹ سنبھالتے ہیں۔ سارا کام انھیں کے ذمے ہوتا ہے۔ اس طرح ان کی یہ پریکٹیکل ٹریننگ بھی ہوجاتی ہے اور گیسٹ ہاؤس پر کسی طرح کا اقتصادی بوجھ بھی نہیں پڑتا ہے۔ شاید ہمارے یہاں کے طالب علم اس کو کسی طرح گوارا نہیں کریں۔ لیکن یہ وہاں کی تہذیب کا حصہ ہے کہ کوئی کچھ بھی کام کرے ان کے لیے باعث شرم نہیں۔ کیونکہ بہت سے طلبہ چھٹیوں میں کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں کام کر لیتے ہیں، خود اس کالج کی شاندار کینٹین میں ہم لوگوں نے دوتین وقت کا کھانا کھایا جو ایک اچھے ہوٹل کے کھانے سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ کچھ طلبہ وطالبات یہاں پارٹ ٹائم کام کرتے ہیں یہ ان کے لیے شرم کا سبب نہیں۔ کینٹین کا انتظام بھی ایسا کہ ہر طرح کے کھانے اور مشروبات موجود تھے۔ خود سے کھانا لینا ہے اور کھانے کے بعد پلیٹیں بھی اٹھا کر متعینہ جگہ پر رکھنی ہیں۔ اس طرح بہت سے طالب علم اس کینٹین میں جز وقتی کام کر کے اپنی تعلیم کا خرچ نکالتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں اسکولوں میں پڑھنے والے تمام طلبہ وطالبات کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کمیونٹی سروس کریں۔ یہ ان کے کریکولم (تعلیم سرگرمیوں) کا حصہ ہوتا ہے۔ وہ طالب علم جو کمیونٹی سروس میں حصہ نہیں لیتے ان کو سرکاری نوکریاں ملنی مشکل ہوتی ہیں۔ اس کمیونٹی سروس میں جھاڑو دینے سے لے کر صفائی ستھرائی کا

کوئی بھی کام ہوسکتا ہے۔ یہ پہلو ہمیں بہت اچھا لگا کہ جہاں ہم پڑھتے ہیں وہاں کسی کام کو کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرنی چاہیے اور یہ ہماری مستقبل کی زندگی کی ٹریننگ بھی ہوتی ہے۔

البتہ ہماری تہذیب سے جو چیز بالکل منفرد تھی وہ یہاں کی آزادانہ زندگی۔ جہاں لڑکے لڑکیوں کا بے تکلف اختلاط ہر جگہ نظر آیا۔ ظاہر ہے یہ ان کی زندگی کا حصہ ہے۔ لیکن یہاں بھی ایک بات نظر آئی وہ یہ کہ جو لوگ روایتی عیسائی ہیں، ان کے یہاں مشترکہ زندگی کی کچھ جھلک ملتی ہے۔ وہ اپنی بچیوں کی شادیاں جلد ہی کر دیتے ہیں۔ ہمیں ائیر پورٹ پر جو خاتون لینے آئیں تھیں وہ ریسرچ اسکالر تھیں، ان کی عمر تیس سے بھی کم تھی اور وہ شادی شدہ تھیں۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ ان کے یہاں ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں کا خیال ہے۔ حالانکہ ہمارا یہ عام تصور ہے کہ امریکہ میں بچے بڑے ہوتے ہی اپنے من کے مالک ہوتے ہیں۔ ایسا ضرور ہے لیکن روایتی قسم کی فیملی کچھ مختلف ہے۔ وہاں گیسٹ ہاؤس میں ایک پمفلیٹ دیکھنے کو ملا جس کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ یہاں لڑکے لڑکیاں اپنے ساتھی کا انتخاب خود کرتی ہیں اور اس میں کوئی سماجی برائی نہیں۔ کسی دوست کے ساتھ ڈیٹ پر جانا اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا اس کے بعد یہ طے کرنا کہ ان کے ساتھ شادی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ ہمیں اس وقت اور حیرت ہوئی کہ ایک ہندستانی پروفیسر نے اپنی بیٹی کے بارے میں بتایا کہ وہ پڑھ لکھ کر بڑے اچھے عہدے پر فائز ہے لیکن ہمارے کہنے کے باوجود وہ ڈیٹ پر جانے کا وقت نہیں نکال پا رہی ہے۔ ان کی اس بات سے بھی اندزہ ہوا کہ یہ آزادی امریکی زندگی کا حصہ ہے۔ خیر ہم اس پمفلیٹ کا ذکر کر رہے تھے جو پولیس انتظامیہ کی جانب سے تھا جس کے سرورق پر لکھا تھا ''DatingViolence'' اور اندرونی صفحات پر بہت سی تاکیدیں لکھی ہوئی تھیں جو ڈیٹینگ کے اصولوں کے مخالف ہوسکتی ہیں۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ڈیٹینگ کے بہانے بہت سے کرائم بھی ہوتے ہیں اور اس کے کئی اصول بھی ہیں۔ یعنی ڈیٹینگ پر گئی لڑکی کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا جاسکتا اور نہ اسے کسی بات کے لیے مجبور کیا جاسکتا ہے۔ یہ اور کئی طرح کی ہدایات اس میں درج تھیں۔ بہر کیف یہ ان کی تہذیب کا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ ان میں اور مشرقی تہذیب میں جو نمایاں فرق نظر آیا وہ یہ کہ وہ مہمانوں کا استقبال بھی مصنوعی انداز میں کرتے ہیں۔ جو لوگ ان کے انداز سے واقف نہیں ہیں

انھیں بڑی مایوسی ہوگی کیونکہ ہم مہمانوں کا ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں لیکن وہ ہماری طرح مہمانداری اور ضیافت نہیں کرتے۔ ہاں ایک بات جو مجھے بہت اچھی لگی وہ یہ کہ جس طرف نکلیں کوئی بھی مل جائے وہ آپ کو ہیلو ضرور کہے گا اور جواب میں مسکرائے گا۔ حالانکہ یہ ہماری تہذیب ہے کہ کسی سے ملو تو سلام میں پہل کرو لیکن ہم اپنی تہذیب بھولتے جارہے ہیں۔ خیر تین دن کے سمینار کے بعد ہم نیویارک کے لیے روانہ ہوئے۔

اس سفر میں امریکہ کے تین شہروں ویسٹ ورجینیا، واشنگٹن اور نیویارک کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان تینوں شہروں کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں تینوں شہروں کی زندگی ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھی۔ ورجینا روایتی طرز کا شہر ہے۔ واشنگٹن سیاسی سرگرمیوں کا شہر اور نیویارک مختلف تہذیب وثقافت اور اقتصاد کا شہر ہے۔ اردو وکی پیڈیا کے مطابق:

''نیویارک امریکہ کا سب سے بڑا شہر ہے اور دنیا کے عظیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے جو دریائے ہڈسن کے کنارے واقع ہے۔ نیویارک کاروبار، تجارت، فیشن، طب، تفریح، ذرائع ابلاغ اور ثقافت کا عالمی مرکز ہے جہاں کئی اعلیٰ نوعیت کے عجائب گھر، آرٹ گیلریاں، تھیٹر، بین الاقوامی اداریاور کاروباری مارکیٹیں ہیں۔ اقوام متحدہ کا صدر دفتر بھی اسی شہر میں ہے جبکہ دنیا کی کئی معروف بلند عمارات بھی اسی شہر کی زینت ہیں۔ یہ شہر دنیا بھر کے سیاحوں کے لئے باعث کشش ہے۔ 1952ء میں اقوام متحدہ کے دفاتر کے قیام نے اسے دنیا بھر کے شہروں پر سیاسی برتری دلائی۔ نیویارک 11 ستمبر 2001ء کو دہشت گردانہ حملوں کا نشانہ بنا اور شہر کی بلند ترین عمارت ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے تباہ ہونے سے اس کی شہرت اور بھی بڑھ گئی۔ نیویارک کو دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کا دارالحکومت بھی کہلاتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی دنیا میں عالمی معروف ادارے اور ٹائمز اسکوائر، ٹائم وارنر، نیوز کارپوریشن، ہیرسٹ کارپوریشن اور وایاکوم اسی شہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ دنیا بھر کی آزاد فلموں میں سے ایک تہائی نیویارک میں پیش کی جاتی ہیں۔ 200 سے زائد اخبارات اور 350 جرائد کے دفاتر شہر میں

موجود ہیں۔ صرف کتب کی طباعت واشاعت کی صنعت سے ہی 13 ہزار افراد وابستہ ہیں۔ شہر امریکہ کے 4 بڑے نشریاتی ٹیلی وژن اداروں اے بی سی، سی بی ایس، فوکس اور این بی سی اور دیگر کئی معروف کیبل ٹیلی وژن چینلوں بشمول ایم ٹی وی، فوکس نیوز، ایچ بی او اور کامیڈی سینٹرل کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ انگریزی کے علاوہ اردو کے کئی ہفتہ وار اخبار بھی نیو یارک سے شائع ہوتے ہیں۔ نیو یارک شہر بین الاقوامی کاروبار اور تجارت کا عالمی مرکز سمجھا جاتا ہے اور اسے عالمی اقتصادیات کے تین مراکز (نیو یارک، لندن اور ٹوکیو) میں سے ایک قرار دیا جاتا ہے۔ تجارت، انشورنس، ریئل اسٹیٹ، ذرائع ابلاغ اور آرٹس کے علاوہ شہر کے دیگر اہم شعبہ جات میں ٹیلی وژن اور فلم انڈسٹری، طبی تحقیق اور ٹیکنالوجی، غیر منافع بخش ادارے اور جامعات اور فیشن شامل ہیں۔ نیو یارک شہر پانچ علاقوں پر مشتمل ہے: مین ہٹن، بروکلن، کوئنز، برنکس، اسٹیٹن جزیرہ۔ یہ پانچوں علاقے انتہائی گنجان آباد ہیں جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر انہیں الگ شہر بھی سمجھا جائے تو یہ تمام دنیا کے 50 گنجان آباد ترین علاقوں میں شامل ہوں گے۔'' (بحوالہ اردو ویکی پیڈیا)

ہم لوگ نیو یارک میں مین ہٹن کے ڈاؤن ٹاؤن علاقے میں ایک ہوٹل میں رکے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے ہی ہم لوگوں نے اس ہوٹل کو بک کرایا تھا۔ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ اس کے منیجر ہندستانی ہیں اور دہلی کے لاجپت نگر کے رہنے والے ہیں۔ جب ہم یہاں پہنچے تو رات کا ایک بج چکا تھا۔ موسم سرد تھا اور ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ ہوٹل میں کھانے کا کچھ انتظام نہیں تھا اس لیے ہم لوگ باہر آئے۔ دوسری اسٹریٹ پر ایک میکڈونل پہنچے لیکن کھانے میں کوئی چیز سبزی کی نہیں تھی۔ کچھ برگر تھے بھی تو اس میں بھی گوشت کی آمیزش تھی جو حلال نہیں تھا۔ ہمارے بار بار حلال پوچھنے پر اس نے ڈیلنسی اسٹریٹ پر ساہیوال ڈیلی کا پتہ بتایا۔ وہاں پہنچ کر ہمیں خوشی ہوئی۔ دکان مالک بھائی عبد الماجد بڑے تپاک سے ملے اور ہفتوں کے بعد دال چاول اور گوشت دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور کھانے کا مزہ بھی آیا۔ بھائی ماجد صاحب نے اپنی جانب سے ایک اور سبزی بھی کھلائی اور عمدہ چائے پلائی اور ہم

سے بہت کم پیسے بھی لیے۔جس تپاک سے ہمارے پاکستانی بھائی ملے کہ ہم کبھی نہیں بھول سکتے اور معاً خیال آیا کہ کاش ہم ہندستانی اور پاکستانی اسی طرح اپنے ملکوں میں بھی ملتے۔

نیویارک کی پہلی صبح ہمارے لیے اور بھی سردی لے کر آئی۔لیکن ہم لوگ سیر کو نکل پڑے۔ہر جگہ شہر کا میپ دستیاب تھا اور ٹرانسپورٹ کی رہنمائی بھی اس لیے ہم ڈاکٹر رضوان جو تجربہ کار سیاح ہیں، کی رہنمائی میں نکل پڑے۔میٹرو کے ذریعے پہلے گراؤنڈ زیرو میموریل دیکھنے گئے۔جو عمارت تباہ ہوئی تھی اس جگہ تعمیر کا کام تیزی سے جاری تھا۔اور نیا ٹریڈ سینٹر اسی کے بالمقابل نئی آب وتاب کے ساتھ پرانی عمارت سے بھی زیادہ اونچی اور مضبوط کب کی بن چکی ہے۔یہ عمارت اسٹیل اور شیشے سے بنی ہوئی ہے۔باقی کئی عمارتیں زیر تعمیر ہیں۔اسے دیکھنے کے بعد ہم نے نیویارک کے کئی علاقوں کو دیکھا اور خاص طور پر اسٹیچو آف لیبرٹی۔یہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ کس طرح سیاحوں کو اٹریکٹ کیا جاتا ہے۔فیری (پانی کا جہاز) ہر آدھے گھنٹے پر مفت میں سیاحوں کو اس جزیرے کی سیر کراتی ہے جہاں اسٹیچو آف لیبرٹی ہے۔انتہائی عمدہ انتظام دیکھ کر طبعیت خوش ہوئی۔اس کے بعد ہم لوگوں نے اپنے عزیزوں کے لیے یہیں سے تحائف بھی خریدے۔مجموعی طور پر نیویارک مشترکہ تہذیب وثقافت کا ایک خوبصورت شہر ہے اور اس کا امتیاز بھی یہی ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک کے لوگ اس شہر میں موجود ہیں۔لیکن کم وقت میں تمام مقامات کو دیکھنا ممکن نہیں تھا۔کیونکہ 13 اپریل کی صبح دہلی کے لیے ہماری واپسی تھی۔دو دنوں میں اس شہر کو نہیں دیکھا جاسکتا۔لیکن اہم مقامات کو دیکھ کر ہم لوگ دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔اس دفعہ امریکی وقت کے حساب سے ہمارا جہاز شام کے پانچ بجے نیویارک سے روانہ ہوا۔کچھ ہی دیر میں رات ہوگئی۔لیکن یہ رات صرف چار پانچ گھنٹے کی تھی۔اس کے بعد تمام راستے دن ہی دن تھا۔مگر سورج کی روشنی اتنی تیز تھی کہ ہم باہر نہیں دیکھ سکتے تھے۔اللہ کا شکر ہے کہ ہم خیر وخوبی سے 14 اپریل کی شام دہلی واپس آ گئے۔اور اب امریکہ کو نئے سرے سے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

○○○

حافظ وسعدی کے ملک میں

ایران اور ہندستان کے درمیان بہت قدیمی رشتے ہیں۔ ہندستان نے ہمیشہ ایران کو دوست رکھا۔ایران سے تہذیبی اور ثقافتی رشتے بہت مضبوط ہیں۔ایران نے بھی ہندستان کے ساتھ دوستانہ رابطہ بحال رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔کئی طرح کے نشیب وفراز کے بعد بھی دونوں ممالک آپس میں دوست ہیں اور جغرافیائی اعتبار سے بھی ان کا آپس میں مل کر رہنا زیادہ مناسب ہے۔تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے بھی یہ دونوں ممالک ایک دوسرے سے بے حد قریب ہیں۔ جولائی 2011 میں ایران میں ایک ہفتے کے قیام کے دروان مختلف شہروں کو دیکھنے کا موقع ملا اور کئی طرح کے لوگوں سے رابطہ ہوا۔لیکن مجموعی طور پر میں نے یہ محسوس کیا کہ ایرانی ہندستان سے بڑی انسیت رکھتے ہیں۔ ہر شخص ایک بار ضرور ہندستان دیکھنے کی تمنا بھی رکھتا ہے۔ میں نے کئی لوگوں سے یہ دریافت کرنے کی کوشش کی کہ ہندستان کے تئیں انسیت کی وجہ کیا ہے؟ الگ الگ لوگوں سے الگ الگ جوابات ملے۔لیکن اس کی ایک بڑی وجہ جو ان کی گفتگو سے میں نے اخذ کیا وہ یہ ہے کہ ہندستان میں چونکہ ان کے آبا واجداد نے حکومت کی تھی اور ہندستان سے خود ایران نے برسوں سے اقتصادی اور سماجی سطح پر استفادہ کیا ہے اور آج بھی ایران کے اقتصادی اور سماجی روابط ہندستان سے ہیں۔ اس لیے بھی تمام ایرانی ہندستان کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتے ہیں۔اور خاص بات یہ ہے کہ وہ ہندستانی لوگوں سے خلوص سے ملتے ہیں۔اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہندستان ایران کا دوست ملک ہے۔رہی بات تہذیبی لین دین کی تو وہ ہندستان نے ایران سے بہت کچھ لیا ہے۔ایرانی تہذیب کو دیکھ کر اسی لیے اپنائیت محسوس ہوتی ہے کہ وہاں کی طرز

زندگی اور خورد و نوش ہمارے لیے نئے نہیں لگتے کیونکہ ہماری تہذیب میں ایرانی تہذیب کے عناصر موجود ہیں۔ایران کی تمدنی زندگی کے اثرات بھی ہمارے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس لیے ایران جاکر زبان کی سطح پر اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔لیکن باقی چیزوں میں بہت حد تک مماثلت ہے۔تہذیبی لین دین سے زیادہ آج اقتصادی لین دین کی اہمیت ہے۔اس کے علاوہ ایران و ہند کے درمیان تعلیمی روابط بھی بہت گہرے ہیں۔ ہندستان سے ایران جاکر تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد بھی بہت اچھی ہے۔اسی طرح ہندستان میں آکر تعلیم حاصل کرنے والے ایرانیوں کی تعداد۔آپ کو حیرت ہوگی کہ اس وقت ہندستان میں تیس ہزار طلبہ وطالبات تعلیم کے لیے موجود ہیں۔ یہ اعداد و شمار ایران میں واقع ہندستانی ایمبیسی سے ملی۔ ہر سال ہندستان کی جانب سے 52 اسکالرشپ بھی ان کو دیا جاتا ہے۔اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ تعلیم کے میدان میں ہندستان ان کے لیے کتنا اہم ہے۔

بچپن سے جو چیزیں یادداشت میں ہوتی ہیں وہ ہمیشہ ذہن میں گردش کرتی رہتی ہیں۔ اسلامی تاریخ کے حوالے سے مکہ و مدینہ کے بعد ایران،عراق،مصر،ترکی،ماوراءالنہر، یہ وہ علاقے ہیں جو اپنے دامن میں اسلامی تاریخ کے کئی اہم حوالے رکھتے ہیں۔اللہ کا فضل ہے کہ ان میں سے بیشتر مقامات کی زیارت کا شرف حاصل کر چکا ہوں۔لیکن حرمین شریفین کی زیارت کے بعد اب تک ہمت نہیں ہوئی کہ قلم اٹھاؤں۔اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ ان جذبات اور عقیدتوں کو الفاظ میں نہیں ڈھال سکتے۔لیکن کچھ ایسے تلخ تجربات بھی ہیں جن کا تعلق حکومت اور انتظامیہ سے ہے۔ لیکن اس ڈر سے اب تک اس کی تفصیل نہیں لکھی کہ کہیں ان مقامات کی شان میں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔خیر بات حافظ وسعدی کے ملک کی ہو رہی تھی۔لیکن یہ صرف حافظ وسعدی کے حوالے سے ہی نہیں جانا جاتا۔غوث اعظم عبدالقادر جیلانی کا مولد بھی یہی ملک تھا اس کے علاوہ اس ملک کو اللہ نے اپنے نیک بندوں کی نسبت سے نوازا ہے۔ عام طور پر ہندستان میں مسلمانوں کے گھروں میں فارسی کی تعلیم بھی ہوتی ہے۔اور جب فارسی کی بات آتی ہے تو حافظ،سعدی، رومی، جامی کا ذکر خاص طور پر ہوتا۔اس کے علاوہ جب اسلام کی تاریخ پڑھتے ہیں تو اسلام کی آمد سے قبل تہذیب و تمدن کے حوالے سے بھی اس ملک کا نام بھی آتا ہے۔ بہر کیف بات یہ ہو رہی تھی کہ بچپن

کی یادداشت میں ایران کے کئی حوالے موجود تھے۔اس لیے میری بڑی خواہش تھی کہ ایران کی سرزمین کو کاش دیکھ سکوں۔اس سرزمین کو جس کا تعلق نہ صرف اسلامی تاریخ سے ہے بلکہ ہندایرانی تہذیب کے حوالے سے بھی یہ اہم ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے یہ موقع عنایت فرمایا۔ 7 جولائی 2011 کو پروفیسر اختر حسین، شعبہ فارسی جے این یو کے ہمراہ امارات کی فلائٹ سے ایران کے لیے روانہ ہوئے۔ دوپہر کو ہم دبئی ایئر پورٹ پہنچ گئے یہاں ہمیں چار گھنٹے سے بھی زیادہ انتظار کرنا تھا۔ہم نے سوچا تھا کہیں یہ انتظار مشکل کا سبب نہ بن جائے۔لیکن دبئی ائیر پورٹ اوراس میں ڈیوٹی فری شاپنگ کا ذکر بار بار سنا تھا اور سمجھ نہیں پارہا تھا کہ ایسی کیا بات ہے؟ لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ واقعی یہ تو ائیر پورٹ سے زیادہ ایک بازار ہے۔لہٰذا ہم بھی اس کی رونقوں کو دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کیسے اتنے گھنٹے گزر گئے۔ جب ہماری تہران کی فلائٹ کا اعلان ہوا تو ہم مقررہ گیٹ کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں انتظار کرنے لگے۔لیکن میری حیرت کو ڈاکٹر اختر حسین صاحب سمجھ گئے اور انھوں نے پوچھا کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔میرے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھر رہا تھا کہ ایران دنیا کے ان ممالک میں سے ایک ہے جو سفر کے اعتبار سے زیادہ محفوظ نہیں اور نہ ہی لوگ اس ملک کی سیر کو جانا چاہتے ہیں کیونکہ امریکہ نے اس پر کئی طرح کی پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ باوجود اس کے اتنی بڑی تعداد میں یوروپی خواتین کیسے ایران کا سفر کر رہی ہیں۔میں نے یہی سوال اختر بھائی سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ بس آپ دیکھتے جائیں۔ کچھ دیر میں یہ راز خود بخود عیاں ہو جائے گا۔ واقعی جب اس کا انکشاف ہوا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہی بے حجاب اور یوروپی لباس زیب تن کیے خواتین جن کو میں کچھ دیر پہلے تک یوروپی ممالک کی خواتین سمجھ رہا تھا وہ تو دراصل ایرانی خواتین تھیں۔لیکن جونہی بارڈنگ شروع ہوئی یہ سب خواتین نقاب اور حجاب میں آ گئیں۔تب مجھے ایسا لگا کہ ایران میں جو پردے کی پابندی ہے کہ کوئی خاتون بغیر پردے کے باہر نہیں نکل سکتی اور اگر غلطی سے نکل آئی تو بلا تاخیر پولیس اسے گرفتار کر لیتی ہے۔ایران میں پردے کی سختی کا یہ حال ہے کہ وہاں کسی بھی ملک کی، کسی بھی مذہب اور کسی بھی منصب کی کوئی خاتون بغیر پردے کے جا ہی نہیں سکتی۔ اس بات کی تصدیق ایران میں موجود انڈین ایمبیسی کے ایک آفیسر

نے بھی کی۔ انھوں نے پرتکلف عشائیہ میں یہ بات کہی تھی کہ ابھی کچھ دنوں قبل ہندستان سے ایک غیر مسلم خاتون وزیر کا دورہ ہوا تھا۔ ان کے لیے ہم ائیر پورٹ حجاب لے کر گئے تھے۔ بات سمجھ میں آئی کہ ایرانی حکومت پردے کے معاملے میں بہت سخت ہے۔ اور سختی کی انتہا یہ ہے کہ وہ کسی ملک کی وزیر کے لیے بھی اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ کئی ممالک کی غیر مسلم خاتون وزیر اس ڈر سے بھی وہاں کا دورہ نہ کرتی ہوں۔ لیکن ان کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے جو خواتین ایران سے باہر قدم رکھتے ہی نہ صرف اپنے نقاب سے باہر آجاتی ہیں بلکہ کہیں سے اور کسی چھب ڈھب سے وہ مسلم بھی نظر نہیں آتیں۔ ان کے ساتھ ان کے گھر والے بھی ہوتے ہیں اور ان کے خویش و اقارب بھی ہوتے ہیں 60 سے 70 فیصد عورتوں کے اس رویے کو وہ بھی غلط نہیں سمجھتے، یہ زیادہ حیرت کی بات ہے۔ ایران سے واپسی میں بھی یہی منظر تھا۔ تہران ائیر پورٹ سے جہاز کے پرواز بھرتے ہی 50 سے 60 فیصد لڑکیوں اور عورتوں نے اپنے نقاب بیگ میں ڈال دئے اور جو لباس بچا اسے کسی بھی طرح ایک مسلم گھرانے کی عورتوں کا لباس نہیں کہہ سکتے۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے یہ محسوس کیا کہ ایران میں پردے کا اہتمام حکومت کے ڈنڈے پر ہوتا ہے۔ اس میں اسلامی ملک کا جو تقدس ہونا چاہیے وہ سرے سے مفقود تھا۔ ایران کے اس پہلے تاثر نے مجھے بڑا کبیدہ خاطر کیا۔

رات کو جب ہم تہران ائیر پورٹ پہنچے تو وہاں کے نظم و نسق نے اور بھی پریشان کیا۔ لیکن جب ہم باہر آئے تو ایران کی پہلی رات اور اس کی آب و ہوا نے دل کو تازگی عطا کی۔ ہوٹل پہنچتے پہنچتے کافی تاخیر ہوگئی تھی اس لیے ہم بلا تاخیر سو گئے۔ تہران کے دوران قیام تہران یونیورسٹی کے اردو کے طلبہ و طالبات سے ہماری ملاقات ہوئی۔ خاص طور پر شیوا شہبازی، طُحیٰ پیامی وغیرہ ان میں سے بیشتر طلبہ و طالبات ویب سائٹ کے ذریعے مجھ سے رابطے میں تھے۔ ان سے ملاقات کے دوران اردو زبان کے حوالے سے گفتگو ہوئی اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تہران میں اردو کے طلبہ طالبات ہندستان کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں اور ہندستان سے محبت رکھتے ہیں۔ اسی سفر میں پہلی بار تہران یونیورسٹی میں اردو کی استاد وفا یزدان منش سے شیوا کے توسط سے متعارف ہوا۔ صبح کو طُحیٰ پیامی اور شیوا شہبازی ہم لوگوں سے ملنے ہوٹل پہنچے۔ ان کے استقبال کے انداز نے

بہت متاثر کیا۔ کچھ ہی دیر میں آزاد یونیورسٹی کی استاذ ڈاکٹر نرگس بھی تشریف فرما ہوئیں۔ انھوں نے دل کی گہرائیوں سے ہم لوگوں کو خوش آمدید کہا۔ ناشتے کے بعد طّٰی اور شیوا کے ساتھ ہم لوگ تہران شہر دیکھنے نکلے۔ چونکہ اسی شام کو ہمیں یزد جانا تھا اس لیے کم وقت میں ہم زیادہ سے زیادہ تہران کے تاریخی مقامات کو دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی ہمرہی اور ڈاکٹر اختر حسین کے تجربے کا فائدہ یہ ہوا کہ انھوں نے کم وقت میں ' کاخ گلستان' میوزیم اور کئی تاریخی مسجدوں کی زیارت کرادی۔ ایران باستان (میوزیم) واقعی دیکھنے کی چیز ہے اسے دیکھ کر ایران کی قدیم تہذیب کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم لوگوں نے وہاں تخت جمشید کا ایک حصہ دیکھا جسے یہاں محفوظ کیا گیا ہے۔ یہ پانچ ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔ اس تخت میں ایک تصویر بنی ہوئی جو ہاتھ اٹھا کر سلامی پیش کر رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ شاید سلام کرتے وقت ہاتھ کو اٹھانے کی رسم یہیں سے شروع ہوئی ہو۔ تخت جمشید کے کتبے میں مُزد کو خدا لکھا گیا ہے۔ اسی طرح جمشید کے وقت کی بہت سی یادگار چیزیں دیکھنے کو ملیں۔ یہ وہی جمشید ہیں جن کا جام جم مشہور ہے۔ تخت جمشید کی سیڑھیوں پر خط میخی میں عبارتیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس میوزیم میں ایک نایاب چیز مومیائی دیکھا۔ مومیائی کا مطلب یہ ہے کہ جو نمک کی کان میں گیا وہ نمک ہو گیا ہے۔ یہ ایک شخص کے سر کی باقیات کا حصہ ہے جو ایک ہزار سات سو سال پہلے نمک کی کان سے باہر نہیں نکل سکا ہوگا اور وہیں سڑ گل گیا۔ لیکن اس کا سر، چہرا اور سر کے بال کے علاوہ اس کی جیب میں پڑا ایک اخروٹ، اس کا جوتا، کپڑا، بھی محفوظ رہ گیا، سائنس دانوں نے اس کے سر کے بال سے اس کے خون کا گروپ متعین کیا ہے جو بی پلس ہے۔ اس کو دیکھ کر سعدی کا یہ مصرعہ یاد آ گیا:

ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد

میوزیم دیکھنے کے بعد طّٰی اور شیوا دوپہر کے کھانے کے لیے ہمیں ایک قدیمی طرز کے ہوٹل میں لے گئے۔ ہوٹل کی زیب و زینت قدیم طرز کی تھی وہاں بیٹھ کر ایسا محسوس کیا کہ ایران جب بہت ترقی یافتہ نہیں رہا ہوگا تو اس وقت کی تہذیب ایسی ہی ہوگی۔ شاندار اور لذیذ ایرانی کھانے کے بعد ہم ایران کے بازار بزرگ ہوتے ہوئے ہوٹل نادری پہنچے اور وہاں سے تہران ریلوے اسٹیشن آ گئے۔ شیوا اور طّٰی ہمارے ساتھ ہی رہے۔ تہران ریلوے اسٹیشن دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ

بالکل نئے طرز کا اسٹیشن اور تمام سہولیات یہاں موجود تھیں یہ ریلوے اسٹیشن سے زیادہ ائیر پورٹ لگ رہا تھا۔ بہت صاف ستھرا اور کشادہ۔ اطلاعات کے بورڈ پر جہاز کے پرواز کی طرح اطلاعات لکھے گئے تھے۔ جب ٹرین فلیٹ فارم پر آئی تو بارڈنگ کا اعلان ہوا۔ پلیٹ فارم پر سوائے مسافروں کے کوئی نہیں جا سکتا۔ ہم تمام سیکورٹی چیک سے گزرتے ہوئے پلیٹ فارم پر پہنچے، ٹرین کو دیکھا تو محسوس ہوا کہ ان کے پاس بہت اچھی ٹرینیں ہیں۔ خوبصورت ٹرین دیکھ کر جاپان کی فاسٹ ٹرین کی یاد آگئی سوچا جب ٹرین اتنی اچھی ہے تو رفتار بھی اتنی ہی اچھی ہوگی۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا، ٹرین تو اچھی تھی مگر پٹریوں کی حالت بہت بہتر نہ ہونے کے سبب اس کی رفتار ہماری شتابدی سے بھی کم تھی۔ اتفاق سے جس جگہ ہم دونوں بیٹھے تھے ہمارے بالکل سامنے ایک ایرانی فیملی بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ لوگ بھی ہمارے ہی ہم عمر تھے۔ اختر بھائی چونکہ بار بار ایران جا چکے ہیں اس لیے انھوں نے مجھے کھڑی پر جگہ دی تاکہ میں باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہوسکوں۔ ہرے باغات اور پھلوں کے درختوں کو دیکھ کر میں برابر اختر بھائی سے معلومات حاصل کر رہا تھا۔ سامنے بیٹھی خاتون نے اپنے شوہر سے کہا کہ ان سے پوچھیں کہ یہ کس ملک سے ہیں اور کیا ان کے ملک میں درخت نہیں ہوتے؟ کہ وہ اتنی حیرت سے ان درختوں کو دیکھ رہے ہیں۔ ان کے شوہر جھجھکتے ہوئے ہم سے بات کی۔ انھیں یہ بھی تکلف تھا کہ نجانے انھیں فارسی آتی بھی ہے یا نہیں ؟ لیکن جب ہم نے ان کی باتیں سمجھیں اور اختر بھائی نے انھیں ہمارے بارے میں بتایا تو ان کو ہمارے جواب سے زیادہ اختر بھائی کے فارسی لب و لہجے پر حیرت ہوئی کہ ایرانی لہجے میں اتنی فصیح فارسی کیسے بول رہے ہیں؟ سوال کر کے ان کی حیرت میں ایک اور اضافہ ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے ہندستان کے بارے میں ہم سے کئی سوالات کیے۔ ہندستان ایران کے رشتے، تاج محل، ہندستانی فلم وغیرہ وغیرہ۔ اتنی گفتگو کے بعد ہم بے تکلف ہو گئے تھے۔ وہ بھی یزد میں ایک یونیورسٹی کے استاد تھے اور ان کی اہلیہ چارٹیڈ اکاؤنٹینٹ تھیں۔ پھر اس کے بعد پورے راستے انھوں نے کبھی میوہ جات سے اور کبھی چائے کافی سے ہماری ضیافت کی۔ ان سے گفتگو کرتے ہوئے چھ گھنٹے کا سفر آسان ہو گیا اور ایران کے حوالے سے کئی معلومات حاصل ہوئیں۔ ایک ایرانی ہندستان کے بارے میں کیا سوچتا ہے اس کا بھی اندازہ ہوا یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ایرانی

ہندستانیوں کو پسند کرتے ہیں۔

تہران سے روانہ ہونے کے کچھ ہی دیر بعد یہ ٹرین ایسے علاقے سے گزر رہی تھی جو دور دور تک نمک والی زمین تھی۔ ایران کا یہ علاقہ بہت دور تک پھیلا ہوا ہے، جو بے آب و گیاہ ہے۔ اس کے بعد ٹرین جب کاشان کے علاقے میں داخل ہوئی تو نظارہ بدل گیا۔ کیونکہ کاشان کو ایران میں گلاب کی کاشت کے لیے جانا جاتا ہے اور یہاں کے گلاب کی خوشبو دور سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ اب سفر اور خوشگوار ہو رہا تھا کیونکہ شام کے وقت ہماری ٹرین ایران کی ان وادیوں سے گزر رہی تھی جو نہ صرف سرسبز و شادابی کے لیے مشہور ہیں بلکہ ایرانی تاریخ میں ان شہروں کا خاص مقام ہے۔ شام ڈھلنے کے بعد یہ ٹرین نائن اسٹیشن پر رکی اور اعلان ہوا کہ یہاں نماز کے لیے ٹرین آدھے گھنٹے رکے گی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ عصر اور مغرب کے بعد عشا کے وقت نماز کے لیے ٹرین رکی ہے۔ خیر خوشی یہ ہوئی کہ آدھی ٹرین نماز کے لیے خالی ہوگئی۔ نائن سے روانہ ہونے کے بعد تقریباً ایک گھنٹے میں ہم لوگ یزد ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ باہر نکلتے ہی مندنا خانم، اور ان کے شوہر محمد سے ملاقات ہوئی۔ مندنا خانم نے بڑے والہانہ انداز سے ہمارا استقبال کیا۔ مندنا خانم کی خوشی ان کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ فوراً ہی ہم ان کے گاڑی پر سوار ہوئے اور مندنا خانم کے گھر پہنچ گئے۔ گھر کے سارے افراد پلکیں بچھائے جیسے انتظار کر رہے ہوں۔ سب کے سب سراپا منتظر تھے۔ انھوں نے ہمارا استقبال کیا اور خوشی سے جیسے پھولے نہ سما رہے ہوں۔ انھوں انتہائی پرتکلف عشائیہ کا اہتمام کیا تھا۔ ہم نے خوان شیراز کے بارے میں گلستاں میں پڑھا تھا جسے مندنا خانم کے گھر میں دیکھا۔ مندنا خانم یزد میں آزاد یونیورسٹی میں فارسی کی استاذ ہیں اور ابھی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے ڈاکٹر اختر حسین صاحب کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔ ایک استاد بھی ایک اپنے استاد کی اتنی عزت اور پذیرائی کرتا ہے یہ مندنا خانم، کو ہی دیکھ کر معلوم ہوا۔ مندنا خانم کے گھر پر کئی نئی چیزوں کا مشاہدہ کیا لیکن ایک دو چیزیں ایسی ہیں جس کا ذکر میں خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں۔ دسترخوان پر ہم سب لوگ ایک ساتھ بیٹھے مندنا خانم، ان کے شوہر، ان کی بیٹی، بیٹے، ان کی بہن اور بہنوئی یہ دونوں ڈاکٹر اختر حسین سے ملنے کے لیے کئی سو کیلو میٹر دور کرمان سے خاص طور سے آئے تھے۔ دسترخوان بہت وسیع تھا، انواع و اقسام کے چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس لیے

برتنوں کی تعداد بھی خاصی ہوگئی تھی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ سب لوگ ایک ایک کر کے پلیٹوں کو اٹھانے لگے۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ہمارے یہاں بچوں کو ہم لوگ کہتے ہیں کہ پلیٹیں اٹھالو یا زیادہ سے زیادہ عورتوں پر حکم چلا لیتے ہیں۔ لیکن یہاں تو ان کے گھر آئے مہمان بہن، بہنوئی بھی اسے باعث عار نہیں سمجھتے بلکہ اسے مشترکہ کام سمجھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ گھر کے تمام افراد آپس میں اس طرح بے تکلف تھے کہ انھیں دیکھ کر رشک آرہا تھا۔ انھوں نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ انھوں نے یزد کے سب سے اچھے فائیو اسٹار ہوٹل صفائیہ میں ہمارے قیام کا انتظام کیا تھا۔

۹ جولائی کی صبح ناشتے سے فارغ ہو کر مندنا خانم کے ساتھ یہاں کی تاریخی جامع مسجد دیکھنے گئے۔ اس مسجد کی خاص بات یہ تھی کہ سولہویں صدی کی مسجد تھی اور اس کے تین حصے ہیں ایک درمیانی حصہ اس کے دونوں طرف بھی مسجد ہی بنی ہوئی تھی لیکن طرز تعمیر کا یہ بہترین نمونہ تھا کیونکہ ایک جانب کا حصہ گرمیوں کے لیے تھا اور دوسری جانب کا حصہ سردیوں کے لیے۔ جس طرح سے ان کو بنا گیا ہے وہ قابل دید ہے۔ جس زمانے میں الیکٹرسٹی کی سہولت نہیں تھی اس زمانے میں بھی لوگوں نے کس طرح سردی اور گرمی سے بچنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس مسجد کی کاشی کاری کا کام بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اس کی رونق برقرار ہے۔ میناروں اور گنبد کے کچھ حصے میں کاشی کاری کی مرمت کا کام چل رہا تھا۔ یہاں پروفیسر مہدوی سے ملاقات ہوئی۔ یہ کام انھیں کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ کاشی کاری میں ایران کی اپنی انفرادیت ہے۔ انھوں نے صدیوں کے اس اس فن کو اب تک محفوظ رکھا ہے۔ جسے ہم سمجھتے ہیں کہ ٹائل ورک ہے۔ دراصل یہ اس سے بہت آگے کی چیز ہے۔ نقاشی جو منبر و محراب اور گنبد پر نظر آتی ہے یہ کئی اقسام کے ہیں کچھ کا تعلق سولہویں صدی سے ہے اور کچھ کا تعلق اس کے بعد یا اس سے پہلے کا ہے۔ آج بھی اسی انداز سے یہ فن زندہ ہے، یہ بڑی بات ہے۔ پروفیسر مہدوی نے بتایا کہ یہ اس انداز سے بنایا جاتا ہے کہ اس پر موسم کے سرد گرم اور تند و تیز ہواؤں کا بھی اثر نہیں ہوتا ہے۔ یزد کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہاں تیز ہوائیں چلتی رہتی ہیں اور گرم علاقہ ہے۔ اس لیے جب مسجد جامع کی چھت پر گئے تو ہر گھر پر ایک عجیب طرح کی دیواریں دیکھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ 'بادگیر' ہے۔

بادگیر دراصل اس زمانے کی تکنیک ہے جب برقی وسائل موجود نہیں تھے۔ بادگیر کا کام تھا کہ وہ ہوا کو پکڑ کر گھر کے اندر پہنچادے اور اس کو اس طرح سے بنایا جاتا تھا کہ یہ ہوا اندر داخل ہوتے ہوتے سرد ہوجائے اور گھر کے ہر کونے تک پہنچ جائے۔ یہ عینی مشاہدہ اس لیے ہوسکا کہ یزد میں آرٹ اینڈ آرکیٹکٹ کالج کے لیے حکومت نے ایک ایسی حویلی کی عمارت وقف کر دی ہے جو قاچاریوں کے دور کی ہے۔ پروفیسر مہدوی اسی کالج کے استاد ہیں۔ ان کے ساتھ اس عمارت کے اندر داخل ہوتے ہی ہواؤں کا احساس ہوا جو بادگیر کے ذریعے اس عمارت میں داخل ہورہی تھی۔ انھوں نے پھر دیکھایا کہ کس طرح ٹھنڈی ہوا اندر لائی جاتی تھی اور گرم ہوا باہر کی جانب کر دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اس میں کئی زیریں منزلیں تھیں۔ جیسے جیسے ہم لوگ نیچے جارہے تھے عمارت میں خنکی بڑھتی جارہی تھی۔ سب سے نچلی منزل میں پانی کے ٹھہراؤ سے خنکی پیدا کرنے کی ترکیب تھی اور اسی حصے میں اس زمانے میں باورچی خانے کی بچی ہوئی چیزوں کو رکھا جاتا تھا۔ گویا یہ اس زمانے کا فریج تھا۔

پرفیسر مہدوی کے ساتھ ہم لوگ کاشی کاری کس طرح کی جاتی ہے یہ دیکھنے کے لیے ایک فیکٹری گئے۔ جہاں مٹی سے لے کر نقش ونگار کے آخری مرحلے تک کا کام ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ کیوں اتنا مشکل کام ہے۔ مرحلہ وار اس فن کا ہم لوگوں نے مشاہدہ کیا جہاں ٹائلس پہ طرح طرح کے رنگ و روغن چڑھائے جارہے تھے اور ان پر قرآن کریم کی آیات لکھنے کے طریقے کو بھی ہم لوگوں نے دیکھا۔ کاشی کاری کے کام لیے اصفہان اور یزد مشہور ہیں۔

اپنی دیگر مصروفیات سے فارغ ہوکر ہم لوگ یزد شہر کو دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ اس شہر کو ایک اور حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔ یہ پارسیوں کا شہر ہے۔ پارسیوں کا آتشکدہ بھی یہیں ہے۔ یہی شہر پارسیوں، زرتشتوں کا قبلہ وکعبہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان کا آتشکدہ جسے وہ لوگ آتشِ مقدس کہتے ہیں اسی شہر میں ہے جو سات سو سال سے بھی زیادہ عرصے سے مستقل جل رہا ہے۔ ایران کا یہ واحد شہر ہے جہاں زرتشتوں کی بڑی آبادی ہے بلکہ یوں کہیں کہ یزد دراصل زرتشتوں کا ہی شہر تھا۔ لیکن اب ان کی آبادی کم ہے۔ زرتشتوں کے شہر ہونے کے ناطے ان کی قدیمی اور روایتی چیزیں یہاں موجود ہیں۔ زرتشت کا رواج یہ ہے کہ وہ اپنے مردے کو نہ ہی دفن کرتے ہیں نہ ہی

اسے جلاتے ہیں۔ بلکہ ان کے یہاں رسم یہ ہے کہ آبادی سے دور کسی پہاڑ کی اونچائی پر ایک عمارت ہوتی ہے اسی کی چھت پر مردے کو رکھ دیتے ہیں تاکہ چیل کوے اور پرندے اس کو نوچ نوچ کر کھالیں۔ زرتشت کے یہاں یہ مانا جاتا ہے کہ جس کی لاش کو پرندے جتنا جلدی ختم کرتے ہیں مرنے والے کو اتنا ہی نیک سمجھا جاتا ہے۔ اس عمارت کو جہاں مردے کو پرندوں کے حوالے کیا جاتا ہے اسے دخمہ کہتے ہیں۔ (دخمہ اور آتشکدے کی تصویر ہمارے ویب سائٹ پر دیکھ سکتے ہیں)

یزد میں دو دن کے قیام کے دوران اور دوسرے شہروں کی سیر کے لیے بھی مندنا خانم ہمیشہ ہم لوگوں کے ساتھ رہیں۔ زیادہ تر انھیں کے گھر پر ہم لوگوں نے کھانا کھایا اور انھیں کی گاڑی سے گھومتے رہے۔ ان کی ضیافت نے ہمیں بار بار یہ احساس دلایا کہ میری وجہ سے وہ پریشان ہو رہی ہیں لیکن وہ ہماری خدمت کر کے خوش ہوتی تھیں۔ یہ صرف ان کا حال نہیں تھا بلکہ ان کے شوہر، ان کی بہن، بیٹی اور بھائی سب کے سب ہم لوگوں کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہو اس کا خیال رکھنے میں خوشی محسوس کر رہے تھے۔ 10 جولائی کو ہمیں اصفہان جانا تھا۔ یہ سفر ہم بس کے ذریعے کر سکتے تھے۔ وہاں کی سڑکیں بہت عمدہ اور بسیں نہایت آرام دہ ہوتی ہیں۔ لیکن مندنا خانم اپنی گاڑی سے ہمیں اصفہان لے کر گئیں۔ ان کے ہمراہ ان کے بھائی تھے وہ ایک یونیورسٹی میں کمپیوٹر ٹکنالوجی کے استاد ہیں۔ صبح کو ہم چاروں اصفہان کے لیے روانہ ہوئے ساڑھے تین سو کیلومیٹر کا سفر باتیں کرتے گزر گیا۔ اصفہان جاتے وقت نائن شہر کو دیکھا۔ وہاں سے مندنا خانم نے کچھ کھانے پینے کی چیزیں خریدیں۔ باقی چائے اور کافی تو گاڑی میں موجود تھی اس طرح کھاتے پیتے ہم لوگ دوپہر تک اصفہان پہنچ گئے۔ یزد سے اصفہان تک پورا راستہ تقریباً خشک اور بنجر زمین ہے۔ درمیان میں کچھ سرسبز علاقے نظر آئے جیسے نائن شہر اور کچھ باغات۔ باقی تمام زمین ریگ اور چھوٹے چھوٹے کانٹوں سے بھری تھی۔ لیکن اصفہان کے نزدیک آتے ہی موسم بدل گیا اور نظارہ بھی بدل گیا۔ اب ہر طرف ہریالی نظر آ رہی تھی اور آب و ہوا میں نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی۔

اصفہان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ ''اصفہان نصف جہان''۔ زمانہ قدیم سے یہ ضرب المثل مشہور ہے لیکن کس زمانے میں یہ کہا گیا؟ یہ حتمی طور پر معلوم نہیں۔ اصفہان کو نصف جہان اس لیے کہا جاتا تھا کہ تمدنی ترقی کے دور میں بھی اصفہان میں تمام سہولیات موجود تھیں اور اصفہان اس

وقت بھی قدرتی حسن سے سرفراز تھا۔ آج بھی اصفہان کو کافی اہمیت حاصل ہے اور واقعی اصفہان آج بھی بہت خوبصورت ہے ہرے بھرے باغات اور سڑکوں کے درمیان خوبصورت راہداریاں شہر کے حسن میں کافی اضافہ کرتی ہیں۔ ہم لوگ سب سے پہلے میدان شاہ جواب میدان امام کے نام سے جانا جاتا ہے، گئے۔ یہ جگہ دراصل چاروں طرف اونچی دیواروں اور عمارتوں سے گھری ہوئی ہے اور درمیان میں ایک کشادہ میدان ہے۔ اسی میں علی قاپو، مسجد لطف اللہ اور مسجد شاہ موجود ہے۔ علی قاپو دراصل اس عمارت کو کہتے ہیں جہاں قاچار بادشاہ اپنی رعایا سے ملنے یا ان کی فریاد سننے کے لیے مسند افروز ہوتے تھے۔ دلی کے لعل قلعہ میں دیوان عام کی طرح ہے۔ مسجد لطف اللہ/ مسجد شاہ بہت ہی عالی شان عمارت ہے۔ دور سے ہی اس مسجد کو دیکھ کر اس کی شان وشکوہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ دیوار سے لے کر گنبد تک ہر جگہ کاشی کاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس مسجد کی کاشی کاری اپنی تعمیر اور رنگ وروپ میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اس وقت کے آرٹ اور اور فن عمارت سازی کا سب سے بڑا نمونہ یہ مسجد ہے۔ اس مسجد میں درمیان کے گنبد کے ٹھیک نیچے ایک نشان بنا ہوا ہے۔ اس جگہ سے اگر آپ اذان دیں یا کوئی آواز بلند کریں تو پوری مسجد اور اس کے احاطے میں اس کی آواز سنی جا سکتی ہے۔ بالکل ایسی آواز جو ایک پاورفل مائک اور ایکو کی آواز ہوتی ہے۔ اس کے اردگرد قدیم طرز کے بازار ہیں جو وہاں کے قدیم فن اور صنعت وحرفت کو پیش کرتے ہیں۔

اس کے بعد ہم لوگ جلفا کے علاقے خیابان حکیم تکائی میں کلیسا دیکھنے گئے۔ یہ شاہ عباس کے دور کی بات ہے کہ انھوں نے ارمن عیسائی تاجروں کو تجارت کے لیے بلایا تھا بعد میں انھیں یہ علاقہ دیا گیا تاکہ وہ اپنی عبادت کے لیے کلیسا تعمیر کر سکیں۔ بادشاہ وقت نے ان کی کلیسا کی تعمیر کے لیے کافی امداد بھی دی اور ایک بڑا علاقہ ان کو دیا جہاں آج بھی عیسائیوں کی آبادی ہے۔ اس گرجا کا طرز تعمیر اسلامی طرز تعمیر سے بھی ملتا جلتا ہے۔ اس کلیسے کے اندر ہال میں گنبد اور در دیوار پر مصوری کے ذریعے مسیحیت کی پوری تاریخ کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یروشلم میں واقع بیت اللحم کے طرز پر اس کی مصوری کی گئی ہے اور میوزیم میں ارمنی زبان میں مسیحیت اور تہذیب و تمدن کی کتابیں اور اشیاء موجود ہیں۔ پادریوں کے لباس اور ان کی ٹوپیاں جو زیادہ تر ہندستان سے بن کر گئیں تھیں وہ بھی موجود ہیں اس کے علاوہ انجیل کے نادر نسخے ارمنی زبان اور فارسی زبان

میں یہاں موجود ہیں۔قرآن کے بھی کئی نسخے ہیں۔اس میوزیم میں ترکی کا ایک بڑا نقشہ بھی لگایا گیا ہے جس میں ترکی کے شہروں کے علاوہ وہاں کی مساجد خاص کر آیا صوفیہ اور توپ کاپی وغیرہ۔ دراصل ارمینیوں کا ماننا ہے کہ ترکی نے ان کی نسل کشی کی ہے اس لیے اس نقشے کے بازو میں ہی ایک بڑے سے برتن میں لوگوں کی ہڈیاں جمع کی گئی ہیں جو دراصل ترکی سے مسیحیت کے ختم ہونے کی کہانی کو بیان کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ اصفہان میں زائیدہ روداوراس کے کنارے بڑے بڑے باغات دیکھنے لائق ہیں۔اگرچہ زائیدہ رود خشک ہو چکا ہے مگراس کے کنارے آباد شہر کی رونق برقرار ہے۔اسی کے کنارے باغ مشتاق بھی ہے۔اسی باغ میں اسٹھم پوپ کا مقبرہ ہے۔اسٹھم یہ امریکی اسکالر ہے جو ایران آیا اوراس نے فارسی زبان سیکھنے کے بعد پرشین آرٹ پر سب سے مستند کتاب لکھی جو کئی جلدوں میں موجود ہے۔ اسی کی کوششوں سے اور اسی کی تحریر سے فارسی آرٹ اور کلچر دنیا میں متعارف ہوا۔ یہ ایران میں ہی بس گیا تھا۔اس کی خواہش تھی کی کہ ایران میں ہی مرے اور مرنے کے بعداسی زائیدہ رود کے کنارے دفن ہو۔سواس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس وقت کی حکومت نے اس کی موت کے بعد باغ مشتاق میں دفن کردیا تھا۔اس کی بیوی کی قبر بھی اسی مقبرے میں ہے۔لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے متعلق وہاں کے لوگوں کو معلوم نہیں ہے یہاں تک کہ اسی کی پاس کھڑی ہوئی ٹورسٹ پولیس کو بھی اس مقبرے کے بارے میں معلومات نہیں تھی۔

اب شام ہونے لگی تھی اور چھ بجے اصفہان یونیورسٹی جانا تھا جہاں کئی پروفیسران سے ملاقات طے تھی۔ان میں سے شعبہ زبان خارجی میں عربی کی پروفیسر ڈاکٹر نرگس گنجی اور پروفیسر مہدی نوریان جو فارسی زبان کے استاد ہیں اور سبک ہندی کے لیے معروف ہیں۔ان کے علاوہ سوشل سائنس کے کئی اساتذہ سے ملاقات ہوئی اور تبادلہ خیالات ہوا۔ ہندوایران کے درمیان تعلیمی لین دین کے حوالے سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔مرکز زبانہائے خارجی میں اردو کی تعلیم کے حوالے سے بات بھی ہوئی۔ کچھ دنوں قبل تک وہاں اردو کا باضابطہ ایک شعبہ تھا جو ابھی بند ہے لیکن اب نئے سرے سے شعبے کے قیام پر کارآمد گفتگو ہوئی۔انشااللہ عنقریب وہاں اردو کا شعبہ قائم ہو جائے گا۔اس یونیورسٹی کی تاریخ یہ ہے کہ یہ اصفہان میں خربوزے کی کاشت کی زمین تھی اور

یہاں کا خربوزہ پورے ایران میں سب سے زیادہ لذیز ہوتا تھا۔ آج جس مقام پر یونیورسٹی واقع ہے یہاں کبھی ہر طرف کبوتر خانے ہوا کرتے تھے۔ کاشت کار کبوتروں کی بیٹ کا استعمال کھاد کے طور پر کرتے تھے۔ یہاں کے خربوزے کی مٹھاس اور لذت کا یہی راز تھا۔ انھیں کسانوں کے بچے جب پڑھ لکھ گئے اور تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ہوا تو انھوں نے اس زمین کو یونیورسٹی کے لیے وقف کر دی۔ اب آج یہاں ایران کی مشہور یونیورسٹی اور سب سے خوبصورت یونیورسٹی کیمپس ہے۔

10 جولائی 2011 کی رات کو ہی ہمیں اصفہان سے تہران کے لیے نکلنا تھا۔ اس لیے ہم لوگ اصفہان یونیورسٹی سے سیدھے ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ اب تک رات کے نو بج چکے تھے۔ مندنا خانم اور ان کے بھائی اب تک ہمارے ساتھ تھے۔ ان کی ضد تھی کہ ہمارے ساتھ وہ اس وقت تک رہیں جب تک ٹرین روانہ نہ ہو جائے۔ مگر ڈاکٹر اختر حسین نے بااصرار تمام انھیں منع کیا اور وہ ہم سے رخصت ہوئے۔ تقریباً دس بجے ہم ٹرین پر سوار ہوئے اور علی الصباح تہران پہنچ گئے۔ خیابان سعدی میں ہم لوگوں نے پہلے ہی ہوٹل بک کرالیا تھا۔ وہاں ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد شیوا اور طحیٰ سے مسجد شاہ میں ملنا طے پایا۔ یہ قاچاری دور کی مسجد ہے اسی کے ارد گرد ایران کا بازار بزرگ ہے جہان ہر طرح کی چیز مناسب قیمت پر مل جاتی ہے۔ یہ بازار قدیم ایرانی بازار کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ یہ بازار ترکی کے اسپائس بازار سے بڑی مماثلت رکھتا ہے۔ اسی علاقے میں قاچار بادشاہوں کے محل ہوا کرتے تھے۔ کاخ گلستاں، شمس العمارہ اور دارالفنون کی شکل میں یہ آج بھی موجود ہیں۔ تہران کا یہ پوار علاقہ پائین شہر کا علاقہ ہے۔ یہاں آج بھی قدیم طرز کی عمارتیں ہر جگہ موجود ہیں۔ شہر کا بالائی حصہ ذرا اس سے مختلف ہے۔ یہاں جدید طرز کی عمارتیں بھی موجود ہیں۔ تہران کوہ دماوند کے نشیب میں آباد ہے۔ کوہ دماوند کے سائے میں آباد بالائی حصہ اعلیٰ طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہاں کے بازار کا نام تجریس ہے جہاں نئے طرز کی دکانیں موجود ہیں جو جدید طرز زندگی کے تقاضے کو پورا کرتی ہیں۔ یہاں پر مشہور مرکز لغت نامہ جو فارسی مطالعات کا مرکز ہے، واقع ہے۔ یہ غیر ملکی لوگوں کے لیے فارسی کی تعلیم کے لیے ہے۔ تہران کا یہ بالائی حصہ باقی تہران سے بالکل الگ لگتا ہے۔ شہر کو اتنی خوبصورتی سے بسایا گیا ہے کہ کوہ دماوند سے برف پگھل کر شہر کی طرف پانی کی شکل میں آتا ہے۔ اس پانی کو سڑک کی دونوں جانب کیاریوں میں

بانٹ دیا گیا ہے۔ دور دور تک چنار کے درخت کو سیراب کرتا ہوا پائین شہر تک یہ پانی پہنچتا ہے۔ بہت سلیقے سے کیاریاں بنائی گئی ہیں اور چنار کے درخت اس کو مزید حسن عطا کرتے ہیں۔ اس سے ذرا نیچے اترنے پر ایک مشہور ریستوراں ہے جس کا نام شاطر عباس ہے جو ایک قاچاری دور کے امی شاعر شاطر عباس صبوحی امی قمی کے نام پر ہے۔ یہاں ہم لوگوں نے انتہائی لذیز کھانے کا لطف اٹھایا۔ یہاں کی ایک خاص روٹی جسے تافتون کہتے ہیں جو میز پر گرم گرم رکھ دی جاتی ہے۔ کھانے میں بڑی لذیز ہوتی ہے۔ یہ ریستوراں ونک کے علاقے میں واقع ہے۔ اس سے نیچے اترنے پر ہندستان کا سفارتخانہ جو میر داماد کے علاقے میں ہے۔ یہاں ہمارے دوست عبدالسمیع اس وقت فارسی آفیسر کے عہدے پر سفارت خانے میں تھے۔ ان علاقوں کی سیر کے بعد ہم ان سے ملنے سفارتخانہ پہنچے۔ ان سے ملاقات ہوئی اور دیر تک ہندستان اور ایران کے حوالے سے باتیں ہوتی رہیں۔ طے یہ تھا کہ شام کی چائے کے بعد ہم رخصت ہو جائیں گے لیکن سمیع صاحب ہمیں رات کے کھانے کے لیے اپنے گھر لے گئے۔ دیر رات تک گفتگو ہوتی رہی۔ ان سے گفتگو کے دروان میں نے یہ محسوس کیا کہ آپ غیر ملک میں کتنے ہی بڑے عہدے پر کیوں نہ فائز ہوں، وطن کی یاد خوب آتی ہے۔ سمیع صاحب سے مل کر کئی موضوعات پر باتیں ہوئیں اور کئی اہم انکشافات بھی ہوئے۔ جیسے پورے ایران میں کوئی سنی مسجد نہیں۔ شاید سیستان اور بلوچیستان کے علاقے میں جہاں سنیوں کی کچھ تعداد ہے۔ وہیں سنیوں کی مسجدیں ہیں اس کے علاوہ اور کہیں نہیں ہیں۔ دیر رات گئے ان سے رخصت ہو کر ہوٹل آئے۔ صبح سویرے تہران ائیر پورٹ سے دبئی کے لیے روانہ ہو گئے۔

چونکہ دبئی راستے میں تھا اس لیے ہم لوگوں نے سوچا کہ کیوں نہ دو دن کے لیے دبئی میں بھی قیام کیا جائے۔ اس لیے ہم نے پہلے ہی ویزا لے لیا تھا۔ ہمارا ہوٹل بھی بک تھا۔ تقریباً دو بجے ہم دبئی پہنچے۔ ہوٹل سے ہمارے لیے گاڑی آ گئی تھی۔ بر دبئی کے علاقے میں یہ ایڈمرل پلازہ ہوٹل تھا۔ دبئی کا بڑا نام سنا تھا دیکھا تو حیرت ہوئی اور افسوس کہ یہ پورا ملک تو سوائے بازار کے اور کچھ نہیں۔ ہر طرف بازار، بڑے بڑے مال اور تجارتی ادارے۔ ایک عرب ملک کو تجارتی نقطہ نظر سے اتنا لبرل دیکھ کر خوشی ہوئی لیکن اس خوشی سے زیادہ افسوس اور صدمہ ہوا کہ اس سے عرب کلچر تو تباہ ہو گیا اور اس اکنومی کا فائدہ مسلمانوں کے علاوہ ہر کوئی اٹھا رہا ہے۔ مسلمان بس خدمت گار اور نیچے

درجے کے ملازم ہیں۔ کچھ مسلمان بڑے تاجر ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ آپ پورے دبئ میں کہیں بھی جائیں اردو میں بات کریں کہیں پریشانی نہیں ہوگی۔ اردو یہاں کی دوسری رابطے کی زبان ہے۔ دبئ میں موسم بہت گرم تھا لیکن ہر جگہ اے سی کی سہولت تھی بس، ٹرین اور بس اسٹینڈ بھی اے سی تھا۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے مال جیسے دبئ مال، ابن بطوطہ مال، امارات مال۔ ہر جگہ جیسے دولت بکھری پڑی ہو۔ یہاں ہر طرف دولت کا ہی سماں دیکھنے کو ملا۔ برج خلیفہ اور برج عرب یہ سب دولت کے تماشے نظر آئے۔ صرف ایک چیز قابل ذکر ہے کہ ابن بطوطہ مال میں عربی تہذیب کی کچھ جھلک نظر آتی ہے۔ درو دیوار پر مصری تہذیب کی نقاشی، اور قدیم عربی طرز کی زندگی کے کچھ نمونے جابجا دکھانے کی کوشش کی گئی ہے وگرنہ آپ پورے دبئ میں گھوم جائیں عرب سے زیادہ یوروپی کلچر حاوی ہے۔ اس کے علاوہ جو سب سے اچھی بات اس مال کی لگی وہ یہ ہے کہ یہاں عرب لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ ان کی اپنی دکانیں ہیں۔ وہ بڑے اعتماد سے پردے کے اہتمام کے ساتھ اپنا بزنس کر رہی ہیں۔ ہم نے کئی ایسی دکانوں میں ایسی لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھا۔ ان میں بعض سے ہم لوگوں نے سوال بھی کیے کہ ایک عرب لڑکی کو اس کی اجازت ہے؟ کیا وہ اسے وہ باعث عار نہیں سمجھتیں۔ اس کے جواب میں ایک لڑکی نے کہا کہ میں شادی شدہ ہوں اور میرے شوہر کو اس سے کوئی پریشانی نہیں۔ دوسرے نے کہا کہ میں شادی شدہ نہیں لیکن میرے گھر کے لوگوں کو اس سے کوئی اعتراض نہیں۔ دونوں خواتین نے کہا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے اور عرب عورتیں بھی دنیا کو دیکھ رہی ہیں۔ ہم نے حیرت سے ان سے پوچھا کہ کیا یہ پورے عرب کی حالت ہے تو انھوں نے بتایا کہ یہ یونائیٹڈ عرب امارات کی بات ہے۔ یہاں تبدیلیاں آرہی ہیں اور لوگ نئے زمانے کے تقاضے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ لڑکیاں مکمل حجاب میں تھیں اور انگلش میں ہم سے باتیں کر رہی تھیں۔ دبئ میں دو دن کے قیام کے بعد ہم ہندستان آگئے۔

ایران کا دوسرا سفر

2013 میں ہوا۔ شعبۂ اردو تہران یونیورسٹی میں ہماری شاگردہ فرزانہ اعظم لطفی نے ایران کے مشہور شہر قم کی یونیورسٹی میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس شہر کو 'شہر معصومہ' بھی کہا جاتا ہے۔ کانفرنس کے پہلے دن ہم نے معصومۂ قم کی زیارت کی اور شہر کے کچھ حصوں کو دیکھا۔

کانفرنس میں کئی زبانوں اور کئی ملکوں کے لوگ شریک تھے۔ بہت سے ادیبوں، اساتذہ اور طلبہ و طالبات سے ملنے کا موقع ملا۔ اس سفر میں پہلے سے ارادہ تھا کہ شیراز جانا ہے کیونکہ حافظ و سعدی اسی شہر سے تھے اور ان کے مزارات بھی اسی شہر میں ہیں۔ فرازنہ چونکہ مصروف تھیں اس لیے وہ ساتھ تو نہیں جاسکتی تھی اور وفا نے بھی شرکت نہیں کی تھی مگر ایک مہربانی کی کہ انھوں نے اپنی شاگردہ نگین جو شیراز میں ہی مقیم تھیں۔ ان سے ہمارے بارے میں بتایا اور یہ گزراش کی کہ وہ ہمیں شیراز دیکھائیں۔

کانفرنس کے بعد قم سے بس کے ذریعے ہم رات کو روانہ ہوئے۔ صبح کو وقت پر بس شیراز پہنچ گئی۔ ہمارے پاس نگین کا نمبر تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ بس اسٹینڈ پر ہمیں مل گئیں۔ نگین کو ہمیں پہچاننے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ انھوں نے سلام کے بعد اردو میں باتیں شروع کیں۔ انھیں دیکھ کر سکون ملا۔ نگین نے قلب شہر میں ایک ہوٹل بک کرادیا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوکر پہلے دن ہم پرسپولیس گئے۔ یہ مقام قدیم ترین تاریخ کا نمونہ ہے۔ اس کی تفصیلات 'ارنا' نے اس طرح لکھا:

> ''ایران کی ہخامنشی سلطنت کے حکمرانوں کا عظیم الشان دارالسلطنت تخت جمشید جو صوبائی دارالحکومت شیراز سے چالیس میل شمال مشرق میں واقع ہے۔ شاہی محلات کے کھنڈرات بھی قدیم فن تعمیر کا بہترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔ یہاں سے متعدد قدیم پتھروں کے مجسمے، زیورات، نوادرات، برتن وغیرہ کھدائی کے دوران میں برآمد ہوئے ہیں۔ تخت جمشید 25 صدی سے پہلے ایرانی بادشاہ داریوش کبیر کے دور میں میترا نامی پہاڑ کے مغربی کنارے میں تعمیر کیا گیا جس کی ساخت میں بڑی تعداد میں آرٹسٹ، فنکاروں، دستکاری کرنے والے، کارکنوں، مردوں اور خواتین نے شرکت کی۔ 120 سال عرصے گزر جانے کے بعد تخت جمشید کی ساخت مکمل ہوگیا۔ تخت جمشید کے محلوں کا کل رقبہ 125 ہزار میٹر کیوبک ہے جو رسمی اور سرکاری محل، خصوصی چھوٹے محل، بادشاہ کا خزانہ،

حفاظتی قلعہ، پلیٹ فارم کے داخلہ سیڑھی اور خشایارشاہ کے دروازے کے مختلف حصوں پر شامل ہے۔خشایارشا کے شاندار محلات کے جو کھنڈرات تخت جمشید میں ملے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان محلوں میں وسیع دربار ہال تھے جن میں عظیم اور بلند ستون استعمال کیے جاتے تھے اور ہال کے سامنے بارہ دریاں ہوتی تھیں جن میں چوکور ستون ہوتے تھے۔محلوں تک پہنچنے کے لیے زینوں کے دوہرے سلسلے ہوتے تھے۔آپادانا نامی محل تخت جمشید کے سب سے پرانی محل ہے جو داریوش کبیر کے حکم کے تحت بنایا گیا ہے جس سے نوروز کی تقریبات اور غیر ملکی مہمانوں کے استقبال کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔داریوش کبیر بادشاہ نے آپادانا محل کے علاوہ تچر یا تچرا محل کی ساخت کے حکم کو دے دیا جسے ان کو خصوصی محل تھا۔سکندر اعظم نے 330 سال سے پہلے دارا سوم کو شکست دے کر اس شہر کو آگ لگا دی اور ویران کر دیا۔عالمی ثقافتی ادارہ یونسکو نے 1979 میں تخت جمشید کو عالمی تاریخی ورثہ قرار دیا ہے۔''

تخت- جمشید -ایران- کا- تاریخی-اور-سیاحتی

https://ur.irna.ir/news/3645705/مقام

آزاد دائرۃ المعارف نے اس کی تاریخ یوں بیان کی ہے:

''ہخامنشی سلطنت (قدیم فارسی: ہخامنشیہ) 559 قبل مسیح سے 338 قبل مسیح تک قائم ایک فارسی سلطنت تھی جو عظیم ایرانی سلطنتوں کے سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ہخامنشی مملکت میں موجودہ ایران کے علاوہ مشرق میں موجودہ افغانستان، پاکستان کے چند حصے، شمال اور مغرب میں مکمل اناطولیہ یعنی موجودہ ترکی، بالائی جزیرہ نما بلقان (تھریس) اور بحیرہ اسود کا بیشتر ساحلی علاقہ شامل تھا۔مغرب میں اس میں موجودہ عراق، شمالی سعودی عرب، فلسطین (اردن، اسرائیل اور لبنان) اور قدیم مصر کے تمام اہم مراکز شامل تھے۔مغرب میں اس کی سرحدیں

لیبیا تک پھیلی ہوئیں تھیں۔ 7.5 ملین مربع کلومیٹر پر پھیلی ہخامنشی سلطنت تاریخ کی وسیع ترین سلطنت تھی اور آبادی کے لحاظ سے رومی سلطنت کے بعد دوسری سب سے بڑی سلطنت تھی۔ یہ سلطنت 330 قبل مسیح میں سکندر اعظم کے ہاتھوں ختم ہوگئی۔ سلطنت کا پہلا حکمران کورش اعظم یا سائرس اعظم تھا جبکہ دارا سوم اس کا آخری حکمران تھا۔ ہخامنشی سلطنت کا دارالحکومت پرسیپولس یعنی تخت جمشید تھا جبکہ آتش پرستی ریاستی مذہب تھا۔"

https://www.wikiwand.com/ur/سلطنت_ہخامنشی

عزیزی نگین کے ہم بہت شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس تاریخی مقام کی سیر کرائی۔ نگین اس وقت اردو سے ایم۔اے کر رہی تھیں۔ (اب وہ دانتوں کی ڈاکٹر ہیں) نگین نے ہمیں اس کے علاوہ شیراز شہر کے باغات اور قلعوں کی سیر کرائی۔ ایرانیوں کی تعریف کرنی ہوگی کہ انھوں نے باغات کو بہت سلیقے سے ڈیولپ کیا ہے۔ اسی شام ہم حافظ شیراز اور شیخ سعدی کے مزارات پر گئے۔ شیخ سعدی کے مزار کا احاطہ بہت خوبصورت ہے اور احاطے میں شہتوت کے درخت لگے ہوئے ہیں۔ حافظ شیراز کے مزار پر نسبتاً زیادہ بھیڑ تھی۔ یہ وہ دو شخصیات ہیں جن کے سبب ساری دنیا میں ایران جانا جاتا ہے۔ ہم نے بھی حافظ وسعدی کو خوب پڑھا تھا اور اب ان کے مزارات پر جانے کا اتفاق ہوا۔

شیراز سے واپسی پر ہم ڈاکٹر مندنا خانم کی دعوت پر ان کے گھر قزوین گئے۔ وہ تہران میں آزاد یونیورسٹی، تہران میں استاد ہیں۔ (ان کا تذکرہ پہلے بھی آچکا ہے اور اب وہ اپنی پی ایچ ڈی مکمل کر کے ایران میں آزاد یونیورسٹی میں استاد ہیں) اس وقت وہ قزوین شہر میں مقیم تھیں۔ انھوں نے کسی ہوٹل میں رکنے نہیں دیا بلکہ اپنے گھر پر روکا اور خوب ضیافت کی۔ انھیں معلوم تھا کہ ہم کئی دنوں سے ایران میں ہیں اس لیے انھوں نے ہمارے لیے گھر میں ہندستانی کھانا پکایا۔ ان کے شوہر محمد اور بیٹی مترا سب نے مل کر ساتھ کھانا کھایا۔ ان کی بیٹی ابھی ابھی ڈاکٹر بنی تھیں اور امریکی یا کسی یوروپی ملک میں مزید تعلیم کے لیے جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ رات ہی پروگرام بن گیا تھا کہ صبح کو بحر خزر دیکھنے جائیں گے۔ تقریباً دو سو کیلومیٹر کی دوری تھی۔ ان کی بیٹی کار ڈرائیو کر رہی تھیں۔ ان کے ساتھ جب ہم گیلان شہر میں داخل ہوئے تو بہت خوشی ہوئی کہ یہی وہ شہر جس کا

تعلق حضرت غوث اعظم سے ہے۔ بڑی عقیدت سے اس سرزمین کو دیکھا۔لیکن جب ان سے تفصیلات معلوم کی تو انھیں غوث اعظم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ اس شہر میں ہیں لیکن کس علاقے سے غوث اعظم کا تعلق تھا یہ نہیں جان سکے۔اس کے بعد بحر خزر کے کنارے چائے کافی پی اور مرداب جھیل کے لیے محمد (مندنا خانم کے شوہر) نے کشتی لی۔ یہ وادیٔ لولاب بھی کہلاتا ہے۔جھیل کے درمیان لالے کے رنگ برنگے پھول دعوت نظارہ دے رہے تھے۔تفریح سے فارغ ہوکر ایک ریسٹورینٹ میں گئے جہاں اپنی پسند کی تیرتی ہوئی مچھلیوں کا انتخاب کیا۔ یہاں کی مچھلیاں بہت مشہور ہیں۔ ہم ابھی گفتگو کر ہی رہے تھے کہ بیک کی ہوئی مچھلیاں ہمیں پیش کی گئیں۔اس طرح مچھلی کھانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ دیر رات کو ہم قزوین واپس ہوئے اور دوسرے دن مندنا خانم کے ساتھ تہران آ گئے۔

تہران میں ڈاکٹر فرزانہ لطفی نے ہمارے قیام کے لیے بنیادِ سعدی میں انتظام کیا تھا۔ایک دن یہاں رکے۔ہمیں شعبۂ اردو تہران۔ یونیورسٹی میں خصوصی لیکچر کے لیے بلایا گیا۔تمام اساتذہ اور طلبہ وطالبات موجود تھے۔ گفتگو کے بعد سوال و جواب کا بہت ہی کارآمد سیشن ہوا۔اختتام پر معلوم ہوا کہ اس شعبے میں آنے والے ہم پہلے ہندستانی ہیں ۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔تہران میں اردو کا یہ بڑا شعبہ ہے جہاں کئی دہائیوں سے اردو کی تعلیم ایم۔اے کی سطح تک دی جاتی ہے۔ڈاکٹر علی بیات، ڈاکٹر کیومرثی، ڈاکٹر علی کاوسی جو یہاں اردو کے استاد ہیں ان سے پہلی دفعہ یہیں ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر فرزانہ اور ڈاکٹر وفا سے ہماری پہلے ہی سے ملاقات تھی۔ان تمام یادوں کے ساتھ ہم ہندستان واپس آئے مگر ان سے علمی اور ادبی رشتہ ہمیشہ برقرار ہے۔

○○○

یورپ کے اسفار کی ناقابل فراموش یادیں

یورپ کو کسی نہ کسی بہانے اکثر سننے کو ملا ہے۔ یورپ کو ترقی کا اشاریہ سمجھا جاتا ہے۔ براعظم یورپ میں کئی چھوٹے بڑے ممالک ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے یہ ہندستان سے بہت کم ہے۔ لیکن یورپی ممالک نے جس طرح ترقی کی ہے وہ قابل رشک ہے۔ یہاں کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی بالکل مختلف ہے۔ لیکن ان ممالک کے اثرات تیسری دنیا کے ممالک پر بہت زیادہ مرتب ہوئے ہیں۔ اسی لیے تحریر وتقریر میں یورپ کا ذکر اکثر و بیشتر ہو ہی جاتا ہے۔ خاص طور پر ہندستان کی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ پڑھتے پڑھاتے وقت اثر پذیری کے حوالے سے یورپ یا مغربی ممالک کا ذکر لازمی طور سے آتا رہا ہے۔ اسی لیے بڑی خواہش تھی کہ یورپ کو قریب سے دیکھا جائے۔ کئی بار موقع ملا مگر کسی نہ کسی مجبوری کے تحت نہیں جا سکا۔

وآسا، ہیلسنکی (فن لینڈ)

اس بار مئی 2014 کے اواخر میں ایک سیمنار میں شرکت کی غرض سے یورپ کے تین ممالک فن لینڈ، جرمنی اور سوئٹزر لینڈ جانے کا اتفاق ہوا۔ سیمنار فن لینڈ کے انتہائی پُرسکون اور خوبصورت شہر وآسا میں تھا۔ شہر کے نام پر ہی یونیورسٹی ہے جو یونیورسٹی آف وآسا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس یونیورسٹی کو فن لینڈ میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ یہاں کی قدیم یونیورسٹی ہے جو سمندر کے کنارے واقع ہے۔ انتہائی خوبصورت اور پرفضا مقام ہے۔ پڑھنے لکھنے کے بجائے اگر اس جگہ کو تفریحی مقام کے طور پر بھی ترقی دیا جاتا تو شہر کی آمدنی کا یہ بہت بڑا ذریعہ ہوتا لیکن اسے تعلیمی جگہ

بنا کر حکومت نے ایک مثال قائم کی ہے۔موجودہ وآسا یونیورسٹی پہلے اس میں سوتی مل تھا لیکن اب اس پورے علاقے اور عمارت کو یونیورسٹی کو وقف کر دیا گیا ہے۔آج بھی اس قدیم عمارت کو اسی طرح برقرار رکھا گیا ہے جس میں ٹکنالوجی اور انجینئرنگ کے شعبے ہیں۔ساتھ ہی نئی عمارتیں بنائی گئی ہیں جو قدیم وجدید عمارت کی خوبصورت مثال ہے جس میں دیگر علوم وفنون اور زبانوں کے شعبے ہیں۔اسی یونیورسٹی میں سہ روزہ بین الاقوامی سیمنار کا اہتمام کیا گیا تھا۔سیمنار کا موضوع ''تہذیب،اقدار اور عدل'' تھا جس میں 17 ممالک کے مندوبین شریک تھے۔دہلی سے میرے محترم دوست ڈاکٹر رضوان الرحمان شریک سفر تھے۔اس سیمنار میں مختلف موضوعات کے تحت مقالے پڑھے گئے۔زیادہ تر مقالوں میں عالمی سطح پر رونما ہونے والے تہذیبی اور اقداری مسائل زیر بحث رہے۔کئی مقالوں میں میڈیا کی بڑھتے اثر ورسوخ،سماج،سیاست،تمدنی اور تہذیبی زندگی پر حاوی ہونے والے عناصر کو مستقبل کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی اور اس خدشے کا بھی اظہار کیا گیا کہ کہیں آنے والے دنوں میں میڈیا ہی سب کچھ نہ طے کرنے لگے۔میڈیا کے پرائیوٹ ادارے جو مالی منفعت کے لیے اب کام کر رہے ہیں۔ان کے اثرات سے اب کسی بھی طرح بچنا ناممکن ہو گیا ہے۔ایک امریکی خاتون پروفیسر نے میڈیا ہاؤسیز کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا کو بھی اسی زمرے میں رکھا اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ اگر ان کے اثرات اور حاوی ہونے والے رجحان کو نہ سمجھا گیا تو مستقبل میں سماج،سیاست اور تہذیب کی باتیں سننے والے بھی شاذ و نادر ملیں گے۔مجموعی طور پر اس سیمنار میں الگ الگ ملکوں کے مندوبین نے عہد حاضر کی تہذیبی کشاکش کو ہی مدنظر رکھا۔ہندستان سے کل چار افراد تھے تین جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے اور ایک جامعہ ملیہ اسلامیہ سے۔ان کے مقالے بھی اسی طرح کے موضوعات پر مبنی تھے۔اس سیمنار میں شریک ہونا میرے لیے کئی اعتبار سے اہم رہا۔یورپ کے تعلیمی اور تدریسی نظام کو دیکھنے کا قریب سے موقع ملا اور بہت کچھ سیکھنے کو بھی ملا۔عام طور پر ہم لوگ سیمناروں میں مقالہ نگاروں کا بہت کم وقت دیتے ہیں اور جب مقالہ پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں تو پہلے ہی اختصار کی درخواست بھی کر لیتے ہیں۔یہاں ہر مقالہ نگار کو آدھے گھنٹے کا وقت مقالے کے لیے اور پندرہ منٹ کا وقت

سوال و جواب کے لیے دیا گیا تھا۔ تین دنوں تک نئے نقطہ نظر اور زاویہ نظر کو سننا یقیناً ایک کارآمد مشغلہ رہا۔ اسی بہانے یورپ کا سفر بھی ہوا۔ یہ سفر ڈاکٹر رضوان صاحب کی وجہ سے زیادہ آسان اور بامعنی رہا۔ ڈاکٹر رضوان جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں میرے رفیق کار ہیں اور وہ عربی زبان و ادب کے استاد ہیں۔ ان کی ہمرہی نہ صرف سفر کو آسان بناتی ہے بلکہ وہ ایک اچھے رہنما کی ذمہ داری بھی نبھاتے ہیں۔ جب وہ سفر میں میرے ساتھ ہوتے ہیں تو مجھے کسی چیز کی فکر نہیں ہوتی کہ انتظامات کیسے کرنے ہیں سفر کا روٹ کیسے طے کرنا ہے۔ کس ملک میں کہاں اور کس ہوٹل میں رکنا ہے۔ وہ سب کچھ گھر بیٹھے انٹرنیٹ پر ساری بکینگ کرا لیتے ہیں۔ اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا ایک تو عدیم الفرصتی اور دوسرے ان کے تجربے پر بھروسہ کر کے میں نے سب انھیں پر چھوڑ دیا۔ ویزا سے متعلق بیشتر کارروائی کو انھوں نے ہی مکمل کیا اور بڑی آسانی سے ہم لوگوں کو شینگن ویزا (ShenganVisa) مل گیا۔ اس ویزے کا مطلب یہ ہے کہ ایک ویزے سے یورپی یونین میں شامل تمام ممالک میں جا سکتے ہیں۔ اتفاق سے ہم لوگوں کو ملٹی انٹری ویزا مل گیا تھا اگر ہم چاہتے تو چند ہفتوں میں تمام ممالک کی سیر کر سکتے تھے۔ لیکن نہ تو اتنا وقت تھا اور نہ ہی اتنے پیسے تھے اس لیے ہم لوگوں نے چھٹیوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تین ملکوں کو دیکھا۔ ڈاکٹر رضوان نے گیارہ دن کے سفر کو اس طرح ترتیب دیا کہ فن لینڈ، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ تینوں ملکوں میں کہیں کسی طرح کی پریشانی نہیں ہوئی۔

19 مئی 2014 کی دوپہر کو ائیر انڈیا کی فلائٹ سے ہم لوگ فرینک فرٹ کے لیے روانہ ہوئے ساڑھے سات گھنٹے کی ائیر انڈیا کی ڈریم لائنر فلائٹ کافی آرام دہ تھی۔ کچھ وقت گفتگو میں اور کچھ وقت سوتے اونگھتے کٹ گیا۔ جرمنی کے وقت کے مطابق ساڑھے چھ بجے شام ہم لوگ وہاں پہنچ گئے۔ یہاں سے ہیلسنکی کی فلائٹ لینی تھی جو شام کے ساڑھے نو بجے تھی۔ شام اس لیے کہ یہاں مغرب کا وقت ہی یہی تھا۔ سید اقبال حیدر صاحب سے کناڈا کے ہمارے مہربان ڈاکٹر سید تقی عابدی نے تعارف کرایا تھا۔ سفر سے ایک ہفتے پہلے ہی ان سے فون اور میل کے ذریعے رابطہ رہا۔ ہم لوگوں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ فرینکفرٹ ائیر پورٹ پر ملاقات ہوگی۔ پاسپورٹ کنٹرول سے گزرنے کے بعد ہم لوگ طے شدہ جگہ پر پہنچے جہاں اقبال صاحب ہمارے منتظر

تھے۔ بڑے تپاک سے انھوں نے ہمارا استقبال کیا۔ان سے مل کر ایسا محسوس ہوا کہ ہم پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔انھوں نے ائیر پورٹ پر ہم لوگوں کی خاطر مدارات کی اور دیر تک ہم لوگ ہندستان، پاکستان اور یورپ کی ادبی سرگرمیوں پر گفتگو کرتے رہے۔ پھر ائیر لفتھانسا سے ہیلسنکی کے لیے روانہ ہوئے۔ساڑھے تین گھنٹے کی اس فلائٹ میں نیند کا غلبہ ضرور تھا مگر ونڈو سیٹ ملنے کی وجہ سے میں باہر کی طرف ہی مسلسل دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔سورج غروب ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے مگر مکمل طور پر تاریکی نہیں ہوئی تھی مغرب کی سمت میں آسمان پر ایسی لالی تھی جیسے ابھی ابھی سورج غروب ہوا ہو۔ یہ منظر دیکھ کر رضوان صاحب سے میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ نارتھ کا علاقہ ہے جو ورلڈ میپ میں کافی اونچائی پہ ہے ان مقامات پر گرمی کے دنوں میں دن بڑے ہوتے ہیں اور رات بہت چھوٹی۔انھوں نے یاد دلایا کہ اسکول کے زمانے میں اکثر سوال پوچھے جاتے تھے کہ اس ملک کا نام بتائیں جہاں کئی مہینوں تک سورج نہیں نکلتا اور کئی مہینوں تک سورج غروب نہیں ہوتا۔ ہم اسی ناروے کے علاقے سے قریب ہیں اور ان کے لیے یہ گرمی کا موسم ہے اسی لیے یہاں یہ نظارہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ خیر ہم رات کے ڈھائی بجے ہیلسنکی ائیر پورٹ پہنچے۔ بیلٹ پر سامان کا انتظار کرتے ہوئے ہم اس خدشے کا بھی اظہار کر رہے تھے کہ ہمارا سامان چونکہ دہلی سے براہ راست یہاں تک کے لیے بک ہوا تھا، پتہ نہیں ملے گا یا نہیں۔لیکن اللہ کا شکر تھا کہ ہمارا سامان بھی آیا۔ بیلٹ سے سامان لے کر نکلتے ہوئے محسوس ہوا کہ یہاں ہر طرف سناٹا ہے۔ ہر شخص اپنا سامان لیے چلا جا رہا ہے۔ جیسے جیسے باہر نکل رہے تھے تمام کاؤنٹر بند پڑے مل رہے تھے۔اس ائیر پورٹ پر رات میں یہ ہماری آخری فلائٹ تھی لیکن حیرت تو اس بات کی تھی کہ ائیر پورٹ پر آنے والے مسافروں کے سوا کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ہم بھی دیگر مسافروں کی طرح باہر نکل آئے ائیر پورٹ کے اس ٹرمینل پر کام کرنے والا ایک شخص بھی ہمیں نہیں ملا۔ یہاں تک کہ کوئی سیکورٹی گارڈ یا پولیس پر بھی نظر نہیں پڑی۔ ہم لوگوں کو دریافت کرنا تھا کہ یہاں سے ہیلسنکی ریلوے اسٹیشن جانے کے لیے بس کہاں سے ملے گی۔ مگر نہ آدمی نہ آدم زاد۔ باہر نکلے تو اچانک بارش شروع ہو گئی۔ خنکی کا احساس شدید ہوتا گیا وہ تو شکر ہے

کہ ہم لوگوں نے گرم کپڑے باہر ہی رکھے ہوئے تھے۔اس وقت تک ہم لوگ دو دفعہ ائیر پورٹ کے اندر باہر کرتے رہے کوئی نہیں ملا۔ باہر نکل کر ٹیکسی ڈرائیور سے معلوم کیا اس نے بتایا کہ یہاں سے ریلوے اسٹیشن جانے کے لیے 50 یورو کرایہ ہے۔یعنی انڈین کرنسی کے مطابق ساڑھے چار ہزار سے زیادہ۔ اگر ہم لوگ اتنی فراخدلی سے خرچ کرنا شروع کر دیتے تو چند ہی دنوں میں جیب خالی ہو جاتی۔ ہم لوگ سفر سے قبل ہی یورپ سے متعلق انٹرنیٹ سے معلومات حاصل کر چکے تھے کہ یورپ میں پبلک ٹرانسپورٹ سستا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رضوان نے بتایا کہ ہم نے انٹرنیٹ پہ دیکھا کہ یہاں سے ریلوے اسٹیشن کے لیے بس جاتی ہے۔اس لیے ہم لوگ بس کے انتظار میں بس اسٹاپ پر کھڑے رہے۔لیکن تیز بارش سے بچنے لے لیے پھر ائیر پورٹ کے اندر چلے گئے۔ پھر وہی ہُو کا عالم، ہم لوگ ادھر ادھر دیکھنے لگے تو کچھ مسافر فرش پر اور کچھ کرسیوں پر سوتے ہوئے نظر آئے۔ ہم لوگوں نے سوچا کہ ہمارے ہندستان میں تو ایسا ممکن ہی نہیں کہ ائیر پورٹ کھلا ہو اور سیکورٹی گارڈ تک نہ ہو۔ یہ یہاں ہی ممکن ہے جہاں لوگ ملک کی پراپرٹی کو بھی اپنا سمجھتے ہیں اور اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔ اگر ہندستان ہوتا تو کئی چیزیں تو لوگ یوں ہی اٹھا کر لے جاتے۔ہم لوگ آپس میں یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ بارش کم ہوئی اور پھر ہم لوگ بس اسٹینڈ پر موجود تھے۔اتنے میں ایک نوجوان ہمارے پاس آیا پہلے تو اس نے انگریزی میں باتیں شروع کیں پھر اردو میں بات کرنے لگا۔ وہ پاکستان کے شہر فیصل آباد سے تھا چند دنوں پہلے ہی وہ ہیلسنکی آیا تھا اور ائیر پورٹ کے قریب ہی کسی ہوٹل میں مقیم تھا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ چہل قدمی کے لیے نکلا تھا مگر وہ ہوٹل کا راستہ بھول گیا تھا۔ ہم لوگ تو بتا نہیں سکتے تھے۔مگر شاید اسے رات میں اور بھی کوئی نہیں ملا ہوگا۔نجانے وہ رات کے وقت اپنے ہوٹل پہنچ سکا ہوگا یا نہیں؟ کیونکہ چند مسافروں کے سوا کوئی دیکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد بس آ گئی اور ہم لوگ 20 منٹ بعد ہیلسنکی ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ پہلی دفعہ دیکھا کہ کوئی ریلوے اسٹیشن رات میں اس طرح مقفل ہوتا ہے۔ چونکہ ہمارے پاس پانچ گھنٹے تھے اس لیے آس پاس ہوٹل میں جگہ تلاش کی تو معلوم ہوا کہ کہیں جگہ نہیں مل سکتی سب پہلے سے فل ہیں۔ اسٹیشن پر چند پولیس والے نظر آئے

انھوں نے بتایا کہ صبح ساڑھے چھ بجے جب اسٹیشن کھلے گا تو آپ وہاں آرام کر سکتے ہیں۔ خیر اسی بہانے ہیلسنکی کی نائٹ لائف کا اندازہ ہوا۔ نوجوان جوڑے ادھر ادھر چہل قدمی کرتے خوب نظر آئے۔ کوئی شراب پی رہا تھا تو بیشتر سگریٹ کا کش لگا رہے تھے۔ ہم لوگ قریب کے میکڈونل میں بیٹھ گئے۔ کچھ کھانے کی چیزیں دیکھیں تو نان ویج کے علاوہ کچھ نہیں مل رہا تھا اور نان ویج کا مطلب تھا حرام۔ اس لیے ہم لوگوں نے کافی پر اکتفا کیا۔ میکڈونل سے نکلنے کے بعد ریلوے اسٹیشن کے پاس ہی ہم بیٹھے۔ کبھی گفتگو کرتے تو کبھی ان آزاد خیال نوجوانوں کو دیکھتے جو دنیا کے غموں سے آزاد سرمستی میں محو تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ایک نوجوان آکر ہمارے برابر بیٹھ گیا اور ہم سے گفتگو کرنے لگا۔ اس کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ کتنا غمزدہ ہے۔ دیگر نوجوانوں کی طرح وہ نہیں تھا وہ اکیلا تھا اور کسی غم میں ڈوبا ہوا تھا لیکن منہ سے شراب کی بو آرہی تھی اور ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ ہم لوگوں نے بے توجہی برتی تو وہ چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک نوجوان اور آیا اور اس نے بڑی سنجیدگی سے گفتگو شروع کی۔ وہ آیا تو تھا لائٹر یا میچ باکس کی تلاش میں تاکہ وہ اپنی سگریٹ جلا سکے مگر جب ہم نے بتایا کہ ہم لوگ سگریٹ نہیں پیتے تو اسے حیرت ہوئی اور چھوٹتے ہی پوچھنے لگا کیا آپ ہندستان سے ہیں؟ ہمیں ہندستانی جان کر وہ خوش ہوا لیکن ہم لوگ تھوڑے سہمے بھی کہیں رات کے اس حصے میں یہ کسی غلط نیت سے نہ آیا ہو۔ مگر یہ رات بھی ایسی تھی کہ تین بجے سے ہی صبح کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ یہ نوجوان ہمارے خدشات سے پرے تھا اس نے اپنے کئی ہندستانی دوستوں کا ذکر کیا۔ ہندستانی نام گنانے کی وجہ سے یقین آیا کہ وہ ہندستان کے بارے میں جانتا ہے۔ پھر اس نے ہندستان کے شہر بنارس کا ذکر کیا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ یورپ میں بنارس کی بہت شہرت ہے۔ ہندستان کے ٹور آپریٹرس اور سفارتی واسطوں سے ان مقامات کی خوب تشہیر کی گئی ہے۔ خیر یہ نوجوان اپنے حوالے سے دلچسپ باتیں کرتا رہا اور بار بار اپنی ناکامی کا بھی ذکر کرتا گیا۔ اس نے بتایا کہ اچھی نوکری کے بغیر یورپ میں رہنا کتنا مشکل ہے۔ کوئی گرل فرینڈ بھی نہیں ملتی اور شادی کا تصور بھی ممکن نہیں۔ وہ گریجویٹ تھا اگر وہ اپنی باتوں میں سچ تھا تو اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ یورپ میں بھی نوجوان بے روزگار ہیں۔ اس کی باتوں سے ہمارا وقت

بھی گزر گیا اتنے میں ریلوے اسٹیشن کا دروازہ کھلا۔ ہم لوگوں نے کلاک روم میں اپنا سامان رکھا اور آس پاس گھومنے نکل گئے۔ ساڑھے نو بجے فاسٹ ٹرین سے وآسا کے لیے روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر رضوان نے انٹرنیٹ سے ہی ٹکٹ بک کرالیا تھا اور اتفاق سے ہمیں کفایتی ٹکٹ ملا تھا۔ ورنہ جس طرح ہندستان میں صرف ہوائی جہاز کا ٹکٹ اوپن مارکٹینگ کے اصول پر ہے اس لیے الگ الگ مواقع پر الگ الگ قیمتیں ہوتی ہیں، اسی طرح یورپ میں ٹرین ٹکٹ کا بھی یہی حال ہے۔ ہم نے یہ ضرور سن رکھا تھا کہ یورپ کی ٹرینیں بہت اچھی ہوتیں ہیں۔ اس سے قبل جاپان میں بھی ہم نے ایسی ہی بلیٹ ٹرینیں دیکھی تھیں۔ یورپ کی ٹرینوں میں بیٹھنا میں بھی ایک نیا تجربہ تھا۔ بہت ہی صاف ستھری اور اعلیٰ معیار کی ٹرین جس میں وائی فائی کی سہولت بھی موجود تھی۔ انٹرنیٹ کی اس سہولت نے زندگی کو بہت آسان بنا دیا ہے کیونکہ آج کے زمانے میں تمام چیزیں آن لائن دستیاب ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق یورپی ملک فِن لینڈ دنیا کا وہ پہلا ملک ہے جس نے اپنے شہریوں کو براڈ بینڈ انٹرنیٹ کے استعمال کا قانونی حق دے رکھا ہے۔ اس انٹرنیٹ کی سہولت سے ہمیں یہ فائدہ ہوا کہ ہم ہر وقت اپنے گھر والوں اور احباب سے رابطے میں رہے۔ وائبر کے ذریعے مفت میں کال کی سہولت تھی۔ اتنی رفتار سے چلتی ہوئی ٹرین میں بہت کم جھٹکے محسوس ہو رہے تھے۔ ٹرین میں زیادہ تر سیٹیں خالی تھیں جو ہمارے تصور سے بالکل الگ تھا یہاں نہ تو اسٹیشن کی بناوٹ ایسی تھی اور نہ ٹرین پکڑنے کے لیے لوگوں کی وہ بھاگ دوڑ تھی۔ نہ وہ ہجوم جو ہندستان میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقریباً تمام یورپی ممالک میں آبادی بہت کم ہے اور آبادی کے لحاظ سے سہولتیں بے شمار ہیں۔ ہم لوگ کبھی نئی جگہ، نئے طرز کے لوگوں کو دیکھ کر حیرت کرتے تو کبھی ٹرین سے باہر کے مناظر دیکھ کر عش عش کر رہے تھے۔ انتہائی شفاف فضا، سرسبز وادیاں، جگہ جگہ بڑے بڑے جھیل (لیک)، لمبے لمبے درخت گویا ہر طرف قدرت کے مناظر دعوت نظارہ دے رہے تھے۔ اعداد و شمار کے مطابق فن لینڈ میں 187,888 چھوٹے بڑے جھیل ہیں۔ ان میں تقریباً تین سو جھیل ایسے ہیں جو 10 کیلومیٹر مربع میٹر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ تمام جھیلیں نہ صرف فن لینڈ کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ اس ملک کو پانی کی دولت سے مالا مال بھی کر رہی ہیں۔ شہروں سے ہی ذرا

دوری پر کھیتوں کے مسطح سلسلے ہیں جہاں آدمی کم اور مشینیں زیادہ کام کرتی ہیں۔ کھیتوں کا عام طور پر ہمارے یہاں تصور ہے کہ وہ چھوٹے ہوتے ہیں لیکن یہاں تو دور دور تک ایک ہی کھیت ہیں۔ ان لمبے اور چوڑے کھیتوں کا فائدہ یہ ہے کہ آسانی سے مشینوں کے ذریعے کھیتی ہوسکتی ہے۔ دور دور تک کھیتوں کے ان سلسلوں کے درمیان گاؤں نظر آجاتا جس میں گنتی کے چند گھر تھے۔ مگر معلوم یہ ہوا کہ یہاں کے گاؤں بھی ہمارے شہروں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ہر گھر تک اچھی سڑکیں اور مکانات کے طرز اور معیار بھی شہروں جیسے تھے۔ ایک جگہ کسی وجہ سے ٹرین رکی اسٹیشن سے متصل ہی چند گھر تھے۔ وہاں کے لوگوں کو دیکھا ان کے پہننے اوڑھنے کا انداز کسی بھی طرح شہر کے لوگوں کے معیار سے کم نہیں تھا۔ اسی لیے یورپ کو آج بھی ترقی کا اشاریہ سمجھا جاتا ہے۔

20 مئی کی دوپہر تقریباً دو بجے ہم لوگ وآسا پہنچ گئے۔ یہ فن لینڈ کے خوبصورت شہروں میں سے ایک ہے۔ فن لینڈ براعظم یورپ کے شمال میں واقع ہے۔ اس کی کل آبادی 55 لاکھ ہے جن میں سے 2 لاکھ افراد غیر ملکی ہیں۔ اس کے جنوب میں خلیج فن لینڈ، شمال میں ناروے، مشرق میں روس اور مغرب میں سمندر اور سوئیڈن موجود ہیں۔ اسٹیشن کے قریب ہی ہوٹل تھا۔ ہوٹلوں میں عام طور پر گارڈ اور ریسپشن پر چند افراد ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ ہم لوگ ٹرین پر ہی تھے کہ ہوٹل سے ای میل کے ذریعے ہمیں ہمارا روم نمبر اور مین گیٹ کے الیکٹرانک لاک کا پاسورڈ اور روم کا پاسورڈ بھیج دیا گیا۔ یہ تو شکر ہے کہ ٹرین میں وائی فائی موجود تھا اس لیے ای میل چیک کرنا ممکن ہوا۔ خیر ہم لوگوں نے الیکٹرانک لاک کے دیئے گئے پاسورڈ سے روم کا دروازہ کھولا اور روم میں داخل ہوگئے۔ عام طور پر یہاں ہوٹلوں میں کوئی گارڈ نہیں ہوتا ہر جگہ خود کار نظام موجود ہے۔ تقریباً 36 گھنٹے کے سفر کے تھکے ماندے تھے آنکھیں نیند سے بوجھل ہورہی تھیں اور ہم لوگ بھوک سے بے حال بھی تھے۔ تمام ہوٹلوں میں خنزیر عام طور پر موجود ہوتا ہے، چکن اور مٹن کے نام پر بھی حلال گوشت کا ملنا ناممکن ہی تھا۔ اس پر سے آفت یہ کہ ہر چیز میں کسی نہ کسی طور پر گوشت ملی ہوئی چیزیں ہوتی تھیں اس لیے ہم لوگوں نے بریڈ بٹر پر ہی اکتفا کیا۔ ایک مشکل اور یہ پیش آئی کہ یہاں لوگ پانی کم پیتے ہیں۔ ڈاکٹر رضوان نے پانی کا ایک بوتل خریدا پیاس زوروں کی تھی لیکن جیسے ہی پانی پیا ہمیں کچھ عجیب سے مزے کا احساس ہوا۔ میں نے ڈاکٹر رضوان سے پوچھا

بھائی یہ پانی ہی ہے یا کچھ اور؟ کیونکہ ہمیں پانی کے علاوہ اور کسی لذت کا اندازہ نہیں تھا۔ رضوان بھی گھبرائے اور انھوں نے فوراً دکاندار سے پوچھا۔ تب معلوم ہوا کہ یہاں تقریباً درجنوں اقسام کے پانی ہیں کسی میں ویٹامن ہے تو کوئی اسپرنگ واٹر ہے تو کسی میں کچھ اور، سب کا مزا بھی جداگانہ۔ اس طرح کے پانی کی خاصیت یہ ہے کہ آپ زیادہ نہیں پی سکتے اور کم مقدار سے ہی نہ صرف پیاس بجھ جاتی ہے بلکہ استنجے کی حاجت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ معاملہ یہ ہے کہ یہاں حوائج ضروریہ کے لیے بھی پیڈ ٹوائیلیٹ میں جانا ہوتا اور ہم ہندستانیوں کے لیے ایک بار جانے کا مطلب ہے پچاسی روپے ادا کرنا۔ خیر پہلی دفعہ سابقہ پڑا تھا اس لیے یہ سب معلوم بھی ہو گیا۔ رہی بات یورپی لوگوں کی تو اکثر دیکھا کہ کہ وہ کھانے کے وقت بھی پانی کا استعمال کم کرتے ہیں۔ کھانے کے ساتھ شراب، جوس یا سوفٹ ڈرنک ضرور ہوتا ہے۔ ہم ہندستان میں عام طور اپنے گھروں میں آنے والے مہمانوں کو پہلے پانی ہی پیش کرتے ہیں لیکن یہاں ایسا نہیں ہے۔ ہم لوگوں کو ایک یورپی دوست کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو پہلے انھوں نے چائے یا کافی کے بارے میں پوچھا لیکن پانی کے لیے نہیں۔ نجانے کچھ دیر کے بعد انھوں نے بڑے تکلف سے پوچھا کہ پانی پیش کیا جائے؟ تو ہم نے بھی بے تکلفی سے مانگ لیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کس طرح کا پانی پینا چاہیں گے؟ انھوں نے اپنے فریج میں کئی اقسام کے پانی دیکھائے اور بالآخر آسمانی رنگ کا پانی پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ اسپرنگ واٹر ہے (Springwater)۔ پانی کا مزا کم تھا لیکن میزبان کا دل جو رکھنا تھا اس لیے پینا پڑا حالانکہ میزبان کے مطابق یہ عمدہ قسم کا پانی تھا۔

یہاں چونکہ دن 18 گھنٹے کا تھا اور شام ہونے کے باوجود رات کے دو بجے تک رات کی تاریکی نظر نہیں آتی تھی۔ شام کا وقت متعین تھا اس کا علم اس وقت ہوا جب دن کی روشنی میں گاڑیوں کے ہیڈ لائٹس جل جاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شام ہو گئی ہے۔ اسی لیے ہوٹلوں اور گھروں میں دبیز پردے لگے ہوتے ہیں۔ ہم لوگوں نے بھی پردے کھینچ لیے اور ہم دن کے اجالے میں ہی سو گئے اور جب نیند کھلی تب بھی دن کا اجالا ہی تھا۔ 4 بجے سے ہی روشنی آ چکی تھی اس وقت یہ شعر یاد آیا:

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا　　کھڑکی کے پردے کھینچ دئے رات ہو گئی

صبح ہم لوگ تیار ہو کر یونیورسٹی آف وآسا پہنچے۔ بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا گیا وقت مقررہ پر ساڑھے نو بجے سیمنار کا آغاز ہوا۔ ہم لوگ ابھی جیٹ لاگ سے باہر بھی نہیں آسکے تھے۔ ایک عجیب خمار کی سی کیفیت تھی۔ منتظم نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ اس ہال میں 17 ٹائم زون کے مہمانان موجود ہیں۔ ہم نے جب غور سے دیکھا تو بیشتر مندوبین کی حالت ہمارے جیسی ہی تھی۔ سیمنار کا موضوع ''تہذیب، اقدار اور عدل تھا۔'' سیمنار کی تفصیلات پہلے پیش کی جا چکی ہیں۔

وآسا فن لینڈ کا چھوٹا شہر ہے۔ انتہائی صاف ستھرا اور منظّم شہر ہے۔ شہر میں میوزیم، پرانے طرز کا گرجا گھر اور وآسا اسکوائر جیسے مقامات قابل دید ہیں۔ نشیب وفراز پر واقع اس شہر کی سڑکیں کشادہ ہیں۔ شہر کی درمیانی سڑکیں بہت خوبصورت ہیں کیونکہ دورویہ سڑک کے درمیان تقریباً چار پانچ فٹ کی چوڑائی ہے جس میں قاعدے سے درخت لگائے گئے ہیں اور زیب وزینت کے لیے پھولوں کے پودے بھی بڑے سلیقے سے موجود ہیں۔ یوں تو پورے یورپ میں سڑکوں کی بناوٹ اس طرح ہے کہ سڑک کے دونوں کناروں پر سائیکل چلانے والوں کے لیے مخصوص ٹریک ہے اور پیدل چلنے والوں کے لیے بھی مخصوص ٹریک ہیں۔ یورپ میں پیدل چلنے والوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اسی لیے جہاں جہاں بھی زیبرا کراسنگ ہے وہاں گاڑیاں خود بخود اپنی رفتار کم کر لیتی ہیں تاکہ سڑک کراس کرنے والوں کو زحمت نہ ہو۔ وآسا میں بھی عموماً ریڈ لائٹ پر جو کھمبے ہیں ان میں مخصوص طرح کے سوئچ لگے ہوئے ہیں اسے دبانے سے پیدل چلنے والوں یا سائیکل سے چلنے والوں کی سمت جلد ہی گرین سگنل آن ہو جاتا ہے۔ سڑکیں اس طرح بنائی گئی ہیں کہ معذور افراد کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ یہاں معذور افراد کے لیے عام طور پر خودکار سائیکل نما چھوٹی گاڑیاں ہیں جو عموماً فٹ پاتھ پہ چلتی ہیں۔ مین سڑک سے اندرونی سڑکوں تک اور وہاں سے گھر کے اندر تک اس طرح کی گاڑیاں بغیر کسی رکاوٹ کے جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ بس اسٹینڈ اور ریلوے اسٹیشن پر خاص طور پر نابینا افراد کے لیے پلیٹ فارم اور سڑک پہ اس طرح ابھری ہوئی مارکینگ کی گئی ہے کہ نابینا افراد اپنی چھڑی کے سہارے آسانی سے راستہ پہچان سکتے ہیں۔

وآسا ویسٹ کوسٹ پر واقع شہر ہے جس کی کل آبادی 66,405 ہے، اور شہر کے قرب وجوار کی آبادی تقریباً 90,000 ہے۔ یہاں سرکاری طور پر فنّیش اور سویڈیش دونوں زبانیں استعمال

ہوتی ہیں۔ یہ شہر فنّیش اور سویڈیش کلچر کا بہترین نمائندہ ہے۔ یہاں کی عمارتیں اور پارک شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔ خود یورپ کے دوسرے شہروں سے لوگ یہاں کثیر تعداد میں چھٹیاں منانے آتے ہیں۔ عموماً شہر میں گھومنے کے لیے شام یا صبح کو ہی ہمیں موقع ملتا تھا۔ صبح تو ہر شخص تقریباً دوڑتا ہوا ہی دیکھائی دیتا تھا۔ جدھر دیکھیے لڑکے ہوں یا لڑکیاں، عورت ہوں کہ مرد ہر شخص وقت مقررہ پر کام کے لیے پہنچنے کی ہوڑ میں ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر بہت اچھا لگتا تھا کہ جو وقت مقرر ہے اس مقررہ وقت پر سب حاضر۔ یہاں عورت مرد میں تفریق بہت کم ہے۔ کوئی بھی کام جس کے حوالے سے ہمارا تصور یہ ہے کہ اس کام کو مرد ہی کر سکتے ہیں، یہاں ایسا نہیں تھا۔ عورت مرد ہر طرح کے کام کرتے ہیں۔ لیکن شام کا نظارہ جداگانہ تھا۔ آفس سے چھٹیاں ختم ہوتے ہی لوگ سیر و تفریح میں مصروف نظر آتے۔ خاص طور پر وآسا اسکوائر کا نظارہ ہمارے لیے عجیب تھا۔ ہر طرف نوجوان لڑکے لڑکیوں کے جوڑے خوش گپیوں اور بوس و کنار میں مشغول نظر آتے۔ سگریٹ اور شراب عام بات تھی۔ ان کے لباس کے بارے کچھ کہنا مشکل ہے یورپ کی عریانیت کے بارے میں سنا تھا لیکن یہاں تو نوخیز، نوعمر نوجوان یا معمر عورتیں سب کے لباس ایک جیسے۔ ہم جسے عریانیت سمجھتے ہیں وہ ان کے لیے عام لباس ہے۔ حالانکہ اب ہندستان میں بھی اسی قسم کی عریانیت عام ہے۔ دہلی کے پوش علاقوں اور مارکیٹ میں جس طرح نوجوان لڑکے لڑکیوں کے لباس ہیں اسی طرح کے لباس وہاں ہیں بس فرق اتنا ہے کہ ہندستان کے صرف بڑے شہروں میں اس طرح کے لباس عام ہیں جبکہ یورپ میں خاص و عام اسی طرح کے لباس پہنتے ہیں۔ یونیورسٹی میں ایک خاتون منتظم سے کھانے کے ٹیبل پر وآسا کے موسم کے بارے میں ہماری گفتگو ہو رہی تھی تو انھوں نے بتایا کہ یہاں ہمیں صرف تین مہینے ایسے ملتے ہیں جس میں گرمی ہوتی ہے۔ حالانکہ ان کی گرمی ایسی ہی تھی جیسے ہمارے یہاں نومبر کے مہینے میں سردی۔ خیر انھوں نے بتایا کہ وآسا کے لوگ گرمی کو انجوائے کرتے ہیں کیونکہ سردیوں میں ہمیں دن دیکھنے کو ملتا ہی نہیں ہم ہر وقت برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ شاید اس لیے بھی یہاں کے لوگ اس موسم میں کم سے کم کپڑے پہنتے ہیں۔ اس طرح کے کپڑوں میں دیکھ کر اکثر ہماری نگاہیں جھکی رہتیں مگر کریں کیا کہ ایسے ہی ماحول میں تھے۔ دو تین دنوں کے بعد ہماری حیرتیں کم ہوتی گئیں کیونکہ اس طرح کے لباس ان کی تہذیب

کا حصہ ہیں۔شروع کے دنوں میں سگریٹ اور شراب پیتی لڑکیاں اور عورتیں ہمیں عجیب لگیں مگر ہر جگہ یہی حال تھا، جرمنی ہو یا سوئٹزرلینڈ۔شام ہوتے ہی تمام ہوٹلوں کے باہر کرسیاں سجادی جاتیں اس کے بعد ہر عمر کے مرد اور عورتیں گھنٹوں شراب نوشی میں مصروف نظر آتے۔اسکول اور کالج کی عمر کے بچے بچیوں کو اسی قدر آزاد مزاج اور آزاد خیال پایا جیسا کہ ہم نے سنا اور پڑھا تھا۔

وآسا میں ہم نے یہ دیکھنے کی کوشش کہ یہاں مسلمان بھی ہیں یا نہیں؟ اتفاق سے ایک مال میں ایک ایرانی خاتون نظر آئیں جو روایتی لباس میں تھیں یعنی باضابطہ انھوں نے نقاب پہن رکھا تھا۔تب ہم سمجھ سکے یہاں بھی کچھ مسلمان ضرور ہوں گے اور کہیں نہ کہیں حلال چیزیں کھانے کو مل جائیں گی۔ابھی ہم ان کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ فارسی زبان میں گفتگو کی ایک اور نسوانی آواز آئی۔ہم نے پلٹ کر دیکھا تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ایک نوجوان خاتون ہیں جن کے لباس کو دیکھ کر یورپی بھی شرمندہ ہوں۔اس خاتون کے ساتھ شاید ان کے شوہر رہے ہوں گے ان کا حلیہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ان کی طرح اور بھی کئی مسلم ملے جو یہاں آکر یہیں کی تہذیب میں ڈھل گئے ہیں۔یونیورسٹی میں کچھ مسلم نوجوان ملے۔دوپہر کے کھانے میں ایک نوجوان بڑے تپاک سے ہمارے پاس آیا اور اردو میں باتیں شروع کر دیں۔اس نے پوچھا آپ پاکستان کے کس شہر سے ہیں۔جب ہم نے بتایا کہ ہم ہندستان سے ہیں تب بھی وہ خوش ہوا اور بولا کبھی کبھی ایسا موقع ملتا ہے کہ اردو بولنے والے ملتے ہیں۔ہم بھی اس سے مل کر خوش ہوئے پھر ہماری تفصیلی گفتگو ہوئی جمعہ کی نماز کے بارے میں پوچھا تو بتایا کہ ہم طالب علموں اور یہاں کام کرنے والے مسلمانوں کی تنظیم ہے جو نماز اور روزے کے اہتمام کے لیے کام کرتی ہے۔اس نے بتایا کہ حلال گوشت حاصل کرنا مشکل ہے ہم کبھی کبھی لاتے ہیں اور پکاتے ہیں۔اس نے ہمیں تاکید کی کہ آپ کہیں نان ویج نہ کھائیں کیونکہ کہیں حلال نہیں ملتا۔ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا کہ یہاں حلال ملنا مشکل ہوتا ہے۔کچھ طالب علموں نے تو یہ مان رکھا کہ کسی بھی طرح کا گوشت ہو بسم اللہ پڑھ کے کھالیں تو وہ حلال ہوجاتا ہے۔یہ بات سنتے ہی ہمیں یاد آیا کہ ایک عرب خاتون جو عمان سے آئیں تھیں وہ بغیر کسی تکلف کے ہر طرح کا نان ویج کھا رہی تھیں حالانکہ وہ خاتون ہمیشہ حجاب میں رہتیں مگر کھانے میں انھوں نے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔

وآسا کے قیام کے بعد ہم ہیلسنکی کے لیے شام چھ بجے کی ٹرین سے روانہ ہوئے جسے گیارہ بجے ہیلسنکی پہنچنا تھا۔ ہمارے ہزار منع کرنے کے بعد بھی ڈاکٹر رضوان کے دوست اینتی راؤس ٹولا جو کبھی جے این یو میں تعلیم کے مقصد سے رہ چکے تھے اور ہیلسنکی کے ہی باشندے ہیں۔ ابھی وہ ہیلسنکی یونیورسٹی میں استاد ہیں، وہ ہمارے استقبال کے لیے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے۔ انھوں نے ہمارے لیے ایک عمدہ گیسٹ ہاؤس میں بکنگ بھی کرا رکھی تھی۔ ریلوے اسٹیشن سے ہم سیدھے گیسٹ ہاؤس گئے۔ سوچا سامان رکھ کر کسی ہوٹل میں کچھ کھا پی لیں گے۔ مگر کوئی ہوٹل کھلا نہیں ملا۔ واپس آئے تو گیسٹ ہاؤس کے رکن نے پوچھا کچھ ملا یا نہیں؟ چونکہ اس نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اب شاید ہی کچھ ملے۔ ایک بار تو اس نے ہمیں دیکھا اور کہا شاید آپ لوگ بہت بھوکے ہیں۔ رکیے میں انتظام کرتا ہوں پھر اس نے بریڈ، چیز اور کچھ فروٹ پیش کیا اور چائے کافی کے لیے بتایا کہ آپ اپنی مرضی سے بنالیں۔ یہ کیچن ہمیشہ کھلا ہے اور مہمانوں کے لیے ہے۔ ایک یورپی سے اس طرح کا سلوک غیر متوقع تھا کیونکہ عام طور پر وہ ایسا نہیں کرتے۔ ہیلسنکی کے علاوہ تقریباً تمام یورپی ممالک میں اس طرح کے گیسٹ ہاؤس عام طور پر موجود ہیں جہاں آپ کو کمرہ دے دیا جاتا ہے اور ساتھ میں کومن کیچن ہوتا ہے آپ اپنی مرضی سے جو چاہیں بنائیں اور کھائیں۔ اس طرح کے گیسٹ ہاؤس نسبتاً ہوٹل سے سستے ہوتے ہیں۔ چونکہ یورپ کا ایک معیار ہے اس لیے گیسٹ ہاؤس کسی بھی طرح ہوٹل کے کمروں سے کم بہتر نہیں ہوتے۔ یہاں بھی مین گیٹ اور اندر دروازے کے الیکٹرانک لاک کے پاس ورڈ دیئے گئے۔ پہلی رات تو ہمیں جو بھی ملا کھا پی کر سو گئے۔ صبح نو بجے ہمارے دوست آ گئے۔ پورے دن گھومنے کا انھوں نے پلان بنا لیا تھا۔ ہمارے لیے انھوں نے دن بھر کا پاس لے رکھا تھا۔ یورپ میں پرائیوٹ ٹرانسپورٹ سے بہتر پبلک ٹرانسپورٹ ہے۔ ٹرام اور میٹرو کی عمدہ سہولت ہے۔ انھوں نے جو ٹکٹ لیا تھا اسی ایک ٹکٹ سے میٹرو، ٹرام، بس اور فیری یعنی پانی کے جہاز میں سفر کر سکتے تھے۔ ہیلسنکی چونکہ جزیروں کے درمیان ہے اس لیے فیری سے سوار ہو کر ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے تک آنا جانا ایک انوکھا تجربہ تھا۔

ہیلسنکی فن لینڈ کی راجدھانی ہے جو فن لینڈ کی تعلیمی، تہذیبی، ثقافتی اور اقتصادی سرگرمیوں کا نمائندہ شہر ہے۔ ایک سروے کے مطابق شمالی یورپ کی تقریباً 70 فیصد بڑی کمپنیاں یہاں موجود

ہیں۔اس شہر کی آبادی 1176976 ہے اور کل آبادی 616042 ہے۔ یہ شہر گلف آف فن لینڈ کے کنارے اور بحر بالٹک سے قریب ہے یورپ کے شہر تلّین اور اسٹونیا کے شمال اور اسٹاک ہوم، سویڈین کے شمال مشرق اور مغرب میں سینٹ پیٹرس برگ واقع ہے اسی لیے اس شہر پر ان ممالک کے اثرات موجود ہیں۔ہیلسنکی کا ائیر پورٹ یورپ کے دوسرے ممالک کے لیے ہب کی حیثیت رکھتا ہے۔اپنے محل وقوع کے سبب یہ شہر سیاحوں کے لیے خاص کشش رکھتا ہے۔فنّیش اور سویڈیش یہاں کی سرکاری زبانیں ہیں۔

ہیلسنکی میں ہمیں اس لیے اجنبیت کا احساس نہیں ہوا کیونکہ یہاں ہمارے دوست اینتی موجود تھے۔ عام طور پر یورپ میں کوئی کسی کو اتنا وقت نہیں دیتا لیکن اینتی عام یورپین سے بالکل الگ تھے۔انھوں نے واقعی دل سے ہمارا استقبال کیا اور ہمارے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ تین دنوں تک وہ ہمارے ساتھ رہے ایک دن انھوں نے ہماری دعوت بھی کی۔ یورپ میں عام طور پر اس طرح کی ضیافت شاذ و نادر ہی ہوا کرتی ہے۔اس لیے یہ بڑی بات تھی۔اینتی چونکہ شادی شدہ نہیں ہیں وہ تنہا رہتے ہیں اس لیے انھوں اس دعوت کا اہتمام اپنی بہن کے گھر کیا۔اینتی جس اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں اسی اپارٹمنٹ میں ان کی بہن ماریہ بھی رہتی ہیں۔اینتی نے دو دن پہلے سے ہی اس کا ذکر کرنا شروع کیا کہ آپ کی ہمارے گھر دعوت ہے۔ان کے اس جملے سے ان کی خوشی اور ان کا والہانہ پن ظاہر ہو رہا تھا۔اینتی کے پاس عام یورپین کی طرح ایک خاتون دوست ہیں جو کبھی ساتھ ساتھ رہتے تھے لیکن کسی وجہ سے ان کی شادی نہیں ہو سکی اگر چہ ان کی دوست نے شادی کر لی ہے لیکن آج بھی وہ آپس میں دوست ہیں اور خوشی اور غم کے موقعے میں شریک ہوتے ہیں۔لہذا اس دعوت میں ان کی دوست جن کا نام مریہ ہے، وہ بھی شریک ہوئیں۔ یہ یورپ کی زندگی کی خاص بات ہے اکثر لوگ لیونگ ان ریلیشن میں (شادی کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ میاں بیوی کی طرح رہنا) ہی رہتے ہیں۔اینتی کی یہ بات ان کی بہن اور دوسرے افراد خانہ کو معلوم ہے اور خود مریہ کے اہل خانہ کو بھی یہ بات معلوم ہے۔اس پر مستزاد یہ کہ خود اینتی کی بہن نے بھی شادی نہیں کی ہے جبکہ اس کے دو بچے ہیں۔ وہ بھی آپسی سمجھوتے کے تحت ساتھ ساتھ رہتے ہیں ان کے بچوں کو بھی تمام تفصیلات معلوم ہیں۔(ہماری تہذیب میں یہ حیرت انگیز بھی ہے اور معیوب

بھی) خیر ۲۵ مئی کی شام ہم لوگ اس مخصوص دعوت میں شریک ہوئے۔ اینتی کی بہن ماریہ نے ہمارا پر جوش استقبال کیا ان کے دونوں لڑکے بھی تپاک سے ملے۔ ماریہ پیشے سے فلم پروڈیسر ہیں۔ اپنے پیشے کے علاوہ دونوں بچوں کی ذمہ داری بھی انھیں پر ہے۔ یورپ میں بچوں کی پرورش بھی ایک اہم مشغلہ اور پیشہ ہے۔ حکومت کی جانب سے بچوں کی پرورش کرنے والے یا والی کو اچھی خاصی رقم ملتی ہے۔ ہر شہری کے لیے تعلیم اور علاج مفت ہے۔ بچوں کے بالغ ہوتے ہی والدین کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ یورپ میں حقوق انسانی کا سختی سے اطلاق ہوتا ہے۔ وہاں کے اصول کے مطابق والدین بچوں پر کسی طرح کی سختی نہیں کر سکتے اور بچوں کو ہر طرح کی آزادی ہوتی ہے۔ عام طور پر اسکول کے زمانے سے ہی بچے اپنی گرل فرینڈ بنا لیتے ہیں اور اگر کسی کا بیٹا یا بیٹی سترہ اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچ گئے اور کوئی دوست نہیں بنا تو والدین پوچھتے ہیں کہ سب ٹھیک تو ہے؟ کیونکہ یہ ان کے لیے پریشانی کا سبب ہوتا ہے۔ اسی لیے تقریباً تمام بچے بچیوں کے مخصوص دوست ہوتے ہیں اکثر ان سے زندگی بھر رشتہ رہتا ہے لیکن عام طور شادی کا رواج کم ہے۔ دوست بن کے رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ماریہ کے گھر بیٹھے ہوئے ہم لوگ مشرق و مغرب کی تہذیب پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ ہم لوگ جب ہندستان کے رسم و راج اور شادی کے حوالے سے تفصیل انھیں بتا رہے تھے تو ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ اسی درمیان کھانے کا وقت ہو گیا حالانکہ سورج غروب ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے مگر ان کے مطابق تاخیر ہو رہی تھی۔ ہماری ضیافت کے لیے انھوں نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ کیچن سے متصل ڈائننگ روم میں کھانا لگایا گیا۔ ٹیبل پر کئی پلیٹیں سلیقے سے لگائی گئیں۔ سب سے پہلے اُبلے ہوئے آلو پیش کیے گئے۔ آلو ان کے یہاں خاص ڈش تصور کیا جاتا ہے۔ ہم آلو دیکھ کر مایوس ہوئے کیونکہ جس دعوت کا ذکر بڑے جوش سے کیا جا رہا تھا اس کی ابتدا آلو اور چیز سے ہو رہی تھی۔ اس کے بعد بیک کی ہوئی مچھلی جس کے اوپر اُبلے ہوئے آلو کی تہہ لگائی گئی تھی ساتھ میں کئی طرح کے سوسیج تھے۔ مایوسی کے ساتھ ہی سہی ہم نے کھانا شروع کیا مچھلی کافی لذیذ تھی۔ بس یہی رات کا کھانا تھا شکم سیر ہو کر کھایا۔ اس کے بعد کیک پیش کیا گیا جو ماریہ کے بیٹے نے بنایا تھا۔ اتنے ہی کھانے کا اہتمام دو دنوں سے چل رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ عام طور پر کھانا کم بناتے ہیں۔ بس بازار سے فروزن فوڈ لے آتے ہیں اور اسے گرم کر کے کھاتے ہیں۔

چھٹیوں کے دنوں میں یا کسی مہمان کی آمد کے موقعے سے ہی کھانا بنانے کا رواج ہے۔ بہر کیف یہ ہمارے لیے خوشی کی بات تھی کہ ہمیں کسی کے گھر مہمان بننے کا موقع ملا اس سے ان کی زندگی کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کو ملا۔ کئی گھنٹے ہم وہاں بیٹھے رہے اور کئی موضوعات پر بات چیت ہوتی رہی۔ ان کے بچے بھی ہماری گفتگو میں شامل رہے اور دلچسپی سے ہندستان کی تہذیبی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر ہم نے ان سے اجازت لی۔ اینتی اور ان کی دوست مریہ ہمیں ہوٹل تک چھوڑنے آئے۔ شام ہو رہی تھی اور اتفاق سے اسی دن فن لینڈ اور بیلا روس کے درمیان آئس ہاکی کا میچ تھا اسی لیے سڑک بالکل سنسان تھی۔ یورپ کے بارے میں سنا تھا کہ وہ کھیل کے لیے دیوانہ وار اپنے ملک کو سپورٹ کرتے ہیں۔ اس لیے کئی جگہ بیچ سڑک پر بڑے بڑے پردے لگے ہوئے تھے اور بڑی تعداد میں لوگ میچ دیکھ رہے تھے اور اس طرح چلا رہے تھے جیسے وہ اسی فیلڈ میں ہوں جہاں میچ چل رہا ہے۔ جب ہم ہوٹل پہنچے تو یہاں بھی یہی نظارہ تھا۔ دوسرے دن علی الصباح ہمیں سوئٹزر لینڈ کے لیے نکلنا تھا اس لیے جلد ہی سو گئے۔

سوئٹزر لینڈ (زیورخ)

26 مئی کی صبح ہم ہیلسنکی ائیر پورٹ سے فرینک فرٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں سے بذریعہ بس سوئٹزر لینڈ جانا تھا۔ ہم نے بس کا فیصلہ اس لیے کیا تا کہ جرمنی اور سوئٹزر لینڈ کے شہروں اور قصبوں کو دیکھا جا سکے۔ یورپ میں ٹرین، بس یا ہوائی جہاز کے کرایوں میں بہت فرق نہیں ہوتا۔ بسوں میں بھی تمام سہولتیں موجود ہوتی ہیں۔ ائیر پورٹ سے بذریعہ میٹرو ہفت بانوف (فرینک فرٹ) ریلوے اسٹیشن آئے۔ ریلوے اسٹیشن کے باہر ہی سے سوئٹزر لینڈ کے لیے بس لینی تھی۔ یورپ میں اچھی بات یہ ہے کہ ریلوے اسٹیشن یا ائیر پورٹ سے دوسری سواری لینے کے لیے بہت دور نہیں جانا ہوتا ہے۔ تقریباً ہر شہر میں ایسا ہی کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے پبلک ٹرانسپورٹ موجود ہیں۔ فرینکفرٹ میں سید اقبال حیدر صاحب سے ملاقات ہونا پہلے سے طے تھا چونکہ ہمارے پاس دو گھنٹے کا وقت تھا اس لیے اس دو گھنٹے میں ہم نے فرینکفرٹ کا کچھ حصہ دیکھا۔ اقبال صاحب گھر سے ہمارے لیے کھانے پینے کی چیزیں لے کر آئے تھے۔ بس میں یہ چیزیں

خوب کام آئیں۔ دو پہر کی بس سے ہم روانہ ہوئے چار گھنٹے میں سوئٹزرلینڈ کے شہر زیوریخ پہنچ گئے۔ یہاں بھی ڈاکٹر رضوان نے نیٹ کی مدد سے بہت اچھی جگہ پر ہوٹل بک کرایا تھا بالکل زیوریخ کی مشہور ندی لمیات کے کنارے۔ بس اسٹینڈ پر اترنے کے بعد اندازہ نہیں ہوا کہ کدھر جانا ہے وہاں رکشہ وغیرہ کا رواج تو ہے نہیں۔ کہیں بھی جانے کے لیے میٹرو، ٹرام اور بس کے علاوہ کوئی دوسری سواری نہیں۔ شہر میں مکانات اس طرح ہیں کہ ان سواریوں سے اترنے کے بعد بہت دور چلنا نہیں پڑتا۔ ہم اجنبی تھے بس اسٹینڈ پر اترنے والے یا تو اپنی گاڑیوں سے یا میٹرو سے اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ ہم کسی سے پوچھتے اکثر مسافر جا چکے تھے۔ بس اسٹینڈ پر کسی بس کے انتظار میں کھڑی ایک خاتون سے ہم نے اپنے ہوٹل کا پتہ معلوم کیا تو وہ خود انجان تھیں۔ لیکن ایک بات کا یورپ میں ہم لوگوں نے تجربہ کیا کہ اگر کسی سے راستہ پوچھیں تو بہت اطمینان اور سکون سے آپ کو راستہ بتائیں گے۔ جرمنی میں ہمارے ساتھ ایسا ہی ہوا ہم اپنے ہوٹل کی تلاش میں تھے اور کئی لوگوں سے راستہ پوچھ چکے تھے۔ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا ہر شخص ہمارے جیسے ہی اجنبی تھے۔ تب ہم نے ایک نوجوان کو دیکھا جو ایک آفس کے سامنے اپنی سائیکل کھڑی کر کے آفس کی جانب تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ ہم نے سوچا یہ مقامی شخص ہے اس سے پوچھا جائے حالانکہ کہ وہ بہت جلدی میں تھا پھر بھی رک کر اس نے ہماری بات سنی اگر چہ اسے بھی ہوٹل کے لوکیشن کا علم نہیں تھا۔ اس نے پاس کے دوکاندار سے پوچھا پھر اپنے موبائل سے گوگل میپ کے ذریعے راستہ دیکھا اور ہمیں دور تک اس سڑک پر چھوڑا جہاں ہمیں جانا تھا۔ فن لینڈ میں بھی کئی جگہ ایسا ہی ہوا کسی سے راستہ پوچھو تو جیسے اس کی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ وہ آپ کو صحیح راستہ بتائے۔ یہاں بھی بس اسٹینڈ پر منتظر اس خاتون نے پہلے معذرت ظاہر کی لیکن دوسرے ہی پل اس نے فون پر گوگل میپ کے ذریعے لوکیشن معلوم کر کے ہمیں صحیح راستہ بتا دیا۔ چند فرلانگ کی دوری پر ہی ہمارا ہوٹل تھا بالکل لمیات ندی کے کنارے تھا، یہ ندی زیوریخ لیک سے نکلتی ہے، یہاں سے زیوریخ لیک تقریبا دو کیلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ یہاں سے ریلوے اسٹیشن بہت نزدیک تھا اور ٹرام کا اسٹاپیج بھی۔

زیوریخ کا ریلوے اسٹیشن سوئٹزرلینڈ کا بڑا ہب ہے ہر بڑے شہر اور پاس کے ممالک کے

لیے ٹرینیں یہاں سے جاتی ہیں ۔زیورخ سوئٹزرلینڈ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ سیاحوں کی بڑی تعداد یہاں آتی ہے۔ دنیا کے مہنگے ترین شہروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔مئی کا موسم سیاحت کے لحاظ سے بہت اچھا ہے،تھوڑی گرمی ہوئی کہ بارش ہوجاتی ہے۔ہم لوگوں نے دو دن کے قیام میں بارش کا بھی لطف اٹھایا۔ یہاں بھی کھانے پینے میں حلال حرام کی وجہ سے کافی پریشانی ہوئی ۔لیکن شہر بہت ہی صاف ستھرا اور منظّم طور پر بسا ہوا ہے۔زیادہ تر یہاں نوشادی شدہ جوڑے نظر آئے۔ کسی کو کسی طرح کا خطرہ نہیں بے خوف وخطر گھوم سکتا ہے۔کرائم نہیں کے برابر ہے۔ندی کنارے جس ہوٹل میں ہم لوگ رکے ہوئے تھے وہاں دنوں کناروں پر ہوٹلوں کا جال بچھا ہوا ہے۔شام ہوتے ہی ہر طرف شراب اور سگریٹ کی بوآنے لگتی ہے۔دور تک سڑک کے کنارے کرسیاں سج جاتی ہیں اور شراب پینے والوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ دیر رات گئے ہم لوگ گھومتے رہے دوسرے دن صبح ٹرام اور میٹرو کے ذریعے مختلف مقامات کی سیر کو نکلے۔ رات کو ہم انٹرنیٹ کے ذریعے قابل دید مقامات دیکھنے کا پلان کر چکے تھے۔کوئی ہمراہ نہیں تھا اس لیے ایک سمت سے دوسری سمت تک کا سفر کرتے رہے۔ دوپہر بعد پہاڑ کی بلندی کی طرف گئے جہاں زیورخ یونیورسٹی ہے اور کئی قابل دید مقامات ۔زیورخ یونیورسٹی بہت پرفضا مقام پر واقع ہے، پرانے طرز کی شاندار عمارت ہے۔ اس یونیورسٹی میں اردو کی تدریس کا بھی نظم ہے۔ تعطیل کی وجہ سے کسی سے ملاقات نہیں ہوسکی۔اس کے بعد پہاڑی کے بالکل بالائی سطح پر چڑیا گھر تھا اس کو دیکھنے کے لیے گئے مگر انٹری فیس اتنی تھی کہ اتنے میں مزید ایک دن ہوٹل میں قیام ہوجاتا۔اس لیے ہم لوگوں نے اندر جانے کا فیصلہ ملتوی کیا واپسی میں ایک خوبصورت پارک نظر آیا ہم لوگ پارک کے اندر داخل ہوگئے دیکھا تو یہ پارک نہیں بلکہ عیسائیوں کا قبرستان ہے۔ اسے دیکھ کر حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ اس قدر خوبصورت؟ انواع واقسام کے پھول لگے ہوئے تھے اور اتنے سلیقے سے اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے اور قبروں کے دونوں طرف اس سلیقے سے کیاریاں نکالی گئی ہیں کہ یہ کسی طرح قبرستان معلوم ہی نہیں ہورہا تھا۔ ہمارے یہاں اس طرح کے پارک بھی شاید باید ہی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کو اس کی خوبصورتی کی وجہ سے ہی جانا جاتا ہے۔لیکن ایک بات جو میں نے محسوس کی کہ یہاں واقعی فطری مناظر کا انمول تحفہ قدرت نے عطا کیا ہے ۔لیکن سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے اسے اسی سلیقے سے

(ڈیولپ کیا ہے) ترقی دی۔ ہمارے ملک میں بھی نارتھ ایسٹ، شملہ اور کشمیر میں ایسی خوبصورتی موجود ہے لیکن اس کو اس سلیقے سے ترقی نہیں دیا جاسکا ہے ورنہ ان جگہوں کی خوبصورتی بھی کسی طرح کم نہیں ہے۔ سوئٹزرلینڈ کو اس کے علاوہ بھی اور کئی اعتبار سے اہمیت حاصل ہے۔ یہ ملک یو این او کا ممبر بھی نہیں ہے لیکن اس حکومت نے اپنا مقام خود بنایا ہے۔ دنیا بھر کے بڑے اداروں کا ہیڈ کواٹر یہاں موجود ہے۔ صرف بینکنگ سے اس نے اپنے اقتصاد کو کافی اونچائی تک پہنچایا ہے۔ یہاں کی گھڑیاں اور چاکلیٹ پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ یہاں کے شہریوں کو یہ سہولت حاصل ہے کہ انھیں کسی ملک کا ویزا نہیں چاہیے انھیں آن ارائیول ویزا مل جاتا ہے۔ اس کے پیچھے یہ سوچ ہے کہ سوئٹزرلینڈ کے شہریوں کو اپنے ملک میں اتنی سہولیات میسر ہیں کہ اس جیسی سہولت انھیں اور کہیں مل ہی نہیں سکتی لہذا وہ کسی ملک میں جا کر بس ہی نہیں سکتے۔ اسی لیے دنیا کے سارے ممالک ان کو آن ارائیول ویزا دیتے ہیں۔

دو دنوں میں ہم سوئٹزرلینڈ کو پوری طرح دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن جتنا دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ یہاں کی معیشت ٹورزم کی وجہ سے کافی مضبوط بنی ہوئی ہے۔ یہاں ہم نے ایک عجیب چیز دیکھی لمبات ندی کے کنارے ایک جانب سے دوسری جانب جانے کے لیے کئی پل بنے ہوئے ہیں ان میں سے ایک پل جو ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے۔ اس پل پر بھی دوسرے پلوں کی طرح دونوں جانب جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ لیکن جالی کے دونوں طرف ہر جال میں تالے لگے ہوئے ہیں۔ ہم لوگوں نے تعجب سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تالے منّت کے لیے لگائے جاتے ہیں۔ لوگوں کا ماننا ہے کہ یہاں تالے لگا کر اس کی چابیاں اگر ندی میں ڈال دی جائیں تو مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کی طرز زندگی اور یہ تو ہم سمجھنے سے ہم قاصر رہے۔

دو دن کے قیام کے بعد ہم فرینکفرٹ، جرمنی کے لیے بذریعہ ٹرین روانہ ہوئے مقصد صرف یہ تھا کہ یہاں کے ہر نظام کو دیکھا جائے زمینی راستے سے گزرتے ہوئے قرب وجوار، قصبات اور شہر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس لیے سفر کے اس وسیلے کو ہم نے منتخب کیا۔ نہایت تیز رفتار ٹرین جس میں ہر طرح کی سہولتیں موجود تھیں، سیٹس بہت آرام دہ اور ہر سیٹ کے سامنے ڈیجٹل ڈسپلے سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس سیٹ پر کہاں سے کہاں تک کی سیٹ ریزرو ہے۔ چار گھنٹے میں ہم

فرینکفرٹ، جرمنی کے ریلوے اسٹیشن ہفت بانوف پہنچ گئے۔

فرینکفرٹ، جرمنی

ہوٹل میں پہنچتے ہی کچھ دیر بعد سید اقبال حیدر صاحب آ گئے۔ سید اقبال حیدر اردو کے نامور ادیب، کالم نگار اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ وہ حلقۂ ادب جرمنی اور ہیومن ویلفئیر ایسوسی ایشن کے بانی صدر ہیں۔ وہ ان تنظیموں کے زیر اہتمام اردو کی ادبی اور شعری محفلوں کو سجاتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی دہائیوں سے چل رہا ہے۔ ان کے پروگراموں میں ہند و پاک کے علاوہ دنیا بھر کے ممالک سے اہم ادیب و شاعر شریک ہوتے رہے ہیں۔ ان کی سرگرمیوں کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ ہر سال دریائے نیکر، ہائیڈل برگ کے کنارے علامہ اقبال کی مناسبت سے ایک فرشی مشاعرے کا انعقاد کراتے ہیں۔ یہ دریائے نیکر وہی ہے جس پر اقبال نے نظم کہی تھی۔ یہی وہ شہر ہے جہاں اقبال نے اپنی تعلیم کے لیے قیام کیا تھا۔ دریائے نیکر کے کنارے کی سڑک ''اقبال ہوفر'' کے نام سے ہے یعنی اقبال سے منسوب ہے۔ اسی جگہ جرمن حکومت نے اقبال کی اس نظم کا جرمن ترجمہ ایک پتھر پر کندہ کرا کے نصب کرایا ہے۔ یہ سب باتیں اس کی دلیل ہیں کہ جرمن اقبال کی عظمت کو سمجھتے ہیں اسی لیے جرمنی میں اقبال مطالعات کو بھی خاصی اہمیت دی گئی ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر سید اقبال حیدر اس جگہ ہر سال فرشی مشاعرے منعقد کراتے ہیں۔ اس کے علاوہ سال میں کم از کم دو تین سیمنار، مذاکرے، مشاعرے اور دیگر تقریبات کا اہتمام کرتے ہیں۔ سید اقبال حیدر کی تنظیموں کے علاوہ بھی فرینکفرٹ میں اور کئی اردو کی ادبی تنظیمیں ہیں لیکن کی ان کی سرگرمیاں بہت محدود ہیں۔ اقبال صاحب بہت مصروف شخص ہیں لیکن ہمارے لیے وقت نکالا اور ہم فرینک فرٹ میں پہلے گوئٹے میوزیم دیکھنے نکلے۔ گوئٹے کے گھر کو ہی میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے جو قلب شہر میں ہے۔ میوزیم دیکھ کر ایک تو یہ معلوم ہوا کہ گوئٹے ایک امیر شخص تھا۔ دوسرا جرمنی حکومت کس طرح اپنے دانشوروں اور ملک کو روشن کرنے والوں کی یادگاروں کو محفوظ رکھتا ہے، اس کا بھی اندازہ ہوا۔ اس میوزیم کو دیکھنے سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ قدیم طرز کی عمارتیں کیسی ہوتی

تھیں۔ گوئٹے میوزیم میں ان کی استعمال کی تمام چیزیں محفوظ ہیں اور وہ تمام کتابیں بھی جوان کے مطالعے میں تھیں۔ میوزیم دیکھنے کے بعد ہم لوگوں نے یہاں کے بازار اور بڑے بڑے مال کو دیکھا کچھ خریداری بھی کی۔ فرینکفرٹ جرمنی کا ایسا شہر ہے جو ملٹی کلچرل سٹی کے طور پر جانا جاتا ہے۔ یہاں تقریباً ہر ملک کے لوگ مل جائیں گے کیونکہ یہ صرف ثقافتی اعتبار سے ہی اہم نہیں ہے بلکہ یہ ایک اہم اقتصادی مرکز بھی ہے۔ وکی پیڈیا کے کے مطابق:

"فرینکفرٹ ای ام جرمن ریاست ہیسین کا سب سے بڑا شہر اور عام طور پر صرف فرینک فرٹ کے طور پر جانا جاتا ہے، جرمنی میں پانچواں بڑا شہر ہے۔ 687,775 اس کی آبادی ہے اور جرمنی کا دوسرا سب سے بڑا میٹروپولیٹن علاقہ ہے۔ فرینک فرٹ جرمنی کے مالی اور نقل وحمل کا مرکز ہونے کے ساتھ براعظم یورپ میں سب سے بڑا امالیاتی مرکز بھی ہے. یہ یورپی مرکزی بینک، جرمن فیڈرل بینک، فرینک فرٹ اسٹاک ایکسچینج اور فرینک فرٹ تجارتی مرکز کے علاوہ کئی بڑے کمرشل بینکوں کا مرکز بھی ہے۔ فرینک فرٹ کا ہوائی اڈہ دنیا کے مصروف ترین بین الاقوامی ہوائی اڈوں میں سے ایک ہے۔ فرینک فرٹ کا مرکزی اسٹیشن یورپ میں سب سے بڑے ٹرمینل اسٹیشنوں میں سے ایک ہے"۔

مصروف ترین ٹرمینل ہونے کے باوجود یہاں کسی طرح کی بدنظمی نہیں ہے ہفت بانوف ٹرمینل سے نکلنے کے بعد باہر ہم نے ایک بڑی تصویر دیکھی جو ۱۹۳۰ کی تھی۔ اس تصویر میں اس وقت کے ریلوے اسٹیشن کا نقشہ تھا۔ اس تصویر کو بغور دیکھا اور اندازہ کیا کہ اس وقت جس طرح سڑکیں اور عمارتیں تھیں آج بھی وہی ہیں اور سڑک کے درمیان سے چلتے ہوئے ٹرام اور سڑکوں کے کنارے سائیکل چلانے والوں کے لیے الگ ٹریک یہ سب اس وقت بھی تھا۔ جرمن قوم کی اس دوراندیشی کو دیکھ کر ان کی ترقی کا راز منکشف ہوا۔ خیر ہم دن بھر گھومتے رہے شام ہوتے ہی اقبال صاحب اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے کیونکہ ہمارے لیے رات کے کھانے کا اہتمام اقبال

صاحب نے اپنے گھر پر کر رکھا تھا۔ بہت ہی پر تکلف دعوت تھی۔ کئی دنوں کے بعد بریانی اور قورمے کی خوشبو نے بھوک بڑھا دی تھی۔ اقبال صاحب نے جلد ہی طرح طرح کے کھانوں سے دسترخوان سجایا۔ لیکن خوشبو سے پیٹ پہلے ہی بھر چکا تھا اس لیے کھانے کا حق ادا نہیں کر سکے۔ لیکن جس اشتہا سے کھانا کھایا وہ ابھی بھی یاد ہے۔ کیونکہ ہفتوں سے ساگ سبزی یا بریڈ بٹر پر گزارا ہو رہا تھا۔ اقبال صاحب کا تعلق بنیادی طور پر ہندستان سے ہے لیکن تقسیم وطن کے بعد ان کی فیملی پاکستان منتقل ہوگئی۔ ان کی اہلیہ پاکستان کی ہیں۔ اقبال صاحب یار باش اور نہایت ہی خلیق انسان ہیں۔ اقبال صاحب ادب نواز بھی ہیں۔ ایک اچھے شاعر، صحافی اور ادیب ہیں۔ انھوں نے جرمنی میں اردو کا پرچم بلند کر رکھا ہے۔ اکثر اردو کے پروگرام منعقد کراتے رہتے ہیں۔ ہندستان اور پاکستان کے اکثر ادیب وشاعر انھیں ضرور جانتے ہیں۔

دوسرے دن انھوں نے ہائیڈل برگ کا پروگرام بنایا۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنی کار سے ہوٹل آئے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ ہائیڈل برگ دریائے نیکر کے کنارے آباد بہت ہی خوبصورت شہر ہے۔ یہ باڈن اسٹیٹ جرمنی کا پانچواں بڑا شہر ہے جو جرمنی کے جنوب مغرب میں واقع ہے اور فرینکفرٹ سے تقریبا سو کیلو میٹر کی دوری پر ہے۔ یہاں ہائیڈل برگ نام سے ہی یونیورسٹی ہے جو پوری دنیا میں مشہور ہے۔ اس یونیورسٹی کو ہم اردو والے علامہ اقبال کے حوالے سے بھی جانتے ہیں کیونکہ انھوں نے یہاں تعلیم حاصل کی تھی۔ ہائیڈل برگ جانے کا ہمارا مقصد بھی یہی تھا کہ ہم اقبال کے حوالے سے اس دریائے نیکر کو دیکھنا چاہتے تھے جہاں بیٹھ کر کئی اہم نظمیں لکھی ہیں۔ جرمنی حکومت نے دریائے نیکر کے کنارے اس مقام پر کتبہ نصب کیا ہے جو جرمن زبان میں ہے۔ یہ اقبال کی نظم کا ہی بند ہے۔ اقبال حیدر صاحب ادب نواز بھی ہیں انھوں نے کئی دفعہ اس مقام پر اقبال کی یاد میں فرشی مشاعرہ منعقد کیا ہے۔ کناڈا سے سید تقی عابدی نے بھی اس میں شرکت کی ہے۔ اسی سے متصل سڑک اقبال کے نام سے منسوب ہے۔ اقبال حیدر صاحب نے بتایا کہ دریا کے کنارے وہ مکان موجود ہے جس میں اقبال رہتے تھے۔ پاکستانی حکومت نے بہت کوشش کی کہ اس مکان کو خرید لیا جائے تا کہ وہاں اقبال میوزیم بنایا جائے لیکن وہ اب تک

کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔لیکن اس مکان مالک کو جب اندازہ ہوا کہ لوگ اقبال کے حوالے سے اس مکان کو دیکھنے آتے ہیں تو انھوں نے اس مکان کے آگے اقبال کا نام لکھ دیا ہے اور ان کا مختصر تعارف بھی۔ یہ جگہ بہت ہی خوبصورت ہے اور دریا کا نظارہ اس منظر کو مزید دلکش بناتا ہے۔ ہائیڈل برگ پہاڑوں کے درمیان ہے ایک طویل پہاڑی سلسلہ ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری میں پہاڑوں کا جو ذکر کیا ہے کہیں انھیں پہاڑوں کے نظارے سے ان کی شاعری میں یہ تصور نہ آیا ہو۔ہم لوگ اسی مقام پہ جسے تقی عابدی نے 'مقام اقبال' کا نام دیا ہے،فرش بچھا کر دیر تک بیٹھے رہے۔اقبال حیدر صاحب نے دوپہر کے کھانے کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔گھر سے ہی لذیذ کھانے بنوالائے تھے۔ان کی اہلیہ بھی مہمان نواز ہیں اس لیے انھوں نے بڑے اہتمام سے طرح طرح کے کھانے پیک کر دئے تھے۔ ہائیڈل برگ میں دو تین گھنٹے گزرانے کے بعد ہم فرینکفرٹ کے لیے روانہ ہوئے ،اسی شام ہماری دہلی کے لیے فلائٹ تھی۔اقبال صاحب کو ہم نے الوداع کہا اور یہ تمام یادیں سمیٹے دہلی واپس آ گئے۔

کوپن ہیگن (ڈنمارک)

کوپن ہیگن میں مقیم اردو کی ادیبہ اور شاعرہ محترمہ صدف مرزا کی دعوت پر مئی 2018 ہم یورپ کے مشہور شہر کوپن ہیگن پہنچے۔لٹریچر اینڈ کلچر انٹرنیشنل کی طرف سے یہ دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔صدف مرزا صاحبہ اس کی اعزازی صدر ہیں۔ بلکہ یوں کہیں کہ اس پلیٹ فارم سے جتنی بھی ادبی سرگرمیاں ہوتی ہیں وہ انھیں کے دم سے ہیں۔محترمہ صدف مرزا صاحبہ سے میری غائبانہ ملاقات سوشل میڈیا اور اردو کے احباب کے توسط سے ہوئی تھی۔مگر باضابطہ ملاقات دہلی کے عالمی سیمنار میں ہوئی۔صدف مرزا ایک ذہین،ملنسار اور ادب نواز شخصیت کی مالک ہیں۔ڈنمارک کے شہر کوپن ہیگن میں اردو کی ترویج کے لیے کچھ نہ کچھ سرگرمیاں کرتی رہتی ہیں۔انھوں نے ''زبان یار من ڈینش'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ بہر کیف جب کا ان کا دعوت نامہ آیا تو انھوں نے یہ بھی کہا کہ لٹریچر اینڈ کلچر انٹرنیشنل نے آپ کو اردو کی ترویجی خدمات کے اعتراف میں ''سفیر

اردوادب'' ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔اس سفر میں میرے ساتھ ڈاکٹر رضوان بھی ساتھ تھے۔ یہ سفر بھی فرینکفرٹ کے راستے ہی طے کیا۔ دراصل اس وقت کوپن ہیگن کے لیے براہ راست دہلی سے کوئی جہاز نہیں تھا۔ اس لیے ہم نے ائیر انڈیا سے فرینکفرٹ کا ٹکٹ لیا۔ ارادہ یہ تھا کہ یہاں اقبال بھائی سے ملے بغیر کیسے جایا جاسکتا ہے۔ شام کو جب فرینکفرٹ پہنچے تو اقبال بھائی ہمارے منتظر تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی اور کوپن ہیگن سے واپسی پر فرینکفرٹ کے پروگرام کی تفصیلات بتائیں۔ تین گھنٹے کی ملاقات کے بعد ہم کوپن ہیگن کے لیے روانہ ہوئے۔ رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تھے جب ہماری فلائٹ کوپن ہیگن پہنچی۔ یورپ میں اسے آدھی رات اس لیے مانا جاتا ہے کہ عام طور پر یہاں جلد ہی لوگ اپنے گھروں میں چلے جاتے ہیں۔ برصغیر کے بڑے شہروں کی طرح یہاں رات کی زندگی بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس لیے ہم پریشان تھے کہ صدف صاحبہ ہمارے لیے ائیر پورٹ پر منتظر ہوں گی۔ خیر ہم جلد ہی اپنے سامان لے کر باہر نکلے تو صدف صاحبہ انتہائی خوش اخلاقی اور گرمجوشی سے ملیں۔ پھولوں کا گلدستہ پیش کر کے ہمارا استقبال کیا۔ ان کے ساتھ جناب زبیر صاحب اور سرور صاحب بھی تھے ان سے ہماری پہلی ملاقات تھی۔ یہ حضرات بھی انتہائی خنداں پیشانی سے ملے۔ یہاں آنے سے قبل میں نے صدف صاحبہ سے گزارش کی تھی کہ ہمارے لیے کوئی درمیانے درجے کا ہوٹل بک کرادیں۔ ہم مطمئن تھے کہ انھوں نے ایسا کیا ہوگا۔ مگر جب زبیر صاحب کی کار میں بیٹھ کر ائیر پورٹ سے باہر نکلے تو صدف صاحبہ نے بتایا کہ ہم نے آپ کے لیے کوئی ہوٹل نہیں بک کیا بلکہ زبیر صاحب کے ایک دوست ہیں انھیں کے ساتھ فلیٹ میں رہنا ہے۔ اس تکلف کے لیے ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ کچھ ہی دیر میں ہم اس فلیٹ میں داخل ہوئے۔ اس فلیٹ میں دو کمرے تھے۔ ایک میں مجھے اور رضوان صاحب کو ساتھ رہنا تھا۔ دوسرے میں ایک صاحب مکان تھے۔ مگر اس وقت وہ ڈیوٹی پر تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ وہ صبح کو آئیں گے اور جب بیل دیں تو آپ ان کے لیے دروازہ کھول دیں۔ میں نے پوچھا کہ اگر کوئی اور آ گیا تو ہمیں کیسے سمجھ آئے گا کہ یہ وہی شخص ہیں۔ صدف صاحبہ نے بتایا کہ آپ مطمئن رہیں۔

آپ جس ملک اور جس شہر میں ہیں، یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ خیر تھوڑی دیر میں صدف صاحبہ نے گھر سے بنا کر لائی ہوئی کھانے کی چیزیں سامنے رکھ دیں۔ ساتھ ہی انھوں نے کیچن میں رکھے جوس، فروٹ، بریڈ، بٹر اور نجانے کیا کیا، دیکھاتے ہوئے کہا یہ سب آپ لوگوں کے لیے ہے۔ میں نے برملا یہ جملہ کہا کہ صدف صاحبہ ہمیں تو صرف تین دن رکنا ہے اتنا سارا سامان تو ہفتوں کا ہے۔ چونکہ رات زیادہ ہو رہی تھی اس لیے تمام ہدایات دے کر سرور صاحب اور زبیر صاحب کے ساتھ وہ رخصت ہوئیں اور صبح آنے کا وعدہ کیا۔ کچھ دیر میں ہم نے کھانا کھایا اور سو گئے۔ تقریباً چار بجے صبح دروازے کی گھنٹی بجی تو رضوان صاحب کی آنکھ کھلی۔ وہ دوڑے ہوئے دروازہ کھولنے لپکے۔ مگر تمام جدوجہد کے بعد بھی دروازہ نہیں کھلا تو انھوں نے مجھے جگایا۔ آنے والے شخص ہی اس مکان میں رہتے تھے۔ وہ ایک شریف النفس پاکستانی بھائی تھے۔ میں نے بھی ہزار کوشش کی اور باہر سے وہ بھی ترکیبیں بتاتے رہے۔ لیکن دروازے کو نہیں کھلنا تھا سو نہیں کھلا۔ اس شریف انسان نے کہا کوئی بات نہیں آپ سو جائیں اب صبح ہوگی تو دیکھا جائے گا۔ نجانے اس وقت سے صبح کے آٹھ بجے تک انھوں نے کیسے وقت گزارا ہوگا یہ تو ہمیں معلوم نہیں۔ لیکن آٹھ بجے انھوں نے مکان مالک کو فون کیا۔ یورپ میں عموماً مکان مالکوں کے پاس اضافی چابھی ہوتی ہے۔ یہاں کرایہ داروں کے بڑے شفاف اور واضح اصول بنے ہوئے ہیں۔ مکان مالک کے پاس اضافی چابھی ہوتی اور تین مہینے میں وہ ایک بار بغیر بتائے اپنے مکان کو دیکھنے آسکتے ہیں اور جائزہ لے سکتے ہیں۔ خیر جب مکان مالک نے بھی اپنی چابھی سے دروازہ کھولنا چاہا تب بھی وہ دروازہ نہیں کھلا۔ اب وہ کسی میکنک کو لے آئے اور کسی طرح دروازہ کھلا۔ انھوں نے بتایا کہ لاک خراب ہے اس لیے کچھ چیزیں تبدیل کر دیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کا وقت لگ چکا تھا۔ چابھی بنانے والے جا چکے تھے۔ مکان مالک کے ساتھ ہم لوگ چائے پینے لگے۔ اتنے میں میں نے انھیں بتایا کہ رات ہم نے اس طرح آرام سے دروازہ بند کیا تھا۔ مگر وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ کھلا کیوں نہیں؟ اب میرا دروازہ بند کرنا تھا کہ دوبارہ پھر نہیں کھلا۔ سب نے کوششیں کر کے دیکھ لیں۔ پھر سے میکنک کو فون

کیا گیا۔اس بار انھوں نے پورا لاک سسٹم ہی تبدیل کر دیا۔اس طرح کوپن ہیگن کا پہلے دن کا آدھا حصہ کھل جا سم سم میں گزر گیا۔اس کے بعد ہم تیار ہوکر زبیر صاحب کے ساتھ کچھ دیر کے لیے باہر سیر کو نکلے۔

یورپ میں عموماً شام کو ہی پروگرام ہوتے ہیں ۔کیونکہ یہاں کے لوگ آفس اور کام چھوڑ کر کسی پروگرام میں اتوار کے علاوہ شریک بھی نہیں ہوسکتے ۔اس لیے شام کو سیمنار میں شریک ہوئے۔''مہجری ادب اور اردو کی تدریس'' کے موضوع پر گفتگو تھی ۔ہندستان کی طرح یہاں جم غفیر تو نہیں تھا مگر بہت سنجیدہ لوگ موجود تھے۔دوسرے دن صدف صاحبہ نے ٹی وی لنک ڈنمارک کی جانب سے ایک انٹرویو رکھا تھا۔اسی موقعے سے انھوں نے اسے نشر کیا تھا۔

آخری دن ہم نے بس کے ذریعے کوپن ہیگن کی سیر کی۔اس شہر کو خوش رہنے والوں شہروں کی فہرست میں سر فہرست رکھا گیا۔ بہت ہی پرسکون اور صاف ستھرا شہر ہے۔یورپ میں اس کی ایک شناخت یہ بھی ہے کہ یہاں سائیکل کے لیے سب سے لمبا ٹریک موجود ہے۔یوں تو یورپ کے تمام شہروں میں سائیکل چلانے کا رواج ہے اور تمام سڑکوں کے ساتھ سائیکل کا الگ سے ٹریک بھی بنا ہوا ہے لیکن کوپن ہیگن کا ٹریک سب سے لمبا ہے۔اس شہر میں کئی قابل دید مقامات ایسے ہیں جن کا تعلق اساطیر سے ہے۔جیسے جل پری اور کئی دیگر مقامات۔شہر کے درمیان میں واقع ندی اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے۔یہاں کشتیوں کے ذریعے گھومنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔شاہی محل اور گرجا گھر کے علاوہ دنیا کی کئی بڑی کمپنیوں کے صدر دفتر بھی یہاں موجود ہیں۔مجموعی طور پر یہ قابل دید شہر ہے۔صدف صاحبہ،زبیر صاحب اور سرور صاحب کی ضیافتوں کا بہت شکریہ۔اس موقعے سے ٹی وی لنک ڈنمارک نے میرا ایک انٹرویو نشر کیا تھا اس کا لنک ذیل میں ہے۔

https://youtu.be/gBji7QMpASY

میڈرڈ اور قرطبہ (اسپین)

میڈرڈ آنے کا مقصد محض یہ تھا کہ یہیں سے ٹرین کے ذریعے قرطبہ (کورڈوبا) جانا تھا۔

اقبال کی نظم مسجد قرطبہ جب سے پڑھی تھی اس مسجد کو دیکھنے کا اشتیاق تھا۔اقبال نے اس نظم میں نہ صرف مسجد قرطبہ کی تعمیر اور اس مسجد کی خوبصورتی کا ذکر کیا تھا بلکہ مسلم حکومت کی عروج وزوال کی پوری داستان اس نظم میں موجود ہے۔ جب ہمارے اساتذہ نے یہ نظم پڑھائی تھی اس وقت جو سمجھا وہ الگ تصور تھا۔ طالب علمی کے بعد میں نے اپنے طالب علموں کو جب یہ نظم پڑھائی تو منظر نامہ اس لیے جدا تھا کہ شعور کی منزلیں بدل گئیں تھیں۔ جب جب مسجد قرطبہ کا ذکر تعلیم وتدریس میں آتا ایک عجیب سی خلش دل میں ہوتی۔ بہت تمنا تھی کہ اس مسجد کی زیارت کے اسباب مہیا ہوجائیں۔اللہ کا کرم تھا کہ یہ موقع ملا۔

میڈ ریڈ میں ایک دن کا قیام تھا۔ہم نے شہر کے اہم مقامات کو دیکھا۔اتفاق سے ایک روز قبل میڈ رید کی فٹ بال ٹیم نے کوئی ٹرافی جیتی تھی۔ یہ فٹ بالر اسی روز شہر میں آئے تھے اس لیے پورا شہر جشن میں ڈوبا ہوا تھا۔ہم نے قریب سے لوگوں کی کھیل کی دیوانگی کو دیکھا۔یورپی شہروں میں کئی اعتبار سے یہ اہم شہر ہے۔ دیگر یورپی شہروں کے مقابلے یہاں زیادہ بھیڑ بھاڑ نظر آئی۔ فیشن اور فلم کے اثرات یہاں زیادہ نظر آئے۔ہوٹل کے آس پاس رات کا ماحول ناقابل بیان ہے۔ان ہنگاموں کو دیکھ کر ہم جلد ہی اپنے ہوٹل کے کمرے میں آگئے۔صبح کو فاسٹ ٹرین کے ذریعے قرطبہ کے لیے روانہ ہوئے۔ جانے سے قبل ہی ہم لوگوں نے وہاں کے ایک ہوٹل میں بکنگ کرالی تھی۔ یہ وہ دن تھے جب قرطبہ میں فیئر لگا ہوا تھا۔معلوم ہوا کہ یہ ہفتوں چلتا ہے اور مضافات کے علاوہ دوسرے شہروں سے بھی لوگ یہاں اس فیئر میں شریک ہونے کے لیے آتے ہیں۔ یہ فیئر کیا تھا موسم بہار کی آمد کا جشن تھا۔ جدھر دیکھو لڑکیاں اور عورتیں روایتی زرق برق لباس میں نظر آرہی تھی۔ مرد وعورت سب کے سب نئے ملبوسات میں تھے۔ٹرین میں بھی کئی لوگوں کی زبان سے فئیری فئیری کا لفظ سنا تھا۔ بعد میں سمجھ آیا کہ کوئی میلا لگا ہوا ہے جو ہفتوں تک چلتا ہے۔ پہلے تو ہم نے قیاس کیا کچھ بہت خاص ہوگا لیکن جب قرطبہ کے ایک خاص میدان میں جہاں میلا لگا ہوا تھا، وہاں گئے تو معلوم ہوا ہمارے ہندستان میں بھی اس طرح کے میلے لگتے ہیں۔ ہر طرف دکانیں سجی ہوئی تھیں۔تازہ انگور اور طرح طرح کی شراب کی دکانیں اور کھیلونے اور دیگر اشیا کی دکانیں سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے پورا شہر امڈ آیا ہو۔

ہم کورڈوبا (قرطبہ) ریلوے اسٹیشن اتر کر ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہمارا ریزرویشن ہی نہیں ہے۔ پہلے تو اس نے منع کیا کہ کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ جب ہم نے اپنے ریزرویشن کی رسید دیکھائی تو انھوں نے بتایا کہ یہ تو پچھلے مہینے کا ہے۔ یعنی ہم نے غلطی سے جون کے بجائے مئی لکھ دیا تھا۔ چونکہ کریڈیٹ کارڈ سے پیسے نکل چکے تھے جواب واپس بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ جب ہوٹل والے کو ہماری اپنی غلطی کا احساس ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ ہم ہندستان سے آئے ہیں تو انھوں نے ایک کمرہ دے دیا۔ لیکن کرایہ چار گنا زیادہ تھا۔ خیر ہم نے سامان رکھا۔ کچھ کھانے کے بعد ہم مدینۃ الزہرا کی جانب گھومنے گئے۔ حیرت ہوئی کہ مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئے کئی صدیاں بیت گئی ہیں مگر انھوں نے یہ نام تبدیل نہیں کیا۔ مدینۃ الزہرا کا بورڈ دیکھ کر ماضی کی تاریخ یاد آنے لگی کہ وہ کیسا دور رہا ہوگا جب اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت رہی ہوگی۔ (اس کو اسلامی تاریخ میں ہسپانیہ اور اندلس لکھا گیا ہے) یہ وہ ملک ہے جہاں علم طب، علم فلکیات، فکر وفلسفہ کے ساتھ فن تعمیر میں مسلمانوں کی اہم خدمات رہی ہیں۔ لیکن اب یہ وہی ملک ہے جہاں مسلمان ندارد ہیں۔ کہیں کوئی مسجد نہیں جہاں نماز اور اذان ہوتی ہو۔ کیونکہ اس ملک میں عیسائیوں کے ذریعے اسلام پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ اب جو مسلمان ہیں وہ نوکری یا تجارت کی غرض سے یہاں موجود ہیں۔

مسجد قرطبہ:

اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

شام ہوتے ہی بارش کا سلسلہ شروع ہوا تو ہم جلدی اپنے ہوٹل کے لیے روانہ ہوئے۔ صبح کو ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد مسجد قرطبہ کی زیارت کے لیے نکل پڑے۔ آہ! مسجد قرطبہ۔ دور سے ہی اس کے اونچے مینار نظر آئے اور فصیل نما بلند دیواریں۔ اندر داخل ہوئے تو ایسا لگا کسی قلعے میں داخل ہورہے ہوں۔ اندر میلے کی وجہ سے سیاحوں کی بڑی تعداد تھی۔ مسجد میں اس عریانیت سے چہل قدمی کرتی ہوئی لڑکیوں، عورتوں اور مردوں کو دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی۔ لیکن اب اس کا نام مسجد قرطبہ تو ضرور ہے مگر یہ اب مسجد کے بجائے کئی گرجا گھر پر مشتمل ایک عمارت ہے۔ صدر

دروازے سے داخل ہوکر ہم نے ٹکٹ خریدا۔ جب اسے یہ لگا کہ ہم ہندستانی یا پاکستانی ہیں تو ہمیں یہ تاکید کی گئی کہ آپ اندر نماز نہیں پڑھ سکتے، اذان نہیں دے سکتے۔ خیر صاحب یہ باتیں دل کو اور ٹھیس پہنچانے والی تھیں۔ ٹکٹ گھر کے پاس ہی ایک حصہ ایسا ہے جسے میوزیم کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس مسجد کی کچھ پرانی باقیات یہاں حفاظت سے رکھی ہوئی ہیں۔ مثلاً کچھ لکڑی کے دروازے اور کچھ پتھر اور دیگر سامان جن کو تبدیل کر دیا گیا یا جو دروازے خراب ہو گئے۔ ان کو سنبھال کر رکھا گیا ہے۔ یہ قابل تحسین بات تھی کہ انھوں نے اس کو محفوظ رکھا ہے۔

اس کے بعد ہم اندرونی حصے میں داخل ہوئے۔ مسجد کی کے اندر گرجا گھروں کو دیکھ کر حسرت و یاس کی لمبی سانس لی۔ درو دیوار سے شاندار ماضی کی تاریخیں جھانک رہی تھیں۔ منبر و محراب اور بلند ستونوں والی اس مسجد کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اندرونی عمارت میں اگر چہ کئی گرجے موجود ہیں لیکن شکر ہے کہ انھوں نے بنیادی عمارت سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی ہے۔ یہ مسجد اسلامی اور ہسپانوی طرز تعمیر کی واحد مثال ہے۔ اسپین میں اسلامی تاریخ کی یہ واحد نشانی ہے جو آج بھی طرز حکومت کے لیے ایک عبرت ہے۔ اس مسجد کی تفصیلات کو از سر نو لکھنے کے بجائے اردو وکی پیڈیا کا اقتباس درج کر رہا ہوں:

> ''یوں تو سرزمین اندلس پر مسلمانوں کے عہد زریں میں بہت سی دلکش و دلفریب عمارات تعمیر ہوئیں لیکن جو نفاست اور پاکیزگی جامع مسجد قرطبہ کے حصہ میں آئی وہ نہ تو الفاظ میں بیان کی جا سکتی ہے اور نہ ہی کسی اور ذریعہ اظہار سے اس کے حسن و جمال، تزئین و آرائش، نسخی گل کاریوں اور پچی کاریوں کی تفصیل پیش کی جا سکتی ہے۔ وہ ایسی دیدہ زیب عمارت تھی جسے بار بار دیکھنے کو جی چاہئے۔ اگر چہ گردش ایام کے تھپیڑوں نے اسے آج کچھ کا کچھ بنا دیا ہے لیکن پھر بھی اس کے حسن و خوبی اور جدت تعمیر و ندرت آرائش کے جو آثار زمانہ کی دستبرد سے بچ سکے ہیں اب بھی اپنے شاندار ماضی کی داستان زبان حال سے سناتے نظر آتے ہیں۔
>
> اس مسجد کی تعمیر کا خیال امیر عبدالرحمٰن اول المعروف الداخل (756-788)

کو سب سے پہلے اس وقت دامن گیر ہوا جب اس نے ایک طرف اندرونی شورشوں پر قابو پا لیا اور دوسری طرف بیرونی خطرات کے سد باب کا بھی مناسب بندوبست کر لیا۔ اس نے اپنی وفات سے صرف دو سال پہلے یہ کام شروع کرایا۔ امیر چاہتا تھا کہ مسجد کو اموی جامع مسجد دمشق کا ہم پلہ بنا کر اہل اندلس و مغرب کو ایک نیا مرکز عطا کرے۔ یہی وجہ تھی کی اس کی تعمیر کی نگرانی اس نے خود کی۔ یہ عظیم مسجد وادی الکبیر (ہسپانوی: Guadalquivir) میں دریا پر بنائے گئے قدیم ترین پل (اس پل کو رومی Marcellus Claudius نے تعمیر کروایا تھا) کے قریب اس جگہ واقع ہے جہاں پہلے سینٹ ونسنٹ (St. Vincent of Saragossa) کی یاد میں تعمیر کردہ ایک گرجا قائم تھا اور جس کا ایک حصہ پہلے ہی سے بطور مسجد مسلمانوں کے زیر تصرف تھا (الرازی)۔ السمح بن مالک الخولانی کے عہد میں جب قرطبہ دارالسلطنت بنا تو مسلمانوں نے مسجد کی توسیع کے لیے مسیحیوں سے باقی ماندہ حصہ خریدنے کی خواہش ظاہر کی مگر وہ مسلمانوں کی تمام تر رواداری کے باوجود اسے فروخت کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ لیکن جب عبدالرحمٰن الداخل کا زمانہ آیا تو اس نے بہت بھاری قیمت ادا کر کے پورا گرجا خرید لیا۔ قبضہ حاصل کر لینے کے بعد 786ء میں امیر نے اسے گرا کر اس کی جگہ ایک دیدہ زیب مسجد کی دیواریں کھڑی کر دیں۔ تعمیر کا کام جس ذوق و شوق سے شروع ہوا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ امیر نے دو سال کی قلیل مدت میں اس مسجد کی تعمیر پر 80 ہزار دینار خرچ کر دئے۔ مسجد کی بیرونی چار دیواری اتنی بلند و بالا اور مضبوط تھی کہ وہ شہر کی فصیل نظر آتی تھی۔ اس فصیل نما چار دیواری کو مزید مضبوط کرنے کے لیے اس کے باہر کی جانب تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر پہل پشتیبان (Buttressess) بنائے گئے تھے جن پر کنگرے بنے ہوئے تھے۔ مسجد کا بیرونی منظر؛ جس کو گوتھ طرز تعمیر سے

داغدار بنا کر اس کا تعمیر کے وقت کا اصل اسلامی انداز نوچ کر پھینک دیا گیا ہے۔
مسجد کی چھت بے شمار ستونوں پر قائم ہے جن کی ترتیب کچھ اس وضع پر ہے کہ ان کے تقاطع سے دونوں طرف کثرت سے متوازی راستے بن گئے ہیں۔ ان ستونوں پر نہایت ہی پر تکلف نعلی محرابیں (Arches Horseshoe) قائم ہیں۔ یہ نعلی محرابیں نہ صرف اس عظیم مسجد کا وجہ امتیاز ہیں بلکہ ہسپانوی طرز تعمیر کی پہچان بن چکی ہیں۔ جامع قرطبہ کے ان ستونوں پر دوہری محرابیں بنی ہوئی ہیں۔ یعنی ایک محراب پر دوسری قائم کر کے انہیں چھت سے ملا دیا گیا ہے۔ ان محرابوں پر کہیں کہیں قبّے بنائے گئے تھے جن میں سے چند ایک ابھی تک باقی ہیں۔ چھت زمین سے تیس فٹ کے قریب بلند تھی۔ جس کی وجہ سے مسجد میں ہوا اور روشنی کا حصول آسان ہو گیا تھا۔ چھت پر دوسو اسی جگمگاتے ستارے بنائے گئے تھے۔ جن میں سے اندرونی دالان کے ستارے خالص چاندی کے تھے۔ اس کے علاوہ چھت مختلف چوبی پٹیوں (Panels) سے آراستہ تھی۔ ہر پٹی پر نقش ونگار کا انداز مختلف تھا۔ مسجد کے وسط میں تانبے کا ایک بہت بڑا جھاڑ معلق تھا جس میں بیک وقت ہزار چراغ جلتے تھے۔ خاص دالان کے دروازہ پر سونے کا کام کیا گیا تھا۔ جبکہ محراب اور اس سے متصل دیوار سونے کی تھی۔ سنگ مرمر کے ستونوں پر سونے کے کام سے ان کی تزئین و آرائش کا کام نہایت نفاست سے کیا گیا تھا۔ عبدالرحمٰن الداخل کے بعد امیر ہشام اول (788ء-796ء) مسند امارت پر متمکن ہوا۔ اس نے بھی اس مسجد کی تعمیر وتوسیع کا کام جاری رکھا۔ اس نے تو اپنے دور حکومت کے سات سالوں میں تمام مال غنیمت کا پانچواں حصہ مسجد کی تعمیر پر خرچ کیا۔ اس عظیم الشان مسجد کا وہ عظیم مینار جو چہار پہلو تھا اسی کے زمانے میں تعمیر ہوا۔ اس مینار کا شمار عجائبات عالم میں ہوتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس یکتائے زمانہ مسجد کی تکمیل پر ماہ وسال

نہیں صدیاں خرچ ہوئیں۔ ہر امیر نے اپنی بساط اور ذوق کے مطابق اس پر
بے دریغ خرچ کیا۔ ہزاروں مزدوروں نے سینکڑوں معماروں کی معیت میں
اس مسجد کی تعمیر و آرائش پر اپنا خون پسینہ ایک کیا تب جا کر اسے وہ مقام حاصل
ہوا جو بہت کم عمارتوں کو حاصل ہے۔ ذیل میں اس مسجد کے بعض اہم حصوں پر
الگ الگ روشنی ڈالی گئی ہے۔''

(بحوالہ اردو وکی پیڈیا، آزاد دائرۃ المعارف)

https://ur.wikipedia.org/wiki/جامع_مسجد_قرطبہ

دیر شام تک مسجد قرطبہ میں رہے، کوشش کی کہیں نماز پڑھنے کا موقع مل جائے لیکن ممکن نہ ہوا۔ بالآخر ہم اس مصلے کی طرف گئے جہاں علامہ اقبال نے نماز پڑھی تھی۔ اس پورے حصے کو لوہے کی جالی سے گھیر دیا گیا ہے۔ میں خاموشی سے وہیں کھڑا ہو گیا اور اسی طرح کھڑے ہو کر اس طرح نفل ادا کی کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے۔ اس کے بعد دریائے کبیر کے کنارے دیر تک سیر کرتے رہے۔ یہاں بھی پل کے بالکل وسط میں ایک طاق نما جگہ بنی ہوئی تھی جہاں جس کے پاس ہی ایک چھوٹی دکان تھی جس میں موم بتیاں بک رہی تھیں۔ لوگ اس مقام پر موم بتی جلا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ لوگ اپنی منتوں کے لیے موم بتیاں جلا رہے تھے۔ یورپ جیسے ملک میں اس تو ہم کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اللہ سے دعا ہے اللہ اس مسجد کو پھر سے آباد کر دے۔

پیرس (فرانس)

دو دن کے لیے ہمیں پیرس جانا تھا۔ یہاں پہلے سے کوئی ادبی پروگرام طے نہیں تھا۔ صرف اس شہر کو دیکھنا مقصد تھا۔ پیرس میں کئی اردو ادیبوں اور شاعروں سے غائبانہ اور کچھ سے دہلی میں ملاقات ہو چکی تھی سو ہم نے انھیں اطلاع دے دی کہ ہم دو دن کے لیے پیرس میں ہوں گے۔ صدف صاحبہ نے سمن شاہ اور ممتاز ملک صاحبہ سے تعارف کرایا تھا۔ ان سے فون پر بات ہو چکی تھی۔ پیرس شہر کے کئی ایئر پورٹ ہیں۔ ہم جس ایئر پورٹ پر اترے وہاں سے شہر کی دوری 80 کیلو میٹر تھی۔ اس لیے ہم بس کے ذریعے پیرس پہنچے۔ بس اسٹینڈ سے تھوڑی دوری پر ہمارا ہوٹل

تھا۔صبح سے بارش کا موسم تھا ہم بھیگتے ہوئے ہوٹل پہنچے۔لیکن چیک اِن نہیں کر سکے کیونکہ دو بجے سے پہلے ہوٹل والے کسی طرح کمرہ دینے کو تیار نہیں ہوئے۔انھوں نے بس اتنا کرم کیا کہ سامان رکھ لیا۔اب ہم فریش ہوکر باہر جانے کی سوچ ہی رہے کہ محترمہ ممتاز ملک صاحبہ کا فون آ گیا۔ممتاز ملک صاحبہ پیرس میں جانی پہچانی شخصیت کی مالک ہیں۔ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں میں مصروف رہتی ہیں۔وہ ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں اور کالم نگار بھی۔ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔انھوں نے ہوٹل کا ایڈریس معلوم کیا اور کچھ ہی دیر میں ہوٹل پہنچنے کی بات کہی۔ہم منتظر ہی تھے کہ محترمہ سمن شاہ صاحبہ کا فون آیا۔بڑے جوش ولولے میں پوچھا بھائی آپ پہنچ گئے؟ کہاں رکے ہیں؟ ایسا لگ رہا تھا کہ جلدی جلدی میں وہ ساری باتیں معلوم کر لینا چاہتی تھیں تاکہ جلد ملاقات ہو سکے۔میں نے ان کو ہوٹل کا پتا بتایا۔اتنے میں ممتاز ملک صاحبہ اپنے شوہر نامدار کے ساتھ تشریف لے آئیں۔انھوں نے کہا کہ انھیں ایک گھنٹہ بعد بلائیں تاکہ ہم لوگ کچھ وقت گزار سکیں۔انھوں نے پھولوں کے گلدستہ سے ہمارا استقبال کیا اور اپنی کتابیں پیش کیں۔ان کے ساتھ پیرس شہر کی سیر کو نکلے۔ہلکی ہلکی بارش کا سلسلہ جاری تھا۔سب سے پہلے ایفل ٹاور گئے۔کچھ کھایا پیا۔اس دوران کئی بار سمن صاحبہ کا فون آ گیا تو انھیں بھی اسی جگہ بلالیا۔وہ آتے ہی محبت سے بولیں۔بھائی ہم کب سے منتظر تھے آپ نے اور انتظار کرادیا۔میں نے معذرت کی اس کے بعد وہ ہمیں ظہرانے کے لیے کسی ہوٹل میں لے گئیں۔ان کے شوہر بھی بڑے تپاک سے ملے۔سمن شاہ نفیس خاتون ہیں، بہت اچھی شاعرہ ہیں اور پیرس ادبی فورم کی صدر بھی ہیں۔وہ پیرس میں اکثر ادبی مذاکرے اور مشاعروں کا اہتمام کراتی رہتی ہیں۔مہجری شاعرات میں نمایاں نام ہے۔کھانے کے بعد شانزالیزے کی طرف گئے مگر اب بارش تیز ہو چکی تھی اس لیے کہیں جانا ممکن نہیں تھا۔تاہم انھوں نے اپنی کار سے ہمیں شہر کی کئی اہم جگہوں کی سیر کرائی۔

مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ پیرس جیسے شہر میں اردو کی سرگرمیاں موجود ہیں۔یہ شہر دنیا کے چند مشہور شہروں میں ہے۔یہ شہر یہاں کی مخصوص تہذیب و ثقافت کے لیے جانا جاتا ہے۔اس شہر کی اہمیت سے اکثر لوگ واقف ہیں اس لیے اس حوالے سے کچھ نہیں لکھوں گا۔البتہ یہ بتانا ضروری ہے کہ اس شہر کا اردو سے ایک خاص تعلق گارساں دتاسی کی وجہ سے ہے۔آج بھی اس

ادارے میں اردو کی تدریس کا نظم ہے۔ اداروں کے علاوہ کئی اردو کی ادبی تنظیمیں ہیں جو اردو کی شمع کو روشن کیے ہوئے ہیں۔

شام تک سمن شاہ اور شیخ صاحب کے ساتھ گھومتے رہے۔ انھوں نے ہمیں ہوٹل چھوڑ دیا۔ رات کو کھانے کے لیے ممتاز ملک صاحبہ نے کہہ رکھا تھا۔ ہوٹل سے ان کا گھر کچھ فاصلے پر تھا لیکن وہ ہمیں لینے آئیں اور ایک پاکستانی ریسٹورینٹ میں پر تکلف کھانے کے ساتھ پیرس میں ادبی سرگرمیوں پر باتیں ہوئیں۔ اس طرح پیرس کا پہلا دن ایسا گزرا کہ نئے شہر میں پہلی بار آنے کی اجنبیت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ دوسرے دن ہم نے ٹورسٹ بس سے اہم مقامات کی سیر کی۔ مگر بارش کے سبب شہر کو ٹھیک سے نہیں دیکھ سکے۔ رات کو بارش اور بھی تیز ہوگئی۔ اگلی صبح ہمیں کوپن ہیگن کے لیے نکلنا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری فلائٹ وہاں سے روانہ ہوئی۔ بعد میں خبروں سے معلوم ہوا کہ پیرس میں شدید بارش کے سبب سیلاب آ گیا تھا اور تمام فلائٹ رد ہو گئے تھے۔ شکر ہے اللہ کا کہ ہم وقت پر ڈنمارک پہنچ گئے۔

فرینکفرٹ (جرمنی)

ڈنمارک سے فرینکفرٹ آنے کا تجربہ بھی خوب رہا۔ یہاں جناب سید اقبال حیدر صاحب جو ایک اچھے شاعر، ادیب اور کالم نگار ہیں۔ ہمہ وقت ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ انھوں نے ''گفتگو'' نام سے ایک رسالہ جرمنی سے شروع کیا تھا اور اب آن لائن اردو اخبار جاری کیا ہے۔ جرمنی میں اردو کے علمبرداروں میں سید اقبال حیدر کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے ائیر پورٹ پر ہمارا استقبال کیا۔ اب بجائے ہوٹل کے وہ سیدھے ہمیں اپنے گھر لے گئے اور کہا کہ جب بھائی کا گھر موجود ہے تو ہوٹل میں رکنے کی کیا ضرورت۔ ان کی اس محبت کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔

یہاں انھوں نے ایک دن کا بین الاقوامی سیمنار ''اقبال اور گوئٹے'' کے عنوان سے رکھا تھا جس میں دہلی کے علاوہ جرمنی کے کئی شہروں سے ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ اس سیمنار میں انھوں نے اقبال ایوارڈ سے مجھے نوازا بھی۔ یہ سیمنار کئی معنوں میں بہت کامیاب رہا۔ جرمنی کے کئی ادیبوں سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا۔ چونکہ یہ ہماری یونیورسٹی میں چھٹیوں کے دن تھے لہٰذا ہم

یہاں کئی دن رکنے والے تھے۔ اقبال بھائی نے سیمنار کے بعد تفریح کا نظم کیا ایک دن تو فرینکفرٹ میں ہی رہے دوسرے دن ان کی گاڑی سے نیدرلینڈ اور بلجیم کے لیے نکلے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یورپ کا نظام کتنا اچھا ہے۔ جرمنی سے ہم نیدرلینڈ میں داخل بھی ہو گئے پتہ نہیں چلا کیونکہ کوئی بارڈر نہیں اور نا ہی کوئی چیکینگ بس دور سے ایک بورڈ نظر آیا جس میں 'نیدرلینڈ میں آپ کا استقبال ہے' لکھا ہوا تھا۔ یہاں ہم اقبال بھائی کے دوست جناب مہدی جعفر کے گھر گئے انھوں نے تپاک سے استقبال کیا۔ اس کے بعد انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس اور دیگر مقامات کی سیر کر کے شام کو واپس آئے۔

جناب مہدی جعفر محرم اور زیارتوں کے زمانے میں بہت اہتمام کرتے ہیں۔ اقبال بھائی بھی مذہبی، معاشرتی اور ثقافتی معاملات میں بڑے خلوص سے سارے اہتمامات کرتے ہیں اور نجف اشرف، کربلائے معلیٰ کی زیارتوں کے لیے اہل یورپ کے لیے تمام آسانیاں فراہم کرتے ہیں۔ نیدرلینڈ میں جناب مہدی صاحب بھی خدمت خلق میں پیش پیش رہتے ہیں۔ رات دیر تک ان سے باتیں ہوئیں۔ صبح کو ہم لوگ بلجیم کے لیے روانہ ہوئے۔ بلجیم کے شہر برسلز میں اقبال بھائی کی بڑی بہن رہتی ہیں۔ وہ ایک نیک خاتون ہیں اور وہاں دین کی تبلیغ میں مصروف رہتی ہیں۔ ان کے بیٹے اور بہو سے بھی ملاقاتیں ہوئیں انھوں نے ہمارا خوب خیال رکھا۔ وہ علی گڑھ سے تعلیم یافتہ ہیں۔ انھوں نے ہمیں بلجیم کے شہر برسلز کی سیر کرائی۔ ظہرانے بعد ان سے رخصت ہوئے۔

جرمنی کا شہر آخن

واپسی میں جرمنی کے شہر آخن میں یورپ کے مشہور خطاط پروفیسر شاہد عالم سے ملنا تھا۔ سید اقبال حیدر نے ہمارے بارے میں انھیں بتا دیا تھا اس لیے انھوں نے کہا کہ رات ہمارے یہاں ہی قیام کریں۔ ان کا گھر بہت کشادہ اور وسیع تھا۔ یہ ایک بڑا امکان تھا جسے انھوں نے بہت ہی فنکارانہ طور پر سلیقے سے سجا رکھا تھا۔ یہ شہر چاکلیٹ کے لیے بھی بہت مشہور ہے اور یہاں جرمنی کا قدیم گرجا گھر بھی ہے۔ جرمنی کے تاریخی شہر آخن میں آکر حیرت انگیز خوشی ہوئی۔ جرمنی کے ایک عظیم خطاط اور فنکار پروفیسر شاہد عالم سے ملاقات ہوئی۔ جرمنی میں رہتے ہوئے عربی، فارسی اور

اردو خطاطی کو جس انداز سے پیش کر رہے ہیں وہ قابل صد آفرین ہے۔ شاہد عالم صاحب نے اس فن میں جدت و ندرت پیدا کی ہے۔ انھوں نے رنگوں کے امتزاج سے بھی خطاطی کو ایک نیا طرز دیا۔ اس کے علاوہ لکڑی اور اسٹیل پر بھی خطاطی کا بہت بہتر طریقہ ایجاد کیا ہے۔ لکڑی پر بھی بہترین خطاطی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے گھر کے ایک بڑے حصے کو خطاطی کا کارخانہ بنا دیا ہے۔ ان کی خطاطی کی خاص بات یہ ہے کہ وہ عربی، اردو، فارسی کے ساتھ جرمن طرز کو بھی اپناتے ہوئے اپنا منفرد اسلوب بنایا ہے۔ اسی لیے گرجا گھروں میں بھی ان کی خوب نمائش ہوتی ہے۔ ان کی خطاطی کی پہلی نمائش اسی شہر کے مشہور گرجا گھر میں ہوئی تھی۔ پروفیسر شاہد عالم اپنی خطاطی کے ذریعے بین المذاہب اقدار کو فروغ دے رہے ہیں۔ ان سے خطاطی پر بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ وہ اپنے فن کے بارے میں ہمیں تفصیل سے بتاتے رہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جرمنی میں رہتے ہوئے انھوں نے کیسے یہ کام کیا اور کتنی محنت سے اس میں جدت پیدا کی کہ ان کی خطاطی کی نمائشیں یورپ کے مختلف ممالک میں ہوتی رہتی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ نمائش میں وہ ساز پر اپنی خطاطی کو پیش کرتے ہیں۔ پروفیسر شاہد عالم کے یہ تمام تجربے یقیناً خطاطی کے شعبے میں ایک نیا تجربہ ہے۔ اس سفر اور سفر کی حصولیابیاں ہمارے دوست اور بھائی جناب سید اقبال حیدر، فرینکفرٹ کے سر ہے جنھوں نے ہالینڈ اور بلجیم سے واپسی پر ان سے ملاقات کا اہتمام کرایا۔

برلن، میونخ، اسٹوٹ گارڈ، ہائیڈل برگ اور فرینکفرٹ

مئی 2018 میں دوبارہ تعلیمی سفر پر جرمنی کے کئی شہروں میں جانے کا موقع ملا۔ یہ سفر علمی تھا کیونکہ میونخ اور ہائیڈل برگ سے علامہ اقبال کے حوالے سے کچھ مواد جمع کرنا تھا اور کچھ لوگوں سے انٹرویو بھی لینے تھے اور برلن کے سیمنار میں شرکت کرنی تھی۔ ہائیڈل برگ اور میونخ میں علامہ اقبال نے حصول تعلیم کے لیے قیام کیا تھا اسی لیے کچھ چیزیں یہاں ابھی بھی موجود ہیں۔ ہائیڈل برگ کے شعبۂ اردو میں حکومت پاکستان نے باضابطہ 'اقبال چیئر' قائم کیا ہے جس کے تحت پاکستان سے اردو کی اہم شخصیات کو یہاں وقفے وقفے سے بھیجا جاتا ہے۔

اس سفر کے پہلے دن برلن جانا تھا۔ جناب سرور غزالی سکریٹری 'بزم ادب برلن' ایک سیمنار

منعقد کر رہے تھے جس میں مہمان خصوصی کے طور پر مجھے شریک ہونا تھا۔اس سیمنار میں سوئیڈن سے ہمارے دوست اور بھائی جناب عارف کسانہ صاحب اور جمیل احسن صاحب بھی شریک ہو رہے تھے۔عارف کسانہ جو بچوں کے ادیب ہیں۔ان کی کتاب 'سبق آموز کہانیاں' بہت مقبول ہوئی ہے۔اس کا تقریباً بارہ زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ان سے ہمارا برابر رابطہ رہا لیکن ملاقات اب ہونی تھی۔جمیل احسن بھی سوئیڈن میں مقیم ہیں وہ اردو کے اچھے شاعر ہیں اور ایک اردو کا رسالہ بھی نکالتے ہیں۔سوئیڈن کے دو عظیم قلم کار جناب عارف کسانہ جو "افکار تازہ" اور" سبق آموز کہانیاں" کے مصنف ہیں اور جناب جمیل احسن جو کہنہ مشق شاعر اور ادیب ہیں، سے ملاقات میرے لیے باعث اعزاز ہے۔انھوں نے ملاقات کی خاطر طویل مسافت طے کی۔ میں ان دونوں حضرات کا شکر گزار ہوں۔سوئیڈن میں بھی اردو کے احباب ادبی سرگرمیوں کے ذریعے زبان وادب کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔" سوئیڈن اسٹڈی سرکل" کے زیر اہتمام ہر ماہ نشستیں ہوتی ہیں۔میں ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی مصروفیات سے وقت نکالا اور برلن تشریف لائے۔فرینکفرٹ سے سید اقبال حیدر کے ساتھ ہم برلن آئے تھے۔ سب کے سب ایک ہی ہوٹل میں رکے۔لندن سے فہیم اختر صاحب بھی شریک ہو رہے تھے۔وہ کسی اور ہوٹل میں رکے۔ برلن پہنچنے سے پہلے ہی اردو کی اہم ادبی شخصیت جناب عارف نقوی صاحب کا فون آیا۔انھوں نے عشائیہ کی دعوت دی۔اس عشائیہ کی خاص بات یہ رہی کہ جو لوگ معاصرانہ چشمک کے سبب آپس میں ملتے جلتے نہیں تھے، وہ سب اس عشائیے میں شریک ہوئے۔انجمن کے صدر جناب عارف نقوی کے دیگر اراکین ڈاکٹر سنیل گپتا، دیوندر سنگھ، دھیرج رائے، طارق محمود، محمد سہیل اور پاکبان انٹرنیشنل کے ظہور احمد اس عشائیے میں شامل رہے۔

برلن، جرمنی میں اردو کی شمع روشن کرنے والے جناب عارف نقوی تقریباً پانچ دہائیوں سے برلن میں مقیم ہیں اردو زبان وتہذیب کی سرگرمیاں ان کے دم سے جاری وساری ہیں آپ "انجمن اردو" برلن کے بانی صدر ہیں۔ان کی صحت وسلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔برلن میں "بزم ادب برلن" کے سیکریٹری جناب سرور غزالی صاحب جو فکشن نگار اور شاعر بھی ہیں۔یورپ میں اردو زبان وادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔بزم ادب کے زیر اہتمام کئی تاریخی تقریبات کا

انعقاد کیا گیا ہے۔ ہر سال اس بزم کے تحت سالانہ ادبی تقریب اور مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ یہاں اردو کے احباب اور ان کی کاوشوں کو دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ بزم کے صدر جناب حیدر علی عابدی کافی معمر ہیں باوجود اس کے ان کی سرگرمیاں میرے لیے حیرت انگیز تھیں۔ اللہ انہیں صحت وسلامتی کے ساتھ رکھے۔ دعا ہے کہ ان کے ساتھ اردو کا کارواں آگے بڑھتا رہے اور اس کارواں میں ہر روز خوشگوار اضافہ ہوتا رہے۔ اس سیمینار میں کئی اہم ادیبوں اور شاعروں سے ملنے کا موقع ان میں مایا حیدر، نغمانہ کنول شیخ، طاہرہ رباب، سید اقبال حیدر، انور ظہر رہبر، نعمان سرفراز، مزمل لطیف، شاہ جی، سرور غزالی، ذاکر رضوی، خواجہ حنیف تمنا جمیل احسن، سید علی حیدر عابدی اور عارف نقوی شامل تھے۔ نئی نسل کے کئی شاعر بھی موجود تھے۔ ان کو دیکھ کر اردو کے مستقبل کی بشارت ملی۔

برلن میں عبدالمناف صاحب سے ملاقات ایک حیرت انگیز خوشی کا سبب تھی۔ یہ تقریباً دس سال پہلے کی بات ہے جناب عبدالمناف صاحب سے قلمی رابطہ تھا۔ میں نے اپنی کتاب "اردو زبان کے نئے تکنیکی وسائل" میں ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے اب برلن میں ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے پرلطف ظہرانے کا اہتمام بھی کیا اور یورپ کی ادبی سرگرمیوں اور صحافتی سرگرمیوں پر خوب باتیں بھی ہوئیں۔ برلن میں جناب نعمان توصیف صاحب کے ذریعے چلانے جانے والے ویب ریڈیو 'دیسی دھوم' کے اسٹوڈیو میں بھی جانے کا موقع ملا۔ یہ بہت جلد ایف ایم کے طور پر شروع ہونے والا ہے۔ اردو کی اس اہم پیش رفت پر نعمان صاحب اور ان کے رفقا کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ادبی ملاقاتوں اور تقریبوں کے علاوہ تفریح کے لیے چند گھنٹے ملے۔

جناب ملک امجد صاحب کے ساتھ برلن کے کچھ مقامات کی سیر کی۔ ملک امجد پر بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ حسّ مزاح ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان سے مل کر کچھ نئے انکشافات ہوئے۔ وہ برسوں سے برلن میں مقیم ہیں اور اب جرمن شہری ہیں۔ انھوں نے ایک جرمن خاتون سے شادی کی تھی۔ ان کی زندگی خوشحال تھی۔ بہت اچھے دن گزر رہے تھے کہ اچانک امجد صاحب کی طبعیت خراب ہوئی۔ معلوم ہوا کہ گردے میں کینسر ہے۔ اس مرض کی تشخیص کے بعد ان کی جرمن بیوی نے ان سے طلاق لے لی۔ کیونکہ اس مرض میں زندہ بچ جانے کی امید کم

تھی۔ خیر یہ ایک عجیب بات تھی۔ میرا خیال ہے کہ مادی دنیا میں شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔ کوئی مشرقی خاتون ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ مرتے دم تک وہ شوہر کی خدمت کرتی ہے۔ مگر یہاں معاملہ برعکس ہے۔ لیکن امجد صاحب نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ اسپتال میں تنہا رہے۔ لیکن برلن حکومت کی تعریف کرنی پڑے گی کہ انھوں نے نہ صرف علاج کا پورا خرچ ادا کیا۔ بلکہ وہ بحمد للہ اب ٹھیک ہو چکے ہیں لیکن ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق وہ کوئی کام نہیں کرسکتے اس لیے حکومت ان کو وظیفہ دیتی ہے۔ اور وہ خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ ان کو مزید خوشحال زندگی عطا کرے۔

دیوار برلن کی سیر کرتے ہوئے محسوس ہوا کہ دیوار برلن کے گرائے جانے کے بعد جس طرح اس دیوار کی باقیات انھوں نے یادگار کے طور پر ڈیولپ کیا ہے وہ قابل رشک ہے۔ دیوار تو گرادی گئی لیکن اس کی بنیاد اور بنیاد کے پتھروں کو بہت ہی خوبصورتی سے نمائش کے طور پر محفوظ رکھا ہے۔ دیوار سے متصل اکثر عمارتوں کی دیواروں پر خوبصورت نقاشی بھی کی گئی ہے۔ دیوار کے کچھ حصے کو اسی طرح سے محفوظ رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ حکومت نے تمام فنکاروں سے کہا کہ جو چاہے اس پر اپنی فنکاری کے نمونے بنا سکتا ہے۔ لہٰذا اب یہ دیوار فنکاروں کے فنی جوہر کا نمونہ ہے۔ جرمنی کے علاوہ دیگر ممالک کے فنکاروں نے بھی اس دیوار پر طرح طرح کی نقاشی کی ہے۔ یہ واقعی قابل دید ہے۔ برلن میں یہ مقامات سیاحوں کے لیے پرکشش ہیں۔

برلن میں موجود عالمی شہرت یافتہ لائبریری پہنچے۔ ہم اور ڈاکٹر رضوان دو دن تک اس لائبریری میں رہے اور اپنے مقصد کی کتابوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ لائبریری اس قدر منظّم ہے اور اتنے مخطوطات ہیں کہ اس کو دیکھنے کے لیے مہینوں کا وقت درکار تھا۔ ہم دونوں نے بہت سے مواد بھی حاصل کیا اور خالی وقتوں میں برلن کی سیر بھی کی۔

برلن سے واپسی کے بعد قیام جناب سید اقبال حیدر کے دولت کدے پر رہا۔ دوسرے دن ہائیڈل برگ یونیورسٹی گئے جہاں علامہ اقبال کچھ دنوں تک حصول تعلیم کی غرض سے قیام پذیر تھے۔ اقبال کی مشہور نظم یہیں دریائے نیکر کے کنارے لکھی تھی۔ یہاں اردو تدریس کا نظم ہے۔

جنوبی زبانوں کا مرکز، ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں فی الوقت ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ اردو کی استاد ہیں۔ کرسٹینا بہت شستہ اردو بولتی ہیں۔ ان کے لب و لہجے سے بالکل یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ یورپی خاتون ہیں۔ ان سے میری پہلے بھی ملاقات تھی۔ اس لیے وہ بہت گرمجوشی سے ملیں۔ اردو درس و تدریس سے وابستگی کے سبب مشرقی اصول سے واقف ہیں اسی لیے مہمان نوازی بھی خوب کی ورنہ یورپ میں یہ چیزیں عنقا ہیں۔ اس ملاقات میں جناب سید اقبال حیدر، شاعر و ادیب فرینکفرٹ اور ڈاکٹر رضوان الرحمان صاحبان بھی ہمراہ تھے ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں اردو کی استاد کرسٹینا صاحبہ اوران کے طالب علموں سے ملاقات کے ساتھ ہی اقبال کے حوالے سے گفتگو ہوئی اور اقبال چیئر کے امکانات پر تبادلۂ خیال ہوا۔

فرینکفرٹ واپسی پر اسی شہر میں مقیم اردو کی بہترین شاعرہ، فکشن نگار محترمہ فوزیہ مغل نے پرلطف عشائیہ کے بعد اپنی تازہ ترین تصنیف ''مائین کنارے'' عنایت کی۔ ایک دہائی سے بھی زیادہ کا عرصہ ہے کہ ان سے علمی و ادبی رابطہ رہا لیکن اب ملاقات کی سبیل نکلی تھی۔ اس ملاقات کو سید اقبال حیدر، ڈاکٹر رضوان الرحمان کی موجودگی نے مزید بامعنی بنا دیا، دیر تک یورپ اور ہند و پاک کی ادبی سرگرمیوں پر گفتگو ہوئی۔

جناب سید اقبال حیدر صاحب فرینکفرٹ میں اردو کی ادبی اور علمی محفلوں کا انعقاد کرتے رہتے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے اردو سے ان کا کوئی واسطہ نہیں لیکن اردو زبان وتہذیب کے فروغ میں کئی دہائیوں سے سرگرم ہیں انھوں نے ''حلقۂ ادب جرمنی'' اور ''ہیومن ویلفئر ایسوسی ایشن'' جیسی تنظیمیں بنائیں اور ہر سال متعدد محافل کا انعقاد کرتے ہیں۔ سید اقبال حیدر کی شاعری جدید آواز کی علمبردار ہے ان کی شاعری میں نئے جہات کے ساتھ ساتھ مشرقی اقدار و روایات موجود ہیں۔ ان کا لب ولہجہ سادہ و پُر کار ہے۔ یورپ میں رہتے ہوئے انھوں نے اردو تہذیب کو زندہ رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ سید اقبال حیدر کو ان کی ادبی خدمات کے لیے ''ورلڈ اردو ایسوسی ایشن، نئی دہلی'' نے ۱۴ مئی کو ''مہجری اردو ایوارڈ'' سے سرفراز کیا ہے۔ اسی موقعے پر اقبال صاحب نے برطانیہ کے ایک اہم ادیب حیدر طباطبائی پر بین الاقوامی سیمنار کا انعقاد کیا جس میں کئی ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔

ہماری تنظیم ورلڈ اردو ایسوسی ایشن جس کا مقصد عالمی سطح پر اردو کے ادیبوں، شاعروں اور قلمکاروں سے ربط واشتراک اور باہمی تعاون ہے۔ عنقریب یورپ میں ''مہجری تخلیقات : رجحانات ورویے'' کے عنوان سے ایک شاندار سیمنار کا انعقاد کرنے جارہی ہے۔ جس میں یورپ کی تمام ادبی تنظیمیں بھی شامل ہوں گی اور کوشش کی جائے گی کہ جو احباب یورپ میں اردو کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہے ہیں ان کو مدعو کیا جائے اور انھیں اعزازت سے نواز جائے گا۔

یورپ کے سفر کی کہانی ابھی جاری ہے۔

جنت نظیر جزیرۂ موریشس

موریشس کے بارے میں کسی مغربی سیاح نے لکھا تھا ''کہ خدا نے پہلے موریشس بنایا پھر اسی کے طرز پر جنت بنائی۔'' اس بات پر تو میں یقین نہیں رکھتا لیکن موریشس دیکھ کر ضرور یہ لگتا ہے کہ جب روئے زمین کا یہ سرسبز جزیرہ اتنا خوبصورت ہے تو جنت کیسی ہوگی؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ موریشس کا چھوٹا جزیرہ اپنی خوبصورتی میں بے نظیر ہے۔ ہر چہار جانب سے سمندر کے ساحل الگ الگ نظارے پیش کرتے ہیں۔ پانی کا رنگ بھی کہیں گہرا نیلا تو کہیں بالکل سبز، کہیں پتھریلے ساحلی کنارے ہیں تو کہیں ساحل پر ریت کی خوبصورت چادریں بچھی ہوئی ہیں۔ موریشس میں گھنے جنگلات بھی ہیں لیکن خاص بات یہ ہے کہ یہاں سانپ، بچھو بالکل نہیں اور نہ کوئی درندہ جانور رہے جو انسانوں کو نقصان پہنچاتے ہوں۔ یہاں کا موسم خوشگوار رہتا ہے۔ سردی میں نہ تو بہت سردی ہوتی اور نہ گرمی میں برصغیر جیسی سخت گرمی پڑتی ہے۔ اگر گرمی تھوڑی بڑھی تو بارشوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ موریشس گنّے کی کاشت کی وجہ سے مشہور رہا ہے۔ نئے صارفی دور میں اس کاشت پر لوگوں کی توجہ کم ہونے کے باوجود آج بھی گنے کی کاشت بہت ہوتی ہے۔ گنے کی میٹھاس کی طرح یہاں کے لوگوں کے اخلاق میں بھی میٹھاس پائی جاتی ہے۔ نہایت انکساری اور تواضع سے ملنا جلنا اور ایک دم میں اجنبیت کا مانوسیت میں تبدیل ہو جانا یہاں کی خاصیت ہے۔ موریشس کی اقتصادی قوت ٹورازم ہے۔ معاشی اعتبار سے موریشس کو بہت مضبوط تو نہیں کہہ سکتے لیکن بنیادی سہولیات موجود ہیں۔ کشادہ اور اچھی سڑکیں، الیکٹرسٹی کی فراوانی،

اشیائے خوردنی ہر طرح کی ملاوٹ سے پاک، اپنی ذمہ داریوں کے تئیں سنجیدہ لوگ موریشس کو ترقی کی جانب گامزن کر رہے ہیں۔ موریشس کا رقبہ وکی پیڈیا کے اعتبار سے 2,040 مربع کیلو میٹر ہے۔ آبادی بھی بہت زیادہ نہیں ہے 2016 کی اعداد و شمار کے مطابق یہاں کی آبادی تقریباً 1,277,459 ہے۔ موریشس میں سب سے زیادہ ہندو ہیں، اس کے بعد عیسائی اور مسلم ہیں۔ موریشس کے شہروں میں پورٹ لوئس اور موکا کافی مشہور ہیں۔ موریشس میں جسے گاؤں کہا جاتا ہے وہ دراصل شہر ہی ہیں لیکن بلدیاتی تقسیم میں انہیں دہی علاقے سے موسوم کیا جاتا ہے۔ موریشس میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مقامی زبان کیریئول ہے جو فرنچ سے بہت نزدیک ہے۔ اس کے علاوہ فرنچ، ہندی، اردو، بھوجپوری، تمل اور مراٹھی زبانیں بولنے والوں کی بھی اچھی تعداد ہے۔ موریشس میں برصغیر کے لوگوں کے لیے یہاں اجنبیت اس لیے بھی محسوس نہیں ہوتی کیونکہ یہاں اردو ہندی بولنے والوں کو کوئی پریشانی نہیں محسوس ہوتی تقریباً لوگ ان زبانوں کو سمجھتے اور بولتے ہیں۔ تہذیبی اعتبار سے یہاں کے لوگ اپنی اپنی معاشرتی شناخت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اسی لیے بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ ہم ہندستان کے کسی علاقے میں ہیں جہاں ویسی ہی تہذیبی رنگارنگی موجود ہے جیسے ہندستان میں موجود ہے۔

موریشس کی تاریخ بھی عجیب ہے کہ انگریزوں نے بڑی تعداد میں ہندستان سے غریب اور مزدور افراد کو دھوکہ دے کر جزیرۂ موریشس جانے کی ترغیب دی۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک ایسا جزیرہ ہے جہاں کسی بھی پتھر کو الٹو تو اس کے نیچے سے سونا نکلے گا۔ ہندستان کے معصوم اور مکر و فریب سے بیگانہ افراد اس دھوکے میں آ گئے۔ یہاں لا کر ان سے جس طرح کا غیر انسانی سلوک کیا گیا اور موریشس کے پہاڑی سلسلوں کے نشیب و فراز میں جس طرح راستے بنانے اور زمینوں کو کاشت کے لیے تیار کرنے کے لیے ان سے جتنی محنت و مشقت کرائی گئی اور جانوروں جیسا سلوک کیا گیا وہ واقعات بہت ہی دلدوز ہیں۔ آج کے موریشس کی تمام ترقیات بھی انہیں کے مرہون منت ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ اہل موریشس اپنی تاریخ کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہندستان سے جانے والے تمام افراد کی تصویریں اور دستاویزات مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کے میوزیم میں موجود ہیں۔

کچھ تصاویر اسلامک سینٹر، پورٹ لوئس میں بھی لگی ہوئی ہیں۔ انہیں تاریخی حوالوں سے اکثر اہل موریشس ہندستان میں اپنے اجداد تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ آج بھی اہل موریشس کا ہندستان سے ویسے ہی قریبی رشتہ ہے۔ ہندستان کو وہ آج بھی اپنا دوسرا گھر سمجھتے ہیں۔

موریشس میرے لیے بھی گھر آنگن کے مصداق ہے موریشس جاتے ہوئے مجھے کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ میں کسی غیر ملک کے سفر پہ ہوں۔ ایک دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ موریشس جاتے ہوئے تمام تیاریاں کرلیں گھر سے نکل بھی گیا راستے میں اچانک یاد آیا کہ میں نے پاسپورٹ تو لیا ہی نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہندستانیوں کے لیے آن آرائیول ویزے کا نظم ہے۔ اکثر دیگر ممالک کا سفر کرتے ہوئے سب سے پہلے میں پاسپورٹ ہی رکھتا ہوں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یورپی اور امریکی ممالک کے ویزا کے لیے جس قدر مشقت اٹھانی پڑتی ہے کہ ہمیشہ ذہن پر پاسپورٹ ہی سوار رہتا ہے۔ لیکن موریشس میں ویزا کی سہولت کی وجہ سے اور بار بار سفر کرنے کے سبب موریشس کو کبھی دوسرا ملک سمجھا ہی نہیں لیکن وجہ صرف یہی نہیں ہے بلکہ موریشس والے اس قدر محبت سے پیش آئے ہیں کہ ان کا گھر بھی مجھے اپنا ہی گھر لگتا ہے۔ ان میں اردو اسپیکنگ یونین کے صدر شہزاد عبداللہ احمد، محترم عنایت حسین عیدن، ان کی اہلیہ محترمہ ریحانہ عیدن، سابق نائب صدر موریشس جناب عبدالروف بندھن، ڈاکٹر آصف علی محمد، ڈاکٹر رحمت علی، ڈاکٹر نازیہ بیگم جافو، گلریز، انور دوست محمد، ڈاکٹر صابر گودڑ، رشید نیرواں، فاروق رجل، ریاض گوکھل وغیرہ کے نام قابل ذکر ہے۔ موریشس جانے سے پہلے میں موریشس والوں سے متعارف تھا۔ سب سے پہلے میری ملاقات جناب ڈاکٹر صابر گوڈر صاحب سے دہلی میں ہوئی تھی اس کے بعد جناب ڈاکٹر رحمت علی صاحب سے میری ملاقات دہلی میں ہی ہوئی۔ قومی کونسل کی دوسری عالمی کانفرنس کے موقع سے جناب شہزاد عبداللہ احمد، عنایت حسین عیدن، انور دوست محمد سے ہوئی۔ فون اور میل سے اکثر علمی اور ادبی رابطے رہے لیکن جناب رحمت علی صاحب، صدر شعبۂ اردو، مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر پہلی دفعہ ۲۰۱۵ میں موریشس کا سفر ہوا۔ مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ ہر سال ہندستان یا پاکستان سے کسی

اردو استاد کو بیرونی اکزامینر کے طور پر بلاتا ہے۔ ڈاکٹر رحمت علی صدر شعبۂ اردو کی تجویز پر مجھے دو سال کے لیے ایم جی آئی (مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ) نے بیرونی ممتحن مقرر کیا۔ جب میں نے موریشس کا یہ پہلا ادبی سفر کیا تو اس وقت ہیڈ شپ بدل گئی تھی اور ڈاکٹر آصف علی محمد اس وقت صدر شعبہ تھے۔

جون کا مہینہ تھا دہلی میں سخت گرمی تھی لیکن موریشس کی دوپہر جب میں رام غلام ائیر پورٹ سے باہر آیا تو ڈاکٹر آصف اور ڈاکٹر نازیہ بیگم جافو نے والہانہ طور پر میرا استقبال کیا۔ یونیورسٹی کی گاڑی سے ہوٹل کے لیے روانہ ہوئے۔ نازیہ سے دہلی میں ملاقات تھی مگر آصف صاحب سے یہ پہلی ملاقات تھی مگر محسوس نہیں ہوا کہ پہلی بار مل رہا ہوں۔ زبان ایک، تہذیب ایک، انداز ایک اور جس انداز سے وہ ملے اس نے ساری اجنبیت ایک ہی لمحے میں ختم کر دی۔ انھیں معلوم تھا کہ ائیر پورٹ سے ہوٹل کی مسافت تقریباً ایک گھنٹے کی ہے اس لیے کار میں ہی انھوں نے کھانے پینے کی اشیا پہلے سے رکھ لی تھیں، کار میں بیٹھتے ہی ضیافت شروع ہوگئی۔ رات کے پچھلے پہر چونکہ دہلی ائیر پورٹ پہنچ گیا تھا اس لیے میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں مگر موریشس کی تازہ ہواؤں نے ساری تھکن دور کر دی۔ ابھی گاڑی ائیر پورٹ سے باہر نکلی ہی تھی کہ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اس سہانے موسم اور احباب کے والہانہ استقبال سے میں باغ باغ ہو گیا۔ قطر بورن میں ہوٹل کا انتظام تھا وہاں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا جناب رحمت علی صاحب تشریف فرما ہوئے۔ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس بات کا جائزہ لیا کہ مجھے کوئی تکلیف نہ ہو۔ ہم سب نے ساتھ چائے پی اور طے ہوا کہ ابھی شام ہونے میں دیر ہے تو کیوں نہ مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ چلا جائے۔ میں رحمت صاحب کی کار میں بیٹھ گیا۔ علمی اور ادبی باتیں ہوتی رہیں۔ نازیہ اور آصف صاحب بھی پہنچ چکے تھے۔ اب پروگرام طے ہونا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ رحمت صاحب اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن آصف اور نازیہ صاحبہ نے کچھ اور پروگرام بنا رکھا تھا لہٰذا رحمت صاحب سے اجازت لے کر آصف صاحب اور نازیہ کے ساتھ ٹری یولے کی طرف چل پڑے۔ نشیب وفراز اور خوشگوار پہاڑیوں کے دامن سے گزرتے ہوئے آصف صاحب کے گھر پہنچے۔ چائے کی خواہش بالکل نہیں

تھی مگر آصف صاحب کی اہلیہ اعظمی صاحبہ نے اہتمام کر رکھا تھا۔ آصف صاحب نے شام ہونے سے پہلے تفریح کا پروگرام پہلے ہی سے بنا رکھا تھا۔ اسی لیے ان کی بیگم صاحبہ، ان کی بیٹی انجم اور بیٹے ایان کے ساتھ سمندر کے کنارے پہنچے۔ سورج ڈھل رہا تھا سنہری دھوپ اس منظر کو اور بھی خوشگوار بنا رہی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے سورج سمندر میں ڈوبنے والا ہے۔ یہ ساحل کا وہ حصہ تھا جہاں ایک جانب ریت تھی تو کچھ ہی دوری پر چھوٹے، بڑے پتھروں کا ساحلی کنارہ۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان پتھروں کو بڑے سلیقے سے سجایا گیا ہو۔ شام ڈھلنے تک ہم لوگ ان نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ گھر پہنچتے ہی عشائیہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس کے بعد آصف اپنی فیملی کے ساتھ ہوٹل چھوڑنے آئے۔ موریشس کے بارے میں سنا تھا کہ شام ہوتے ہی سناٹا چھا جاتا ہے سو آج دیکھنے کو ملا۔ نہ سڑک پر ٹریفک تھی اور نہ آنے جانے والے لوگ، ہماری ہی طرح کے کچھ لوگ اپنی اپنی منزلوں کی جانب رواں دواں تھے۔ معلوم یہ ہوا کہ سورج جب بھی ڈھلے یہاں کے بازار چار پانچ بجے سے ہی بند ہونے لگتے ہیں۔ موریشس کی یہ پہلی رات تھی کسی طرح کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ اس سفر میں سات دن کا قیام تھا۔ ایک دن نازیہ جافو اور ان کے والد کی ہمرہی میں موریشس کی سیر کی۔ باقی کے دنوں میں بھی کئی لوگ ملتے رہے لیکن آصف صاحب نے خوب مہمان نوازی کی۔ یونیورسٹی کے کام بھی ہوتے رہے اور سیر و تفریح بھی۔ ایک شام اردو اسپیکنگ یونین نے عشائیہ کا اہتمام کیا جناب شہزاد عبداللہ نے سفارت ہند و پاک کے علاوہ موریشس کی ادبی اور علمی شخصیات کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ اس عشائیے میں عالمی کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں لائحہ عمل طے کیا گیا۔

اردو اسپیکنگ یونین کی دعوت پر نومبر ۲۰۱۵ میں موریشس کا سفر تاریخی سفر تھا۔ عالمی کانفرنس کے سلسلے میں جناب شہزاد عبداللہ صاحب نے مجھے ابتداء سے ہی مشورے میں شامل رکھا۔ ہندستان اور دیگر مما لک سے مندوبین کی ذمہ داری بھی مجھے دی جو میں کسی حد تک نبھا سکا۔ میری گزارش پر احباب نے لبیک کہا اور اس عالمی کانفرنس میں شریک ہو کر میری عزت افزائی کی اس کے لیے میں پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر انوار پاشا، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر تحسین فراقی،

پروفیسر جلال الحفناوی، ڈاکٹر محمد کاظم اور شگفتہ یاسمین کا شکر گزار ہوں۔

موریشس کے اس سفر کا اتفاق ایسا رہا کہ سفارت ہند کے مندوبین اور ہمارا گروپ ایک ہی فلائٹ سے موریشس پہنچے۔ ائیر پورٹ پر اردو اسپیکنگ یونین کی جانب سے استقبال کرنے والوں میں فیاض، جمیلہ، شب نیز، نوشین، نوشاد شیخ وغیرہ موجود تھے۔ بڑی محبت اور عقیدت سے انھوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ان کا والہانہ پن دیکھنے کے لائق تھا ہر فرد مہمانوں پر بچھا جا رہا تھا، گاڑی میں سوار ہوتے ہی پانی اور جوس کے ساتھ کوئی موریشس کی تاریخ بتانے میں مصروف تھا تو کوئی سامنے آنے والی عمارتوں اور سڑکوں کی تفصیل بتا رہا تھا، کوئی موریشس میں دوران قیام کسی طرح کی ضرورت کے لیے اپنی خدمات پیش کر رہا تھا۔ ان کی دلچسپ اور پُر شوق گفتگو، موریشس کا خوشگوار موسم اور سر سبز و شاداب سرزمین کے نظاروں سے احباب لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ جائے قیام تک ہماری گاڑی پہنچ گئی۔ سب کا ایک ہی ہوٹل میں قیام رہا اس لیے پورا ہوٹل ہندستان ہی نظر آ رہا تھا۔ تقریباً پچیس مہمان ایک ہی ہوٹل میں تھے تو نظارہ ایسا ہونا ہی تھا۔ سب اپنے اپنے روم میں داخل ہوئے۔ کہا گیا کہ کچھ دیر آرام کر لیں اس کے بعد اردو اسپیکنگ یونین کے دفتر میں استقبالیہ کا پروگرام اور عشائیہ ہے۔ پروگرام طے کرنے کی غرض سے میں ذرا پہلے یو ایس یو (اردو اسپیکنگ یونین) کے دفتر پہنچ گیا اس کے بعد موریشس کی اہم ادبی شخصیات کے ساتھ سفارت خانۂ ہند، موریشس کی جانب سے جناب جندل صاحب، پاکستانی سفارت خانے سے جناب ندیم صاحب اور تمام مہمان جلوہ گر ہوئے، سب کا رسمی تعارف ہوا۔ ہوٹل واپسی پر ہندستان سے قوالی کی ٹیم کی جانب سے قوالی کا مختصر پروگرام پیش کیا گیا۔ تمام مہمان اس سے خوب لطف اندوز ہوئے۔ رات کافی ہو چکی تھی اور موریشس تو بہت پہلے ہی سو چکا تھا کیونکہ یہاں شام ہوتے ہی کوئی نظر نہیں آتا اس لیے ہم بھی سو گئے۔ اگلی صبح جلد تیار ہو کر ریسٹورینٹ میں ناشتے کے لیے پہنچے تو تمام رضا کاروں نے پُر تپاک خیر مقدم کیا۔ ناشتے سے زیادہ لطف مندوبین اور مقامی لوگوں سے ملنے جلنے میں آ رہا تھا۔ مختلف گاڑیوں اور بس سے یہ قافلہ اندرا گاندھی سینٹر پہنچا جہاں

ایک شاندار بڑے سے ہال میں بڑی تعداد میں اردو کے شائقین موجود تھے۔ پروگرام مقررہ وقت پر شروع ہوا۔ جمہوریہ موریشس کی صدر محترمہ ڈاکٹر آمنہ غاریب فاکم نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا۔(پروگرام کی تفصیلات اور روداد میری کتاب ''اردو کا عالمی تناظر''میں موجود ہے)

سہ روزہ پروگرام کے اختتام کے بعد دو دنوں تک اردو اسپیکنگ یونین کی جانب سے موریشس کی سیر وسیاحت کا پروگرام رکھا گیا۔ مہمان نوازی کا یہ انداز تمام مندوبین کو بہت پسند آیا۔ یوں تو موریشس اس قدر خوبصورت ہے کہ جس طرف بھی نکل جائیں قدرت کے حسین نظارے دیکھنے کوملیں گے۔لیکن ان نظاروں سے زیادہ اردو کی اہم شخصیات کے ساتھ تفریح کرنا تاریخی تھا۔ ہر شام دعوتوں کا اہتمام تھا۔ دیر رات ہم سب لوٹ کر ہوٹل پہنچتے ،سب کی زبان پر اردو اسپیکنگ یونین کی تعریف ہوتی۔ان محفلوں کو پاکستان کے مشہور ومعروف گلوکار جناب عدیل بُرکی زعفران زار کرتے۔طبعاً عدیل برکی پُر مزاح ہیں کبھی کبھی اردو کے جملوں کو توڑ موروڑ کر ایسا ماحول بناتے کہ ہنستے ہنستے لوگ بے حال ہو جاتے۔غائبانہ،اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن عدیل برکی کی صرف یہی خوبی نہیں ہے وہ اچھی غزلیں لکھتے ہیں۔لگا تار دو تین گھنٹے گا سکتے ہیں اور کسی بھی گانے، نغمے یا قوالی کی فرمائش کی جاتی تو وہ نوٹ بک کا سہارا نہیں لیتے ،غضب کے ذہین ہیں اور اسی قدر مخلص بھی۔ پروفیسر تحسین فراقی صاحب جو ہم سب میں سنئیر ہیں لیکن وہ بھی اس رنگ میں رنگ گئے۔ بڑے ہونے کا یہ بھی ایک ثبوت ہے کہ ان کی ذات سے کسی کو تکلیف یا تکلف نہ ہو۔ اس سفر میں پروفیسر ذوالقرنین صاحب سے ملاقات ایک اہم یافت رہی۔کراچی شعبۂ اردو کے سربراہ اور ذی علم شخصیت، انتہائی بُردبار لیکن احباب کی محفلوں میں وہ ہمارے ساتھ ساتھ اسی طرح رہے جیسے ہم سب تھے۔آخری شام سابق نائب صدرِ جمہوریہ موریشس عبد الرؤف بندھن صاحب نے کھانے پر مدعو کیا جس میں ہم چند احباب ہی شامل ہو سکے کیونکہ بہت سے لوگ جا چکے تھے۔ جمہوریہ موریشس کے سابق نائب صدر جن کی عمر اسی سال ہے وہ ہر پروگرام میں برابر شریک رہے اور دلچسپی لی۔انھوں نے ہندستانی مہمانوں کے لیے اس دعوت کا اہتمام ایک شاندار

ریسٹورنٹ میں کیا۔ ہم لوگوں سے ہندستان کے بارے میں خوب خوب باتیں کیں اور موریشس میں اردو کے فروغ کے لیے وہ متفکر نظر آئے وہ چاہتے ہیں کہ موریشس میں اردو زبان اور اردو تہذیب زندہ رہے کیونکہ یہ ان کی تہذیبی شناخت ہے۔ اس سلسلے میں خود ان کی خدمات نہایت اہم رہی ہیں۔ لیکن نئی نسل سے ان کی توقعات زیادہ ہیں۔ ان کی گفتگو سے وہ اردو کے سچے ہمدرد نظر آئے۔ آخری دن یواس یو کے سیکریٹری انور دوست محمد صاحب سب سے ہوٹل ملنے آئے۔ رضا کاروں سے اب تک اس قدر انسیت ہوگئی تھی کہ وہ ہمیں رخصت کرتے ہوئے آبدیدہ ہوگئے۔ کئی بچے بچیوں نے ہم سب کے لیے تحائف لائے۔ یہ ادبی سفر اس طرح ایک ثقافتی سفر میں تبدیل ہوگیا اور موریشس ہمارے دلوں میں نقش ہوگیا۔

اس کے بعد بھی موریشس کے کئی سفر ہوئے۔ تمام اسفار اہل موریشس کی محبتوں کی ناقابل فراموش یادگار ہیں۔

○○○

مصر سرزمین انبیاء واولیاء

مصر کو اسلامی تاریخ اور تہذیبی وثقافتی اعتبار سے دنیا بھر میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اسلامی تاریخ کے اہم شہروں میں قاہرہ کو سرفہرست رکھا جاتا ہے۔اس کی وجہ اس کی قدیم ترین تہذیب ہے۔لیکن اس سے بھی اہم شہر سازی کے نقطۂ نظر سے اس شہر کو جانا جاتا ہے۔علمی اعتبار سے بھی قاہرہ کو عالم اسلام میں مینارۂ نور کہا جاتا ہے کیونکہ قاہرہ میں الجامعۃ الازہر، جسے ازہر یونیورسٹی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے،اس کی ہزار سال سے بھی زائد کی تاریخ ہے۔قابل غور یہ ہے کہ عالم اسلام میں اسے اس لحاظ سے اولیت کا شرف تو حاصل ہے ہی لیکن دنیا کے دیگر ممالک کے مدمقابل بھی دیکھیں تو ایسے تعلیمی ادارے کی تاریخ کم ہی ممالک کے پاس ہے۔مصر کو اس کے علاوہ بھی کئی اعتبار سے دنیا میں شہرت حاصل ہے۔مصر کا شہر قاہرہ دنیا بھر کے سیاحوں کا پسندیدہ شہر ہے۔شاید ہی دنیا کا کوئی ایسا ملک ہو جہاں کی کتابوں میں قاہرہ کا ذکر نہ ہو۔اہرامات مصر، ابوالہول، دریائے نیل کی حسین وادیاں، مصر کا عالمی شہرت یافتہ اور تہذیبی آثار سے مالا مال وہاں کا مصری میوزیم (المتحف المصر ی) لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔اس اعتبار سے مصری لوگ اپنی تہذیب وثقافت اور اسلامی روایات پر جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔

قاہرہ کو دنیا کے اہم ترین شہروں میں سے ایک ہونے کا فخر وامتیاز اگر حاصل ہے تو اس کی ایک وجہ یہاں کے لوگوں کا اخلاق اور حسنِ سلوک بھی ہے۔ یہاں کی ضیافت اور مہمانوں کی دلجوئی کے بارے میں بارہا اپنے بزرگوں سے میں نے سنا تھا لیکن اللہ نے مجھے بھی یہ موقع عنایت کیا کہ میں نے اس شہر اور اس ملک کو دیکھا اور یہاں کی میزبانی اور مہمان نوازی سے سرفراز ہوا۔اس

میز بانی اور دلجوئی اور مہمان نوازی کو لفظوں میں بیان کرنا ذرا مشکل ہے۔

3 مارچ 2018 کو پروفیسر یوسف عامر اور ڈاکٹر رانیا فوزی کی دعوت پر مصر جانے کا موقع ملا۔ مصر میری تمناؤں اور آرزوؤں کا ملک ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ موقع نصیب ہوا اور مصر کی سرزمین کی زیارت نصیب ہوئی۔ اس سرزمین کو دیکھنے کی خواہش اس لیے بھی تھی کہ قرآن پاک میں اس کا ذکر آیا ہے۔ یہ انبیائے کرام، صحابہ کرام، اولیائے عظام کی سرزمین رہی ہے۔ تہذیبی اعتبار سے بھی اس ملک کو دنیا میں امتیاز حاصل ہے لیکن میری خوشی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ یہاں اردو کے احباب، طلبہ وطالبات سے ملاقات ہوگی۔ یہ ملاقات بھی ایسی رہی کہ تاحیات اس کو فراموش کرنا ممکن نہیں۔ اہل مصر کی ضیافتوں اور مہمان نوازیوں کے بارے میں سنا تھا لیکن مجھے جس طرح لوگوں نے سرآنکھوں پر بٹھایا اور جس طرح کی ضیافتوں سے سرفراز کیا اسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ میری حیرت اس وقت اور بڑھی جب اردو کے طلبہ و طالبات نے گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ ہر استاد اور طالب علم مجھ سے باتیں کرنا چاہتے تھے۔ اہل عرب سے اردو میں باتیں سننا میرے لیے خوشگوار تھا کیونکہ ان کے لہجے میں عجیب سی شیرینی تھی وہ حروف جو عربی میں موجود نہیں ان کی ادائیگی بھی اہل عرب کے لیے مشکل ہے لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ اساتذہ نے بڑی محنت کی ہے اسی لیے ٹ، ٹھ، ڑ، ڑھ، پھ، چھ وغیرہ کی درست ادائیگی ان کی زبانی بہت اچھی لگتی تھی۔ میری خواہش ہوتی کہ میں دیر تک ان کی گفتگو سنتا رہوں مگر مشکل یہ تھی وہ مجھ سے بھی سننا چاہتے تھے۔ طالب علموں کا اشتیاق دیکھ کر حیرت انگیز خوشی ہوئی کہ وہ اہل زبان سے ملنا، باتیں کرنا، ضیافت کی ہر ممکن کوشش کرنا اور اس بات کا لحاظ رکھنا کہ مجھے کسی طرح کی تکلیف نہ ہو۔ یہ سب وہ باتیں ہیں جس نے مجھے از حد متاثر کیا۔ اپنے دس دن کے سفر میں میں نے مختلف یونیورسٹیز میں اردو کے اساتذہ وطلبہ سے ملاقات کی اور ان سے گفتگو کی۔ اس سفر کو میرے ریسرچ اسکالر مصطفیٰ علاء الدین نے مزید خوشگوار بنا دیا۔ مصطفیٰ کی نیازمندی اور علم دوستی میرے لیے ایک نعمت ہے۔ اچھا شاگرد ملنا کسی استاد کے لیے بڑی نعمت ہے اساتذہ شاگردوں سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے کئی بہت اچھے شاگرد ملے ہیں جن کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ لیکن میں یہاں مصطفیٰ اعلیٰ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ انتہائی مہذب، پرخلوص، جاں

نثاری کا جذبہ، خدمت کرنے کا ہنر، خندان پیشانی سے ملنا اور تعلیم و تدریس کے تئیں حد درجہ التفات، یہ چند خوبیاں ہیں جو انھیں ممتاز کرتی ہیں۔ میرے مصر کے دورے کو آسان اور بامعنی بنانے میں ان کا اہم کردار ہے۔ اللہ انھیں سلامت رکھے، دونوں جہان میں سرخرو کرے اور کامیابیاں عطا فرمائے۔ میرا قیام مصطفیٰ کے گھر ہی تھا۔ اس علاقے کا نام حلوان ہے ان کے والدین اور بھائی انتہائی خلوص سے ملے۔ انھوں نے ہر طرح سے میرا خیال رکھا۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میں کسی اور گھر میں ہوں۔

دو پہر کو ہم حلوان پہنچ چکے تھے۔ کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کیا۔ اسی شام کو جناب عطیف قادری صاحب سے مسجد حسین میں ملنا طے پایا۔ اس سفر میں میرے عزیز اور محترم بھائی جناب عطیف قادری اور ان کے ساتھ عزیزی عبدالعلیم اور جناب امیر رضا صاحب سے ملنا ایک بڑی نعمت تھی۔ جناب عطیف قادری خانقاہ قادریہ بدایوں شریف کے چشم و چراغ ہیں۔ یہ خانقاہ ہندستان کے قدیم خانقاہوں میں سے ایک ہے۔ اس خانقاہ کی بڑی خدمات ہیں۔ مسجد حسین کے باہر ہی عطیف صاحب ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ اس مسجد کو ''مسجد حسین'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سرِ اقدس یہیں دفن ہے۔ تاریخ میں اس حوالے سے اختلافات بھی ہیں۔ بعض تاریخوں میں حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر اقدس کا مدفن ملک شام بتایا گیا ہے۔ لیکن مستند تاریخ کی روایتوں سے یہی اصل مدفن ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم زیارت سے سرفراز ہوئے۔ زیارت اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد اسی سے متصل قاہرہ کا قدیمی اور روایتی بازار خلیلی گھومتے رہے۔ اس علاقے میں فاطمی عہد کی کئی مسجدیں اور عمارتیں موجود ہیں۔ یہاں کی مسجدیں اپنے فن تعمیر کے لحاظ سے بہت اعلیٰ ہیں۔ قدیم مساجد کے مینارے اور جدید میناروں کے درمیان واضح فرق موجود ہے۔ عطیف صاحب ہمیں ان کی تاریخ بتاتے رہے۔ رات کو انھوں نے خالص مصری انداز کے ہوٹل میں کھانا کھلایا۔ آج بھی اس کی لذت کو محسوس کرتا ہوں کیونکہ اس ذائقے میں عطیف صاحب کی محبت بھی شامل تھی۔ رات زیادہ ہو رہی تھی اس لیے ان سے رخصت ہو کر حلوان کے لیے روانہ ہوئے۔

مصراردو کی تابناک سرزمین

اردو کی نئی بستیوں کا جب بھی ذکر آتا ہے اکثر ہم یورپ وامریکہ سے اس کی ابتدا کرتے ہیں اوراسی پر بات ختم بھی ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو کی دیگر بستیوں سے پہلے یورپ وامریکہ میں اردو پہنچی اور یہاں کے ادیب وشاعر یقیناً قابل مبارکباد ہیں جواردوزبان وتہذیب کوزندہ و تابندہ رکھے ہوئے ہیں۔لیکن اس کے علاوہ بھی اردو کی کئی اہم بستیاں ہیں جن تک ہماری رسائی کم ہوئی ہےاوران کواس طرح نہیں سراہا گیا جتنا کہ وہ مستحق ہیں۔ان بستیوں میں مصرسرفہرست ہے جہاں اردو کی تعلیم وتدریس اورتصنیف وتالیف کا کام بڑے پیمانے پر ہورہا ہے۔ایسا لگتا ہے ہم اردووالوں نے یہاں کے ادیبوں اوراساتذہ کی خدمات کونظرانداز کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دانستہ ایسا ہوا ہے شاید روابط کی کمی کے سبب اردودنیا میں بالخصوص مصرکو متعارف کرانے میں ہم اردووالوں سے کوتاہی ضرور ہوئی ہے۔

مصراگرچہ افریقہ براعظم کا حصہ ہے لیکن یہاں کی تہذیب پورے طور پرعربی تہذیب ہے۔ بلکہ اس کی تہذیب خود اپنے آپ میں مایہ ناز ہے۔عربی زبان کا ملک ہونے کے باوصف اس ملک نے دیگر مشرقی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کی آبیاری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔کالج سے یونیورسٹی کی سطح تک اردو کی تدریس اورریسرچ کے حوالے سے مصر کے اہل اردو کا بڑا کام ہے۔ انھوں نے اردو زبان کی تعلیم کے ذریعے برصغیر سے تہذیبی روابط کو بحال کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اردو،عربی کے بعد دنیا کی دوسری بڑی زبان ہے جس نے تہذیبی وثقافتی اعتبار سے دنیا کے طول وعرض کا سفر کیا ہے۔یعنی تہذیبی ہجرت کے لحاظ سے اردو دنیا کی دوسری بڑی زبان ہے۔ یہ اردووالوں کے لیے باعث فخر ہے۔لیکن اس فخر ومباہات کا ذکر اب تک ہم اس تزک واحتشام سے نہیں کر پائے ہیں جتنا کہ ہونا چاہیے تھا۔شاید اس معاملے میں خود ہم اپنی دور افتادہ تہذیبی وراثتوں سے یا تو واقف نہیں ہیں یا مزید تلاش وجستجو کی کوشش نہیں کرتے ورنہ اردو کے تلاطم خیز سمندر، اس کی موجوں کی طغیانی اوراس کی تہوں میں ابھی بھی بہت سے دُرِنایاب موجود ہیں۔

ان بستیوں میں مصر کی سر زمین بھی ہے جس نے اردو کے گیسو کو سنوارنے، سجانے اور نکھارنے میں قابل قدر خدمات انجام دی ہے۔لیکن اردو کی بستیوں کے ذکر میں ہم مصر کو وہ مقام نہیں دے سکے جس کا وہ مستحق ہے۔مصر میں اردو کے طلبہ واساتذہ کی تعداد کو دیکھیں یا اردو تصنیف و تالیف کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں اساتذہ، طلبہ وطالبات اردو کی تعلیم و تدریس میں مصروف عمل ہیں۔ کالج سے یونیورسٹی کی سطح تک اور پی۔ایچ۔ڈی کی سند کے حصول تک کا سفر اردو کے لیے فال نیک ہے۔مصر میں فی الوقت طلبہ و طالبات اور اساتذہ کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔جن یونیورسٹیز میں ارود کی تعلیم وتدریس کا باضابطہ نظم ہے۔ ان میں ازہر یونیورسٹی کے دوشعبے (لڑکیوں اورلڑکوں کے لیے الگ الگ) عین شمس یونیورسٹی، قاہرہ یونیورسٹی، اسکندریہ یونیورسٹی، طنطا یونیورسٹی اور منصورہ یونیورسٹی کے نام قابل ذکر ہیں۔ازہر یونیورسٹی کا شعبہ اُردو برائے خواتین اوراز ہر یونیورسٹی کا لڑکوں کے لیے شعبہ اردو، عین شمس یونیورسٹی اور قاہرہ یونیورسٹی میں سنجیدہ موضوعات پر تحقیقی مقالے بھی لکھے جارہے ہیں۔

مصر میں اردو کی تاریخ کی ایک صدی بھی ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے لیکن اس کے کارنامے حروف زریں سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ہمارے محترم دوست ڈاکٹر پروفیسر یوسف عامر، وائس چانسلر ازہر یونیورسٹی جو بنیادی طور پر اردو کے پروفیسر ہیں، سے اس سلسلے میں ہماری اکثر گفتگو ہوئی ہے۔ انھوں نے مجھے مصر میں اردو کی تاریخ کے حوالے سے چند اہم موڑ کی نشاندہی کی۔اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر پروفیسر ابراہیم محمد ابراہیم، ڈاکٹر احمد القاضی اور ڈاکٹر جلال السعید الحفناوی کے مضامین سے مصر میں اردو زبان کی نشو ونما اور ارتقا کا علم ہوا۔ابھی میرے سامنے ڈاکٹر ابراہیم کا مضمون ہے جو عربی زبان میں ہے۔ میں نے اپنے مصری شاگرد مصطفیٰ علاء الدین کی مدد سے اسے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ڈاکٹر ابرہیم کا یہ مضمون کافی طویل اور مفید مطلب ہے لیکن کچھ اقتباسات کا مفہوم اس طرح ہے:

> ’’سنہ 1930ء میں بڑی تعداد میں ہندو پاک کے لوگ مصر تشریف لائے۔ یہ لوگ اردو زبان اچھی طرح سمجھتے اور بولتے تھے۔اوران میں ہندوستانی ابوسعید العربی کا نام قابل ذکر ہے۔ جنھوں نے پہلی بار اردو زبان کا رسالہ (جہان

اسلامی) کے نام سے قاہرہ سے شائع کیا۔اسی سال 1930ء میں ایک ہفتہ واری اخبار نکلا جس کے مدیر محمود احمد عرفانی تھے۔اس اخبار کے اجراء میں ان کے بھائی محمد ابراھیم علی عرفانی نے بھی مکمل تعاون دیا اوران کی حوصلہ افزائی کی۔اردو زبان کی تدریس مصری یونیورسٹیوں ،تعلیمی اداروں میں پچھلے اسی (80) سال سے چل رہی ہے۔مصری حکومت نے مشرقی زبانوں کی تعلیم وتدریس پر بیسویں صدی کے نصف اول ہی سے توجہ دینی شروع کر دی تھی تدریس کے سلسلے کا آغاز سنہ 1939ء میں قاہرہ یونیورسٹی کے معہد اللغات الشرقیہ (اورینٹل لینگو یج انسٹی ٹیوٹ) میں ہوا۔ جولائی سنہ 1952ء کے بعد مصری حکومت نے اردوزبان میں ریڈیونشریات کا آغاز کیا تا کہ اس کے ذریعہ ہندوپاک کے ساتھ مصر کے دوستانہ تعلقات استوار رہیں۔ یہ پروگرام شام 6 بجے سے 8 بجے تک قاہرہ کے وقت کے مطابق ''ریڈیو قاہرہ'' سے نشر کیا جاتا ہے۔''(پروفیسر ابرہیم محمد ابراہیم کے مضمون سے ماخوذ)

قاہرہ کے بعد ازہر یونیورسٹی،عین شمس یونیورسٹی اور دیگر جامعات میں اردو درس وتدریس کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ جلد ہی مصر کی دیگر یونیورسٹیوں میں بھی اردو کے شعبے قائم ہونے والے ہیں۔اتنی بڑی تعداد میں اردو پڑھنے پڑھانے والے موجود ہیں لیکن ابھی تک شاید ہندوپاک کی یونیورسٹیز سے ان کا باضابطہ کوئی معاہدہ نہیں ہے کہ جس کے تحت طلبہ واساتذہ ایک دوسرے ملک میں تعلیم اور تحقیق کے لیے آ،جا،سکیں۔حالانکہ ہندستانی حکومت کے وظیفے بھی موجود ہیں۔کئی طلبہ وطالبات ہندستان میں ان وظائف پر تعلیم بھی حاصل کررہے ہیں۔جامعات کے مابین باضابطہ معاہدے کے لیے ہندستان کی جانب سے پہل کی ضرورت ہے اور خود مصری جامعات کو بھی اس جانب متوجہ ہونا چاہیے۔

مصر میں اردو کے آغاز کی تاریخ ستر برسوں (70) پر محیط ہے لیکن ابھی تک صرف چند احباب نے ہی ہندوپاک کی جانب رخ کیا اور یہاں سے فراغت کے بعد اردو کی خدمت میں مصروف ہیں۔قاہرہ میں جن اساتذہ نے جامعہ ازہر سے اردو میں بی۔اے کرنے کے بعد

پاکستان سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ان میں ایھاب حفظی عزالعرب، ابراہیم محمد ابرہیم اور جنھوں نے ہندستان سے پی ایچ ڈی کی ان میں احمد القاضی اور یوسف عامر صاحبان ہیں۔ فی الوقت میری نگرانی میں ایک مصری طالب علم مصطفیٰ علاء الدین پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ ازہر یونیورسٹی کے کئی طالب علموں سے اس سفر میں ملاقات ہوئی جو ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی کے لیے ہندستان آنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ (خدا انھیں کامیاب کرے)۔ پروفیسر ابرہیم محمد ابراہیم کے علاوہ یہ چاروں اساتذہ کئی بار ہندستان کے بڑے سیمناروں کے لیے مدعو کیے گئے۔ اس ناچیز نے پروفیسر جلال الحفناوی اور پروفیسر احمد القاضی کو دو عالمی سیمناروں میں مدعو کیا تھا۔ انھوں نے میری دعوت قبول کر کے ہمارے سیمنار کو بامقصد بنایا۔ پروفیسر یوسف عامر، ڈاکٹر رانیا فوزی، ڈاکٹر مروہ لطفی ہیکل اور ڈاکٹر ولاء جمال کی ضیافت کا بھی شرف حاصل ہے۔ انھوں نے میری دعوت پر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کے بین الاقوامی سیمنار میں شرکت کی۔ ڈاکٹر رانیا فوزی سے پہلی ملاقات پروفیسر یوسف عامر کے ہمراہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں ہوئی تھی ایک سال بعد ڈاکٹر مروہ لطفی کو لکھنؤ کے لیے زحمت دی تھی۔ ڈاکٹر بسنت محمد شکری اسی سال ایوان غالب، نئی دہلی کی دعوت پر ہندستان آئی تھیں۔ ان کے علاوہ مصر کے دیگر اساتذہ جیسے ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی، ڈاکٹر رباب محمد، ڈاکٹر ایناس عبد العزیز وغیرہ سے سوشل میڈیا کے ذریعے میرا تعارف تو تھا لیکن براہ راست ملاقات اس سفر میں ہوئی۔ اساتذہ کے علاوہ بہت سے طالب علموں سے میں سوشل میڈیا کے ذریعے ہی رابطے میں رہا۔ ڈاکٹر ابرہیم محمد ابرہیم صاحب سے میری پہلی ملاقات فیصل آباد، پاکستان کے ایک بین الاقوامی سیمنار میں ہوئی (مجھے خوشی ہے کہ اس ملاقات میں انھوں نے مجھے پہچان لیا) جن اساتذہ کا ابھی ذکر ہوا ہے اس کے علاوہ بھی کئی نامور اساتذہ مصر کی مختلف یونیورسٹیز میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ جن سے اس سفر میں پہلی بار ملاقات ہوئی۔ یہ تمام سینئر اساتذہ کئی درجن کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر اردو کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ ڈاکٹر یوسف عامر کی کتاب ''جدید عربی اردو شاعری کا تقابلی مطالعہ'' ہندستان کے معروف ادارے انجمن ترقی اردو ہند سے شائع ہو کر کافی مقبول ہوئی۔ مصر میں حکومت کا ایک ادارہ 'قومی مرکز برائے ترجمہ' ہے جہاں سے اردو کی مترجمہ سیکڑوں کتابیں

شائع ہوئی ہیں جس کے سبب اردو عالم عرب سے روبرو ہورہی ہے۔جن اساتذہ کی کتابیں اس ادارے سے شائع ہوئی ہیں ان میں پروفیسر ابراہیم محمد ابراہیم، پروفیسر یوسف عامر، پروفیسر جلال الحفناوی، پروفیسر احمد القاضی وغیرہ اہم ہیں۔اس کے علاوہ جامعہ ازہر کے شعبۂ اردو سے سالانہ رسالہ بھی نکلتا ہے جو اردو اور عربی دونوں زبانوں میں ہوتا ہے۔

عین شمس یونیورسٹی

4 مارچ 2018 کو عین شمس یونیورسٹی، قاہرہ میں ''معاصر تخلیقی ادب'' کے عنوان سے لیکچر تھا۔ڈاکٹر رانیا فوزی صدر شعبہ مشرقی زبان نے میرا والہانہ استقبال کیا بعد ازاں پروفیسر سوزان القلینی ڈین فیکلٹی ادبیات سے ملاقات ہوئی۔انھوں نے بھی ویسی ہی گرمجوشی کا اظہار کیا۔اساتذہ میں ڈاکٹر مروہ لطفی، ڈاکٹر ولاء جمال، ڈاکٹر ایناس عبدالعزیز، ڈاکٹر رباب محمد اور جناب عزیزندوی وغیرھم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔طلبہ وطالبات پہلے سے ہی منتظر تھے۔ایک خوبصورت سے ہال میں پروگرام کا آغاز ہوا۔پروفیسر سوزان کے استقبالیہ کلمات کے بعد پروفیسر رانیا فوزی نے میرا تعارف کرایا اور ڈاکٹر مروہ لطفی نے میری تقریر کا عربی میں ترجمہ پیش کیا۔سامعین میں عجب خوشی کا سماں تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی ہندستانی مہمان کا پہلی بار وہ استقبال کر رہے تھے۔ پروگرام کے بعد بھی طالب علموں سے گفتگو ہوئی انھوں نے اردو کے سلسلے میں بہت سے سوالات کیے۔اپنی تحقیق کے حوالے سے باتیں کی۔مواد کی دستیابی کے صورتیں معلوم کیں۔مجھے ایسا لگا کہ ان کے پاس کتابوں کی بہت کمی ہے۔اسی لیے ہر استاد نے کتابوں کے میرے تحفے کو دل سے قبول کیا۔(اردو کے ادیبوں سے میری گزارش ہے کہ کم از کم اپنی ایک ایک کتابیں یہاں کی لائبریریوں کے لیے ضرور بھیجیں)

جامعہ ازہر

جامعہ ازہر دنیا کے قدیم ترین تعلیمی اداروں میں سے ایک ہے۔اس کی تاریخ ہزاروں برس کی ہے۔دنیا اس ادارے کو مینارۂ نور کی حیثیت سے جانتی ہے۔یہ یونیورسٹی اپنے قیام کے دن سے ہی علوم وفنون کی نشر واشاعت کے لیے جانا جاتا ہے۔اس ادارے کو عالم اسلام میں ایک اہم

مقام حاصل ہے۔لیکن گزرتے وقت کے ساتھ اس ادارے میں اسلامی علوم وفنون کے ساتھ ساتھ عصری علوم وفنون، سائنس وٹکنالوجی، طب اورادبیات عالم اور دیگر تمام رائج علوم کے لیے اس ادارے نے اپنے دروازے ہمیشہ وا رکھے نتیجہ یہ ہے کہ قاہرہ میں واقع اس ادرے نے عالمی سطح پر اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔اس ادارے میں اردو کی تدریس بھی ایک اہم تاریخی موڑ کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس زبان کی تعلیم کے سبب مصر نے برصغیر سے اپنا تہذیبی رشتہ استوار کیا۔ یہ اردو زبان کے لیے بھی فخر کی بات ہے کہ جامعہ ازہر جیسے ادارے میں بی۔اے کی سطح سے پی۔ایچ۔ڈی کی سطح تک اردو کی تعلیم ہوتی ہے۔

5 مارچ کو میرے کرم فرما بھائی اور دوست پروفیسر یوسف عامر، وائس چانسلر جامعہ ازہر نے میری خوب پذیرائی کی۔ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے پہلے ان کے دفتر میں ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ بہت دیر تک اردو کی صورت حال اور مصر میں اردو کے فروغ کے امکانات پر گفتگو رہی بعدازاں جامعہ ازہر کے شعبہ اُردو میں حاضری ہوئی۔ پروفیسر احمد القاضی اور دیگر اساتذہ سے ملاقات کے بعد طلبہ سے ’’اردو کی موجودہ صورت حال‘‘ پر گفتگو کی۔ یہاں بھی وہی اشتیاق، وہی ہجوم، طالب علموں میں علم کی وہی للک دیکھنے کو ملی۔خوب ضیافت ہوئی اور دیر تک علمی وادبی گفتگو ہوتی رہی میں نے ذاتی طور پر اپنی خدمات پیش کیں اور علمی تعاون کے لیے اردو کے عالمی اداروں سے ربط باہمی پر زور دیا۔

کلیۃ البنات جامعہ ازہر

6 مارچ کو جامعہ ازہر، قاہرہ کے شعبہ اردو برائے خواتین میں حاضری ہوئی۔صدرِ شعبہ پروفیسر ابرہیم محمد ابراہیم اور ان کے رفیق کار اسی والہانہ انداز اور اپنائیت کے ساتھ ملے۔ کچھ ہی دیر میں پروفیسر یوسف عامر صاحب بھی تشریف لے آئے۔ مجھے ان کی مصروفیات کا اندازہ ہے لیکن وہ میری محبت اور اردو کی محبت میں مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر گھنٹوں اس محفل میں شریک رہے۔مصری چائے اور وائے کے ساتھ جناب ابراہیم صاحب کے دفتر میں اردو، مصر، ہندستان، پاکستان اور اردو کی بستیوں پر گفتگو ہوتی رہی۔ہم اساتذہ محو گفتگو تھے اور طالبات باہر

ہمارے منتظر تھیں۔ پروفیسر ابراہیم نے طالبات کی اضطرابی کیفیت کو سمجھ لیا اس لیے فوراً ہی ہال میں ہمیں لے گئے تاکہ ان سے بھی گفتگو ہو سکے۔ کچھ ہی دیر میں ڈین کلیۃ الادب پروفیسر تحیہ ابو شعیشع صاحبہ بھی تشریف لے آئیں۔ پروفیسر ابراہیم صاحب کی خوشی ان کے لفظوں سے عیاں تھی۔انھوں نے اردو کو بڑی تہذیبی زبان بتاتے ہوئے اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور کہا کہ اردو کا ہی یہ فیض ہے کہ ہم ہندستان کے اردو استاد پروفیسر خواجہ اکرام سے اس شعبے میں مل رہے ہیں۔انتہائی خلوص دل کے ساتھ میرا استقبال اور تعارف پیش کیا۔ڈین صاحبہ نے بھی اسی مسرت کا اظہار کیا۔ پروفیسر یوسف عامر کی پرمغز گفتگو کے بعد مجھے بھی طالبات سے گفتگو کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ان طالبات کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ ایک ایسی زبان کی طالبہ ہیں جس میں بھی ہزراوں سال کی تہذیب سانس لے رہی ہے۔ مجھے ذرا تکلف تھا کہ شاید یہ میری باتوں کو پوری طرح نہ سمجھ سکیں لیکن اندازہ ہوا کہ میرے ایک ایک لفظ کو سمجھ رہی ہیں، بیشتر طالبات بہت اچھی طرح اردو بولنے پر قادر بھی ہیں۔یقیناً اس کے لیے جامعہ ازہر کے اساتذہ قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے تدریس پر کافی محنت کی اسی لیے بولنے، پڑھنے اور سمجھنے میں ان طالبات کو چند سالوں میں ہی عبور حاصل ہو جاتا ہے۔

مدینۃ البعوث میں ہندستانی طلبہ سے یادگار ملاقات

جامعہ ازہر عالم اسلام میں مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔صدیوں سے اس ادارے نے ہندستان کو اپنے فیوض سے نوازا ہے۔ جامعہ ازہر میں ہندستان کے تقریباً پانچ سو طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ جامعہ ازہر ان طالب علموں کے قیام و طعام کے علاوہ کتاب اور درسی مواد کے حصول کے لیے وظیفہ دیتا ہے۔اس کے علاوہ ہر طالب علم کو دو سال میں ایک بار اپنے ملک میں آنے جانے کا ٹکٹ بھی فراہم کرتا ہے۔ جامعہ ازہر اپنے طالب علموں کو ہر طرح کی سہولت فراہم کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ وہ یہاں سے صحیح طور پر علم حاصل کر کے جائیں اور اپنے ممالک میں علم کی شمع روشن کریں۔ جامعہ ازہر کی اس خدمت کو بے نظیر کہنا بے جا نہیں ہے۔ ہندستان کے علاوہ کئی ممالک کے طلبہ یہاں زیر تعلیم ہیں۔

غیر ملکی طالب علموں کے ہاسٹل کو ''مدینۃ البعوث'' کہا جاتا ہے۔ میرے مصر آنے کی اطلاع جب ہندستانی طالب علموں کو ملی تو ان میں بیشتر حضرات سے میری دعا سلام تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ میں ان سے ملوں۔ چنانچہ نائب شیخ الجامعہ سے میں نے ان کی خواہش کا ذکر کیا تو پروفیسر یوسف عامر صاحب نے کہا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ ایک وائس چانسلر کا اپنے طالب علموں سے ملنے جانا بڑی بات تھی اور میرے لیے بھی اعزاز کی بات تھی۔ لہٰذا ۱۲/ مارچ کی شام کو میں نائب شیخ الجامعہ ازہر شریف پروفیسر یوسف عامر کے ساتھ ازہر میں زیر تعلیم طلبہ سے ملاقات کی تقریب میں شریک ہوا۔ اس حاضری کو میں اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں کیونکہ یہی وہ علمائے کرام ہیں جو ہندستان میں علم کی شمع فروزاں کرتے ہیں۔ محترم عطیف قادری بدایونی کی ہمرہی نے اسے مزید روحانی بنادیا۔ میں نائب شیخ الجامعہ کا شکرگزار ہوں کہ اس محفل میں شریک ہو کر ہندستانی طلبہ کی حوصلہ افزائی کی اور میری توقیر بڑھائی۔ ازہر کے تمام طلبہ کا شکریہ جنھوں نے اتنی محبتوں سے یاد کیا۔ اللہ ان سب کو دین و دنیا میں سرخروئی عطا فرمائے۔ (آمین)

اسکندریہ یونیورسٹی

7 اور 8 مارچ مصر کے خوبصورت ساحلی شہر اسکندریہ میں گزرا۔ اسکندریہ یونیورسٹی میں اردو ابھی بی۔ اے کی سطح پر ہی پڑھائی جاتی ہے۔ 7 مارچ کی صبح میں قاہرہ سے بذریعہ ٹرین اسکندریہ پہنچا وہاں ایناس احمد نے ہمارا استقبال کیا۔ ایناس احمد تاریخ کی طالبہ ہیں جو بہت اچھی اردو بولتی ہیں۔ میری ضیافت کی ذمہ داری انہیں کے سر تھی۔ ایناس صاحبہ نے انتہائی خنداں پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ پورا دن شہر کو دیکھنے اور مقدس مقامات کی زیارت میں گزار۔ ایناس کی خوش اخلاقی سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے انھیں اپنی منہ بولی بہن بنالیا۔ دوپہر کو گھر سے بہت ہی لذیذ کھانا بنوا کر لے آئیں اور سمندر کے کنارے بیٹھ کر اس کا لطف لیا۔ (اللہ انھیں جزائے خیر دے)۔ مصری طالب علموں کا اخلاق بیان سے سے باہر ہے۔ کچھ طالبات جو مجھے پہلے سے جانتی تھیں کیونکہ وہ ہندستان اردو پڑھنے کے لیے ایک ماہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں رہ چکی تھیں ان میں فاطمہ ماہر (اپنی والدہ کے ساتھ)، فاطمہ عمر، میار ناصر، فاطمہ بدرالدین جن سے مصر میں میری

پہلی ملاقات ہوئی یہ بہت پرتکلف اردو میں گفتگو کرتی ہیں۔اس کے علاوہ عین شمس یونیورسٹی میں اردو کی استاد ڈاکٹر مروہ لطفی ہیکل جنھیں میں اپنی بہن مانتا ہوں اور وہ بھی مجھے بھائی کی طرح پیار کرتی ہیں۔ یہ سب کے سب میرا ساتھ دینے کے لیے صبح صبح اسکندریہ پہنچ گئیں۔ یہاں مروہ ابراہیم، یسر محمد، ایمن، تقی محمد اور کئی اساتذہ وطالبات سے ملاقات ہوئی۔''اردو ادب میں مصری تہذیب وثقافت'' کے عنوان پر اسکندریہ یونیورسٹی میں گفتگو کی۔ لیکچر کے بعد سوالات و جوابات کا سیشن بہت کامیاب رہا۔اسکندریہ میں ابھی باضابطہ اردو کا شعبہ نہیں ہے۔مشرقی زبانوں کے شعبے سے ہی اردو کا شعبہ منسلک ہے۔ مجھے امید ہے جلد یہ شعبہ بھی ترقی کرے گا۔مشرقی زبانوں کے شعبے میں میرا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔اس شعبے کی صدر دکتورہ سمیرہ عاشور صاحبہ نے کہا کہ آپ پہلے اردو کے شخص ہیں کہ اردو کے حوالے سے اس شعبے میں آئے ہیں۔ مجھے خوشی ہے اس سے اردو کے طلبہ وطالبات کو حوصلہ ملے گا۔

اس یونیورسٹی کے سیمنار میں میری گفتگو کا موضوع میں ''اردو زبان میں مصری تہذیب کی عکاسی'' تھا۔ایک بڑے ہال میں طلبہ سے زیادہ طالبات کی موجودگی تھی۔انھوں نے بہت دلچسپی سے میری باتیں سنیں۔ میری گفتگو اردو میں تھی اس لیے پہلی جماعت کے طالب علموں کے لیے سمجھنا مشکل تھا اس لیے ڈاکٹر مروہ لطفی نے عربی میں اس کا ترجمہ پیش کیا۔اس جلسے میں فارسی کے طالب علم بھی موجود تھے۔ یہاں اسکندریہ یونیورسٹی میں خطاب کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اردو جس قدر ہندو پاک کی زبان ہے اسی قدر مصر کی بھی ہے۔کیوں کہ اردو کے رگ وپے میں عربی اور مصری تہذیب وثقافت کے عناصر شامل ہیں۔مصر سے ہمارا رشتہ نہ صرف تہذیبی اور علمی ہے، بلکہ اسلامی نظریات وتواریخ کے پس منظر میں مصر مینارۂ نور ہے۔قبل ازیں ڈین اسکندریہ یونیورسٹی دکتور غادہ موسی اور صدر شعبہ مشرقی زبان نے اپنے اپنے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ اردو کے علاوہ دیگر عالمی زبانوں پر بھی ہماری حکومت کام کر رہی ہے اور عنقریب یہ شعبہ بھی ترقی کرے گا۔اکثر طالب علموں نے ہندستان میں اردو پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ مجھے امید ہے کہ جلد ہی ہندستانی یونیورسٹیز کے مابین معاہدے ہوں گے اور ان طالب علموں کو یہاں آنے کا موقع ملے گا۔اس کے بعد اساتذہ و طالبات کے ساتھ اسکندریہ کے مشہور ہوٹل میں سمندری غذا (SeeFood) کا لطف لیا۔ میں دل کی گہرائیوں سے ان تمام اردو کی طالبات اور اساتذہ کا شکر

گزار رہوں۔

طنطا یونیورسٹی، طنطا

طنطا یونیورسٹی کا سفر بھی یادگار رہا ڈاکٹر پروفیسر مدحت حماد مشرقی زبانوں کے صدر اور ڈاکٹر بسنت شکری کی دعوت پر اس یونیورسٹی کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر مروہ لطفی اور مصطفیٰ علاء الدین میرے ہمراہ تھے۔ یہاں بڑے انوکھے انداز میں استقبال کا پروگرام مرتب کیا گیا تھا۔ ایک طالبہ نے ہندستانی طرز کی ساڑی پہن کر ہند اور مصر کے تعلقات اور اردو کے رشتے کو بتانے کی کوشش کی۔ کئی طالبات نے اردو کے نغمے بھی سنائے۔ بہت دیر تک ڈاکٹر مدحت حماد سے اردو اور فارسی زبان کے حوالے سے باتیں ہوئیں۔ ازہر یونیورسٹی سے ڈاکٹر حبیبہ بھی اس میں شرکت کے لیے موجود تھیں۔ منصورہ سے جناب ہانی السعید بھی تشریف لائے تھے۔ طالب علموں میں عجیب خوشی کا ماحول تھا۔ ان سب نے مجھے بہت متاثر کیا اور یہ ملاقات میری ناقابل فراموش یادداشت کا حصہ بن گئی۔

قاہرہ کا دوسرا اور تیسرا سفر

2019 کے نومبر میں جامعہ ازہر نے ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ کانفرنس ہماری تنظیم ''ورلڈ اردو ایسوسی ایشن'' کے اشتراک سے تھی۔ اسی لیے ہمارے محترم بھائی پروفیسر یوسف عامر صاحب نے اردو والوں کو مدعو کرنے کی ذمہ داری مجھ پر عائد کی تھی۔ میں نے برطانیہ سے محترمہ جبین غزل انصاری (جو اس پہلے بھی قاہرہ جا چکی تھیں کیونکہ ان کی شاعری پر ایک خاتون ریسرچ اسکالر نے تحقیقی مقالہ لکھا تھا) لندن سے فہیم اختر اور ہندستان سے پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر محمد محسن اور ڈاکٹر محمد کاظم کو مدعو کیا۔ ان کے ساتھ یہ سفر کافی یادگار رہا۔ جناب عطیف صاحب نے مدینۃ النصر میں ہمارے لیے ایک کشادہ فلیٹ بک کرایا تھا۔ ہم سب ایک ساتھ وہاں تھے اس لیے یہ تقریباً گھر کا ماحول تھا۔ عزیزی عبد العلیم اور جناب امیر رضا صاحب بھی ہمارے لیے اسی فلیٹ میں مقیم ہو گئے تاکہ کسی طرح کی تکلیف نہ ہو۔ انھوں نے جس طرح خیال رکھا اور ہماری ضیافت کی اس کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ علمی و ادبی مشاغل کے علاوہ سیر و تفریح کا خاص انتظام کیا۔ پہلے سفر میں یہ مواقع نہیں مل سکے تھے۔ لیکن اس سفر میں

زیادہ سیر وتفریح کا موقع ملا۔

قاہرہ یونیورسٹی کے سیمنار میں شرکت

پروفیسر جلال السعید الحفناوی کی شخصیت ایسی ہے کہ ایک بار مل لیں تو ان سے قربت ہو ہی جاتی ہے۔ یہ دو دہائی پہلے کی بات ہے کہ وہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے آئے تھے۔ تب سے ان سے ملاقات رہی ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد وہ کئی برسوں تک بطور مہمان پروفیسر مدینہ منورہ میں بھی رہ چکے ہیں۔ ابھی وہ قاہرہ یونیورسٹی کے مشرقی زبانوں اور ادبیات کے شعبے کے چیئر مین ہیں۔ انھوں نے تین درجن سے زیادہ اردو کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے جو مصر کے ایک حکومتی ادارے سے شائع ہوئی ہیں۔ جب میں قومی کونسل برائے فروغ اردو کا ڈائریکٹر تھا تب وہ ہماری عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ ان سے ہمیشہ رابطہ رہا۔ دسمبر ۲۰۱۹ میں وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سیمنار میں دہلی تشریف لائے۔ سوئے اتفاق کہ دہلی میں احتجاجات کے سبب یہ کانفرنس نہیں ہوسکی۔ اور شہر کے حالات بھی ایسے نہ تھے کہ کہیں جایا جاسکے۔ انھوں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ جے این یو کے گیسٹ ہاؤس میں ہی رکنا پسند کریں گے۔ اس لیے ہم نے ان کے لیے جے این یو میں ہی قیام کا انتظام کر دیا۔ اس طرح کئی دنوں تک ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ دوران ملاقات انھوں نے اپنے دعوت نامے کے بارے میں پوچھا اور اصرار کیا کہ فروری ۲۰۲۰ میں قاہرہ یونیورسٹی کے سیمنار میں ضرور شریک ہونا ہے۔ میں اتنی جلدی جلدی مصر نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ ابھی وہاں سے آئے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا۔ مگر ان کی بات ٹالنا بہت مشکل تھی۔ میں نے کہا بھی کہ بین العلومی اور مختلف زبانوں کے اس سیمنار میں میرا کتنا رول رہے گا؟ تو انھوں نے کہا کہ وہ کئی اردو والوں کو بلا رہے ہیں اور اردو کے لیے الگ سے ایک دن کا سیشن ہوگا۔ آپ بھی اپنے ساتھ کسی پروفیسر کو لانا چاہتے ہیں تو استقبال ہے۔ خیر ان کی بات مانتے ہوئے پروفیسر شہاب عنایت ملک اور ڈاکٹر محسن کے ساتھ یہ کامیاب سفر ہوا۔

قاہرہ یونیورسٹی، قاہرہ کی سب سے قدیم یونیورسٹی ہے جو بطور یونیورسٹی وجود میں آئی ورنہ یہاں جامعہ ازہر تو پہلے سے ہی موجود تھا۔ اسی یونیورسٹی میں اردو کا پہلا باضابطہ شعبہ قائم ہوا تھا ہے اور جلال حفناوی کے علاوہ تین اور اساتذہ ورد امحمد، تیسیر اعظمی اور عالیہ ہیں۔ یہاں بھی بی۔اے، ایم۔اے اور پی ایچ ڈی کی سطح تک اردو کی تدریس کا نظم ہے۔ اس سیمنار میں شرکت سے معلوم ہوا

کہ طلبہ واساتذہ میں اردو کے تئیں کافی لگاؤ ہے۔ اردو کے سیشن میں کئی مقالے پڑھے گئے جسے بغور سنا گیا اور سوال وجواب بھی خوب ہوئے۔ ڈاکٹر جلال نے ہماری ضیافت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ ہم سب ان کی ضیافت کے شکرگزار ہیں۔

اردو کے مصری اساتذہ سے ملنے اور مجموعی طور پر اردو کے شعبوں کے دورے کے بعد ایک کمی کا احساس ہوا جس کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں شاید غلط ہو۔ مجھے محسوس ہوا کہ اردو کے اساتذہ اور طلبہ اکثر آپس میں عربی زبان میں ہی باتیں کرتے ہیں۔ اگر اساتذہ اس جانب متوجہ ہوں اور ایسی کوشش کریں کہ کم از کم شعبے میں تمام اساتذہ اور طلبہ وطالبات اردو میں ہی باتیں کریں تو اردو کی تفہیم اور تدریس میں مزید تیزی آئے گی۔ گاہے بگاہے ان شعبوں میں قومی اور بین الاقوامی سیمنار بھی منعقد ہوتے رہتے ہیں لیکن سیمنار کی زبان اکثر عربی ہوتی ہے۔ اگر یہ تمام سرگرمیاں اردو زبان میں ہوں تو اردو کا رواج زیادہ ہوگا جو نئے طالب علموں کے لیے مفید بھی ہوگا۔ دوسری بات جس کا خصوصی طور پر میں ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ مصر کے اساتذہ کی زیادہ تر تصانیف عربی زبان میں ہیں۔ اگر یہ اپنی تحریریں اردو میں لکھیں اور ہند وپاک کے رسائل میں شائع ہوں تو یہ خود بخود برصغیر اور اردو کی دوسری بستیوں میں متعارف ہوں گے۔ اردو کے مہجری ادیب ہر جگہ اپنی تخلیقات کے سبب جانے جاتے ہیں۔ مصر کے اساتذہ میں بھی بخوبی تخلیقی صلاحیتیں موجود ہیں۔ میری ان سے گزارش ہے کہ اس جانب بھی متوجہ ہوں۔ مجموعی طور پر میں اہل مصر اور حکومت مصر کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں کہ وہ برصغیر کی زبان وتہذیب کو پروان چڑھانے کی دل سے کوشش کررہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اب ملنے جلنے کا سلسلہ برقراررہے گا اور زبان کے ساتھ ساتھ ہندستان اور مصر کے تعلقات میں مزید خوشگواری آئے گی۔

ناصر عبدالرحمان کی ضیافت

ناصر عبدالرحمان سے مل کر مصری تہذیب وتمدن کو اور قریب سے دیکھنے کو ملا۔ ہم اردو میں ایک لفظ استعمال کرتے ہیں 'مست مولیٰ' ناصر صاحب بھی اسی طرح کی پُر بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ میں مصر جاکر ان سے متعارف ہوا۔ لیکن وہ مجھے پہلے سے جانتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان

کی صاحبزادی میار ناصر ہندستان میں زیر تعلیم تھیں۔ ان کے ساتھ فاطمہ ماہر اور فاطمہ عمر بھی تھیں۔ عام طالب علموں کی طرح میں نے ان سے بھی وہی پدرانہ شفقت کی تھی۔ انھوں نے میرے بارے میں اپنے والدین کو بتایا ہوگا۔ وہ بہت خواہش مند تھے کہ مجھ سے جلد ملاقات ہو۔ مصطفیٰ سے ان کی کئی بار بات ہوئی وہ ہمیں کھانے پر مدعو کرنا چاہتے تھے۔ میری اجازت کے بعد دوپہر کے کھانے کی دعوت طے ہوگئی۔ عام طور پر مصر میں دوپہر کی ہی دعوت دی جاتی ہے کیونکہ رات کو کم کھانے کا رواج ہے۔ عین شمس یونیورسٹی سے فارغ ہوکر ہم ناصر عبدالرحمان صاحب کے گھر گئے۔ یہ پیشے سے انجینئر ہیں اور بہت یار باش قسم کے انسان ہیں۔ بہت دنوں تک سعودی عرب میں رہ چکے ہیں۔ ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہوا کہ یہ صاحبِ ذوق ہیں۔ اللہ نے انھیں نوازا بھی ہے۔ دل کے کھلے انسان ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی گلے سے لگایا اور کہا کہ مصر میں آپ اکیلے نہیں ہیں، آپ کا بھائی عبدالرحمان ناصر یہاں موجود ہے اس لیے کسی طرح کی کوئی ضرورت محسوس ہو مجھے بے تکلف بتائیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اب آپ جب بھی آئیں تو یہ گھر آپ کے لیے حاضر ہے۔ اس کے بعد ضیافتوں کا دور شروع ہوا۔ پہلے تازے پھل کھائے گئے اس کے بعد دسترخوان پر انواع واقسام کی نعمتیں رکھی گئی تھیں۔ مصر میں کبوتر مسلم بہت مرغوب غذا سمجھی جاتی ہے۔ میں نے پہلی دفعہ یہ غذا دیکھی۔ دسترخوان پر اتنے اقسام کے کھانے دیکھ کر میں نے کہا کہ آئندہ میں آپ کے گھر نہیں آؤں گا کیونکہ آپ نے بہت تکلف کر دیا۔ لیکن وہ خاکساری سے کہتے رہے کہ کوئی خاص انتظام نہیں کر سکا۔ کھانے کے بعد ان کے ایک مصر صحافی آئے انھوں نے مجھ سے مصر اور اردو کے حوالے سے گفتگو کی جو دوسرے دن قاہرہ کے اخبارات میں شائع بھی ہوا۔

شام کو ان کے ساتھ دریائے نیل اور تحریر اسکوائر گھومنے گئے۔ اس کے بعد پروگرام یہ تھا کہ شام کو اہرامات جائیں گے اور 'روشنی اور آواز' کا پروگرام دیکھیں گے لیکن اس دن سعودی شہزادے سلمان قاہرہ آئے ہوئے تھے اور انھیں اہرامات دیکھنا تھا۔ اس لیے عوام کے لیے یہ مکمل طور پر بند تھا۔ اس لیے ناصر صاحب وہیں قریب کے ہوٹل میں کافی کے لیے لے گئے۔ وہیں عمر صاحب بھی آگئے۔ ہوٹل کے اوپری منزل پر ہم گئے جہاں سے اہرامات دیکھائی دے رہے تھے۔ ہم اوپر والے حصے میں کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے کافی کا لطف لے رہے تھے۔ اسی ہوٹل میں ایک شادی کی

تقریب بھی تھی۔ جسے نزدیک سے دیکھا۔ نکاح کے بعد تمام عورتیں اور گھر کے افراد رقص کرتے نظر آئے، یہ یہاں کی تہذیبی رسم ہے۔ دوسرے دن ناصر صاحب اور عمر صاحبان کے ساتھ قاہرہ کے مضافات دیکھنے کا پروگرام بنا اور ہم قناطیر گئے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے نیل کئی حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ یہ بہت ہی پرفضا مقام تھا۔ اسی جگہ پر صدر مملکت مصر کا ایک اضافی قیام گاہ بھی ہے۔ اس لیے اس علاقے میں عوام کی آمد و رفت بہت کم ہے۔ دریائے نیل کے اسی کنارے پر مچھلی کے لیے مشہور ہوٹل ہیں جہاں ہم نے مصری طرز میں بنی مچھلیاں کھائیں۔ مصر کے دوسرے سفر میں بھی انھوں نے ہمارے تمام احباب کو اپنے گھر پر دعوت دی اور اسی طرح تکلفات سے کام لیا۔ بات اسی پر ختم نہیں ہوئی سبھوں کو بیش قیمت تحائف بھی دئے۔ ہر سفر میں ان کی جانب سے پُر تکلف دعوتوں کا اہتمام ہوا۔ ہم ذاتی طور پر ان کے ممنون ہیں۔

قلعہ صلاح الدین ایوبی

یوں تو پورا مصر تاریخی و تہذیبی سے اعتبار سے قابل دید ہے لیکن قاہرہ جسے عرب میں عروس البلاد کی حیثیت حاصل ہے۔ اس شہر کو عام طور پر اہرامات یعنی پیراملڈ کے لیے ہی جانا جاتا ہے مگر اس کے علاوہ بھی اس شہر کی کئی قدیم تاریخی عمارتیں ہیں جو اس عہد کی سیاسی تاریخ کی شاہد ہیں اور ساتھ ہی قاہرہ کے فرمانراؤں کی دانش مندی و دور بینی کی علامت ہیں۔ ان میں قلعہ صلاح الدین ایوبی جسے قلعہ محمد علی بھی کہا جاتا ہے، یہ بہت اہم ہے۔ اس قلعے کی تاریخی اہمیت کے حوالے سے عین شمس یونیورسٹی، قاہرہ میں تاریخ کی پروفیسر ڈاکٹر شیرین صادق لکھتی ہیں کہ:

> ''قلعہ صلاح الدین قرون وسطیٰ کا زمین پر موجود مضبوط اور محفوظ ترین جنگی جہاز تھا۔ قاہرہ کے دفاع میں اس قلعے کا اہم کردار تھا۔ یہ قلعہ جبل المقطم سے الگ کی گئی ایک جگہ پر تعمیر کیا یہی وجہ ہے کہ اسے 'قلعہ الجبل' بھی کہا جاتا تھا۔ یہ جگہ قاہرہ سے بلندی پر واقع ہونے کی بدولت پورے شہر کا نظارہ فراہم کرتی۔ اس سے حملہ آوروں کو دیکھنے اور ان کی نقل و حرکت کا پتا چلانے میں مدد ملتی۔ اگرچہ صلاح الدین 1176ء میں اس قلعے کی تعمیر کے خواہشمند تھے۔ انہوں نے

> قلعے کے لیے جگہ کو بہت احتیاط سے منتخب کیا تھا لیکن یہ ان کی زندگی میں مکمل نہیں ہوا تھا بلکہ یہ قلعہ ان کے بھائی سلطان الکامل بن العادل نے 1208ء میں مکمل کیا۔ اس کے بعد یہ قلعہ محمد علی کے دور تک حکومت کا پایہ تخت رہا۔ اس قلعے کے 13 برج بنائے گئے تا کہ اس میں موجود سپاہیوں کو قاہرہ کے دفاع میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔''

(عربیہ ڈاٹ کوم کے حوالے سے)

جب قاہرہ جائیں تو کئی جگہ سے اس کی فصیلیں اور گنبد دور سے ہی دیکھائی دیتے ہیں۔ مصطفیٰ علاء الدین اور فاطمہ بدرالدین کے ساتھ اس قلعے کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اس قلعے کے اندر ایک شاندار مسجد بھی ہے جسے ترکیوں نے تعمیر کیا۔ اس کی زیب و زینت قابل دید ہے۔ اس قلعے کے بالائی حصے پر جا کر پورے قاہرہ کا نظارہ بڑا دلفریب ہوتا ہے۔

قصر عابدین

قاہرہ کو دنیا بھر میں تہذیبی وراثت کی وجہ سے جانا جاتا ہے لیکن اس جدید قاہرہ کی تعمیر و تشکیل کے آثار بھی موجود ہیں۔ ان میں قصر عابدین کو بھی اہم مقام حاصل ہے۔ قاہرہ میں واقع قصر عابدین دنیا کے قیمتی محلات میں شمار ہوتا ہے۔ یہ میدان جمہوریہ (تحریر اسکوائر) کے قریب قصر النیل اسٹریٹ پر واقع ہے۔ فرنچ اور روسی طرز تعمیر کا یہ ایک انوکھا نمونہ ہے۔ 1863 میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اور 1874 میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس کی تعمیر میں ایک خطیر رقم خرچ کی گئی۔ ویکی پیڈیا کے مطابق اس عہد میں ستائیس لاکھ مصری پونڈ اس کا صرفہ تھا۔ اس کے علاوہ اس کی زیب و آرائش میں ترکی طرز کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ زیب و آرائش میں خالص سونے کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی شہرت کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ لیکن اس کے اندر موجود قیمتی زیورات، ہیرے جواہرات، نادر پینٹنگ، اس عہد میں استعمال کئے جانے والے جدید ترین اسلحہ جات، چاندی کے ظروف اور شیشے کے برتن وغیرہ کی موجودگی یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ کس طرح اسلامی حکومتیں عیش و عشرت میں ڈوب چکی تھیں۔ عابدین بک کے نام سے منسوب اس محل میں جدید مصر کے

معمار محمد علی باشا کے عہد کی بھی بہت سی چیزیں یہاں موجود ہیں۔اس محل کو اب میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے لیکن بالائی منزل ابھی بھی حکمراں طبقے کے استعمال میں ہے یہ اب بھی سرکاری طور پر مصر کے صدر کا دفتر تصور کیا جاتا ہے۔لیکن شاید یہ کاغذی طور پر ہی اس کا یہ مقام ہے۔استاد دکتور بسنت محمد شکری کے ساتھ اس محل کی سیر کی۔دکتور بسنت کا بہت شکریہ۔

المتحف المصری:

مصر کا مشہور زمانہ میوزیم جہاں قدیم ترین تہذیب بالخصوص فرعونی تہذیب کے آثار موجود ہیں۔یہی وہی میوزیم ہے جہاں فرعون کی لاش (رمسیس ثانی جو موسیٰ علیہ السلام کے دور میں تھا) موجود ہے۔اس کے علاوہ کئی شاہی گھرانوں کی لاشیں بھی موجود ہیں۔ان میں شاہی خاندان کی خواتین کی بھی لاشیں ہیں۔حد یہ ہے کہ انھوں نے لاشوں کے ساتھ ساتھ جانوروں اور پرندوں کے بھی ممی بنائے تھے (یعنی حنوط کیا تھا) جو اس میوزیم میں موجود ہیں۔اس کے علاوہ اس میوزیم میں اس عہد میں استعمال ہونے والی تمام چیزیں بہت سنبھال کر رکھی گئی ہیں۔لکڑی کے تابوت، اس میں سونے سے نقش ونگار اور اسلحے، زیورات وغیرہ۔کئی دیوقامت مجسمے اور کئی تاریخی عمارتوں کے ستون اور باقیات کو بڑے سلیقے سے اس میوزیم میں رکھا گیا ہے۔اس میوزیم کو دیکھنے کے بعد اس عہد کی زندگی سے متعلق بہت سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔اس میوزیم کو دنیا کے میوزیم میں اہم مقام حاصل ہے۔دکتور ولاء جمال، مصطفیٰ علاء الدین فاطمہ بدرالدین اور فاطمہ ماہر کا بہت شکریہ کہ انھوں نے ان مقامات کی سیر کرائی اور مصر کی مشہور غذا کوشری سے ضیافت کی۔

فرعونی تہذیب

مصر کے لوگ فرعونی تہذیب پر بہت فخر کرتے ہیں۔ایک استاد ہمارے ساتھ تھیں انھوں نے بڑے فخر سے اپنی فرعونی تہذیب کا ذکر کیا تو مجھے اس لیے حیرت ہوئی کہ ہم برصغیر کے لوگ فرعون کا نام سنتے ہی اس پر لعنت بھیجتے ہیں اور لاحول پڑھتے ہیں۔دراصل یہ میری لاعلمی تھی۔ہم اکثر فرعون سے ایک ہی فرعون کو سمجھتے ہیں جسے اللہ کی نافرمانی کے سبب دریا میں غرق کر دیا گیا تھا۔دراصل مصر میں کئی فرعون گزرے ہیں۔فرعون جو رمسیس ثانی تھا اس نے حضرت موسیٰ کی باتوں کو

نہیں مانا اور اللہ کی نافرمانی کی ۔لیکن بہت ست فراعین توحید پرست تھے۔لیکن اس کے علاوہ فرعونی تہذیب پر ناز کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مصر کی تہذیب بہت قدیم تہذیب ہے۔اس تہذیب نے دنیا کو بہت کچھ دیا ہے۔ یہ زمانۂ قدیم سے ترقی یافتہ تہذیب تھی۔دنیا کے دوسرے خطے کی بہ نسبت یہاں کی تہذیب بہت آگے تھی۔علوم وفنون ہو یا دیگر اسباب زیست، مصریوں نے اس کی تسخیر دیگر اقوام کے مقابلے بہت پہلے کر لی تھی۔اس لیے اہل مصر کا قدیم تہذیب پر فخر کرنا درست ہے۔اس کے علاوہ یہ سرزمین حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت ابراہیم علیھم السلام اور کئی انبیا کی سرزمین رہی ہے۔یہی بات سب سے زیادہ قابل فخر ہے۔

کچھ قاہرہ اور دریائے نیل کے بارے میں

قاہرہ کا شمار دنیا کے چند بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔دنیا کے دس بڑے شہروں میں قاہرہ کا نام آتا ہے۔قاہرہ میں اہرامات اور میوزیم دیکھنے کے لیے ہر سال لاکھوں کی تعداد میں سیاح آتے ہیں۔قاہرہ جہاں تہذیب و ثقافت کا قدیم مرکز ہے وہیں وہ علم و ادب کے لیے بھی جانا جاتا ہے۔قاہرہ دریائے نیل کے کنارے آباد ہے۔ یہ ندی بھی دنیا کی طویل ترین ندیوں میں سے ایک ہے۔دریائے نیل جہاں ایک جانب اس شہر کے حسن کو دوبالا کرتا ہے وہیں اس شہر کو قدرتی نعمتوں سے سرفراز بھی کر رہا ہے۔دنیا کی قدیم ترین تہذیبیں بھی ندیوں کی کنارے آباد ہوئی ہیں۔قاہرہ بھی دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے جس کی تاریخ ساڑھے تین ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی ہے۔

دریائے نیل کی سیر

میرے دیرینہ دوست ڈاکٹر جلال السعید الحفناوی، قاہرہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر اور شعبہ مشرقی زبانوں کے صدر ہیں، ان کے ساتھ ایک دن دریائے نیل اور اہرامات کی سیر کو نکلا۔دریائے نیل کے کنارے قاہرہ یونیورسٹی کا کافی ہاؤس ہے۔کافی کشادہ اور وسیع علاقہ ہے۔ یہاں صرف اسی کے ممبر آسکتے ہیں۔جلال صاحب کے توسط سے یہاں آنا ممکن ہوا اور دیر تک نیل کے کنارے بیٹھ کر کافی کے ساتھ علمی و ادبی گفتگو ہوتی رہی۔اس سیر میں میرے ساتھ میرے

ریسرچ اسکالر مصطفیٰ علاء الدین بھی موجود تھے۔ دریائے نیل کو شام ڈھلے بھی میں نے دیکھا اس موقعے پر ہمارے ساتھ ناصر عبدالرحمان، فاطمہ ماہر، فاطمہ عمر، میار ناصر، مصطفیٰ علاء الدین تھے۔ دوسرے سفر میں عطیف قادری صاحب نے رات کے وقت دریائے نیل میں کشتی سے سیر کرائی۔ اتفاق یہ ہے کہ رات زیادہ ہو چکی تھی اس لیے کشتی میں بہت بھیڑ نہیں تھی۔ کشتی میں سوار ہوتے ہی ہم لوگوں نے کافی پینی چاہی۔ اتنے میں ایک عربی فیملی اس میں سوار ہوئی۔ جب انھوں نے ہندستانیوں کو عربی میں بات کرتے دیکھا تو وہ متوجہ ہوئے اور تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بغداد شریف سے ہیں اور غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں وہ خادم ہیں۔ جب عطیف قادری نے حضرت سالم قادری صاحب کے بارے میں بتایا تو وہ عطیف صاحب کو پہچان گئے۔ کیونکہ عطیف صاحب کے والد گرامی حضرت سالم میاں قادری خانقاہ قادریہ بدایوں شریف ہر سال بغداد شریف جاتے ہیں اور وہاں کے خادموں کے لیے بہت سے تحائف لے کر جاتے ہیں۔ اس کے بعد بغداد کے حالات پر بات چیت ہوتی رہی۔ اس طرح دریائے نیل کی سیر کے ساتھ ساتھ بغداد کے لوگوں سے خوشگوار ملاقات بھی ہوئی۔

دریائے نیل کے متعلق اپنی باتیں کہنے سے بہتر ہے کہ ویکی پیڈیا میں جو اس کی تاریخ لکھی گئی ہے اسے حوالے کے طور پر پیش کروں تاکہ اختصار کے ساتھ معلومات مل سکیں:

''دریائے نیل دنیا کا سب سے طویل دریا ہے جو براعظم افریقا میں واقع ہے۔ یہ دو دریاؤں نیل ابیض اور نیل ازرق سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ آخر الذکر ہی دریائے نیل کے بیشتر پانی اور زرخیز زمینوں کا سبب ہے لیکن طویل اول الذکر دریا ہے۔ نیل ابیض وسطی افریقا میں عظیم جھیلوں کے علاقے میں جنوبی روانڈا سے نکلتا ہے اور شمال کی جانب تنزانیہ، یوگینڈا اور جنوبی سوڈان سے گذرتا ہے جبکہ نیل ازرق ایتھوپیا میں جھیل ٹانا سے شروع ہوتا ہوا جنوب مشرق کی سمت سفر کرتے ہوئے سوڈان سے گذرتا ہے۔ یہ دونوں دریا سوڈان کے دار الحکومت خرطوم کے قریب آپس میں ملتے ہیں۔

دریائے نیل کا شمالی حصہ سوڈان سے مصر تک مکمل طور پر صحرا سے گذرتا ہے۔

جنوبی مصر میں اس دریا پر مشہور اسوان بند تعمیر کیا گیا ہے جو 1971ء میں مکمل ہوا۔ اس بند کے باعث ایک عظیم جھیل تشکیل پائی جو جھیل ناصر کہلاتی ہے۔ یہ جھیل مصر اور سوڈان کی سرحد پر واقع ہے تاہم 83 فیصد جھیل مصر میں واقع ہے جبکہ 17 فیصد حصہ سوڈان میں ہے جہاں اسے جھیل نوبیا کہا جاتا ہے۔ جھیل ناصر 550 کلومیٹر طویل اور زیادہ سے زیادہ 35 کلومیٹر چوڑی ہے۔ اس کا کل رقبہ 5،250 مربع کلومیٹر ہے جبکہ پانی کے ذخیرے کی گنجائش 157 مکعب میٹر ہے۔ مصر کی آبادی کی اکثریت اور تمام شہر اسی دریا کے کنارے آباد ہیں۔ مصر کا موجودہ دار الحکومت قاہرہ دریائے نیل کے کنارے اور اس کے جزائر پر عین اس مقام پر واقع ہے جہاں دریا صحرائی علاقے سے نکل کر دو شاخوں میں تقسیم ہو کر ڈیلٹائی خطے میں داخل ہوتا ہے۔''

(اردو ویکی پیڈیا)

اس ندی کے متعلق ایک مشہور واقعہ بھی ہے جس کا ذکر دائرۃ المعارف نے اس طرح کیا ہے:

''جب مصر فتح ہوا تو اہل مصر نے فاتح مصر حضرت عمرو بن عاص سے کہا کہ ہمارے ملک میں کاشتکاری کا دارومدار دریائے نیل پر ہے، ہمارے ہاں یہ دستور ہے کہ ہر سال ایک حسین و جمیل کنواری لڑکی دریا میں ڈالی جاتی ہے، اگر ایسا نہ کیا جائے تو دریا خشک ہو جاتا ہے اور قحط پڑ جاتا ہے۔ حضرت عمرو بن عاص نے انہیں اس رسم سے روک دیا۔ جب دریا سوکھنے لگا تو حضرت عمرو بن عاص نے یہ واقعہ خلیفہ وقت امیر المومنین حضرت عمر فاروق کو لکھ بھیجا۔ جواب میں حضرت عمر نے تحریر فرمایا کہ دین اسلام ایسی وحشیانہ و جاہلانہ رسموں کی اجازت نہیں دیتا اور آپ نے ایک خط دریائے نیل کے نام لکھ بھیجا اور اسے دریا میں ڈالنے کی ہدایت کی۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:

''بعد حمد وصلوۃ کے مطلب یہ ہے کہ اگر تو اپنی طرف سے اور اپنی مرضی سے چل رہا ہے تب تو خیر نہ چل اگر اللہ تعالیٰ واحد وقہار تجھے جاری رکھتا ہے تو ہم اللہ

> تعالیٰ سے دعا مانگ رہیں کہ وہ تجھے رواں کردے‘‘ یہ پرچہ لے کر حضرت امیر عسکر نے دریائے نیل میں ڈال دیا۔ ابھی ایک رات بھی گذرنے نہیں پائی تھی جو دریائے نیل میں سولہ ہاتھ گہرا پانی چلنے لگا اور اسی وقت مصر کی خشک سالی تر سالی سے، گرانی ارزانی سے بدل گئی۔ (بحوالہ: البدایہ والنہایہ، مؤلف: ابو الفدا اءاسماعیل بن عمر بن کثیر)

دریائے نیل کے ساحلوں پر واقع یہ تہذیب آج بھی دنیا پر اپنی تابندگی بکھیر رہا ہے۔ اس کی اصل وجہ ہے یہاں کے لوگوں کا اپنی تہذیب اور وراثت کے تئیں بے انتہا لگاؤ اور پیار ہے۔ مصر کو دنیا میں امتیاز حاصل ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بڑا امتیاز یہ بھی ہے کہ دریائے نیل اور اس ملک کو کم از کم ساری دنیا کے مسلمان اس لیے بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیونکہ اس کا ذکر قرآن کریم بھی ہے۔ کئی انبیاء کا مسکن بھی یہ سرزمین رہ چکی ہے۔ جید صحابۂ کرام جیسے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابو درداء، فاتح مصر حضرت عمرو بن عاص کے علاوہ کئی اہم اسلامی شخصیات جیسے حضرت صلاح الدین ایوبی اور صوفیائے کرام جیسے، حضرت ذوالنون مصری، حضرت رابعہ بصریہ اور جید علمائے کرام اور دانشوروں نے اس سرزمین کو منور اور سرفراز کیا ہے۔

اہرامات مصر

قاہرہ کو ساری دنیا میں اہرامات کے سبب بھی جانا جاتا ہے کیونکہ یہ دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ہے۔ ان اہرامارت کو دیکھ کر انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ کس طرح ہزاروں سال قبل انسان نے ایسی عمارت کو بنایا ہوگا۔ اتنے بڑے بڑے پتھروں کو تراشنا اور اونچائی تک لے جانا اور سلیقے سے ایک دوسرے پر رکھنا اور اس طرح کی مخروطی شکل بن جائے۔ واقعی بڑی حیرت ہوتی ہے دیکھ کر کہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی یہ اہرامات اسی طرح موجود ہیں۔ اس احاطے میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب قسم کا احساس ہوتا ہے۔ یہ بڑے وسیع علاقے میں ہے۔ عام طور پر لوگ پیدل ہی جاتے ہیں۔ اونٹوں کی سواریاں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن پیدل چل کر پورے علاقے کو دیکھنا ایک تھکا دینے والا عمل ہے۔ شکر ہے ڈاکٹر جلال الحفناوی کا کہ انھوں نے اپنی گاڑی سے

ہمیں سیر کرائی اس لیے جلد ہی ہم اس پورے علاقے کو دیکھ سکے۔ یہ اہرامات جیزہ کے علاقے میں واقع ہے۔ یہ ایک طویل ریگستانی علاقہ ہے جس میں تین اہرامات (پیرامڈ) اور ابوالہول کا مجسمہ ہے۔ سب سے بڑا اہرم خوفو کا ہے۔ اس سے چھوٹا ہرم خفرع اور اس سے بھی چھوٹا ہرم منقرع کا ہے۔ یہ بنیادی طور فراعین کی قبریں ہیں۔ دراصل وہ خود کو خدا مانتے تھے اور عوام پر بھی جبر تھا کہ ان کو خدا مانا جائے۔ اس لیے زندگی میں تو ان کے رعب و دبدبے تو تھے ہی مرنے کے بعد بھی اس کو قائم رکھنے کی غرض سے اس طرح کی تعمیرات کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ان کی موت کے بعد لاشوں کو حنوط کیا جاتا تھا جو ایک بڑے سے کمرے میں لکڑی کے منقش تابوت میں رکھ کر دیگر اشیائے ضروریہ کے ساتھ رکھ دیا جاتا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد یہ چیزیں ان کے کام آئیں گی۔ اسی لیے بہت سی قیمتی اشیاء بھی ساتھ رکھی جاتی تھیں۔ کوئی ان اشیاء کو چرا کر نہ لے جائے اس لیے ہرم کے اندرونی حصے کو اس طرح بنایا جاتا تھا کہ کوئی سمجھ نہ سکے کہ لاش کہاں رکھی گئی ہے۔ اس کے بعد اس کو پتھر کے بڑے چٹانوں سے بالکل ڈھک دیا جاتا تھا۔ اندر جانے کے لیے خفیہ راستہ ضرور تھا جو عام لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ابوالہول کا مجسمہ جسے دنیا میں بڑے مجسموں میں سے ایک تسلیم کیا جاتا ہے، اس کے بنائے جانے کے بارے میں بھی کئی رائیں ملتی ہیں۔ لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ بنیادی طور پر ان اہرامات کی حفاظت کے لیے بنایا گیا تھا۔ ابوالہول کا مجسمہ دنیا کے بڑے مجسموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

ہرم سقارہ

اس وسیع و عریض علاقے میں اور بھی کئی ایسے مقامات ہیں جن کو دیکھنے کو موقع نہیں ملا۔ ہرم سقارہ بھی اس علاقے سے تقریباً 27 کیلومیٹر دور ہے۔ یہاں قدیم فرعونی زمانے کی باقیات موجود ہیں۔ لیکن سب سے اہم مقام وہ زندان ہے جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کیا گیا تھا۔ اب اس زندان کو نزدیک سے نہیں دیکھ سکتے کیونکہ اس کے گرد جالیاں لگا دی گئی ہیں۔ ہم جب پہنچے تو شام ہو رہی تھی اس لیے اندر جانے کی اجازت نہیں ملی دور سے ہی ہم نے اس سقارہ کو دیکھا۔

قریہ فرعونیہ

قاہرہ کے مضافات میں سیاحوں کو مائل کرنے کے لیے حسنی مبارک کے دور میں یہ مصنوعی قریہ یعنی دیہات بنایا گیا ہے۔اس مقام کو سیاحت کے لیے فروغ دیا گیا ہے۔اسے نہر نما جھیل کے طور پر بنایا گیا ہے۔ سیاح کشتی پر سوار ہو کر جاتے ہیں۔کئی دیو قامت مجسمے بنے ہوئے ہیں فرعونی دور میں جن کی عبادت کی جاتی تھی۔اس نہر کے کنارے جاتے ہوئے چھوٹے چھوٹے گاؤں جیسے بنے ہوئے ہیں جس میں کہیں مزدور کھیتی کرتے نظر آتے ہیں تو کہیں جانوروں کی پرورش اور کہیں روئی کاتتے اور کہیں پھولوں سے عطر کشید کرتے ہوئے لوگ دیکھے جاسکتے ہیں۔کہیں لوہے کے اوزار بناتے آہن گر اور کہیں پتھروں پر نقاشی کرتے فنکار نظر آتے ہیں۔کہیں پھلوں سے شراب کی کشید کی جارہی ہوتی ہے تو کہیں کپڑے تیار کرتی عورتیں اور مرد نظر آجائیں گے۔اس پورے منظر نامے سے قدیم مصری تہذیب و ثقافت کو سمجھا جاسکتا ہے۔ یہاں نظر آنے والے تمام مرد اور تمام عورتیں قدیم مصری لباس میں نظر آتی ہیں۔نہر کے بعد ایک نمائش کا اہتمام ہے جہاں ان کے معبد اور حرم کو دیکھایا گیا ہے اس کے بعد روایتی صنعت و حرفت کی دکانیں موجود ہیں۔مجموعی طور پر یہ قابل دید مقام ہے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ غیر ملکی سیاحوں سے اچھی خاصی فیس لی جاتی ہے۔

مصر کے مقدس مقامات کی زیارت

قاہرہ میں حضرت سیدہ زینب رضی اللہ تعالی عنھا کے مزار مقدس پر حاضری ہوئی۔سیدہ زینب جنھوں نے میدان کربلا میں ایک مثالی کردار پیش کیا۔دربار یزید میں سیدہ زینب کا خطاب آج بھی تمام عالم اسلام کے لیے مشعل راہ ہے۔ یہ قدیم قاہرہ میں واقع ہے۔اسے مسجد زینب کے نام سے جانا جاتا ہے۔اسی سے متصل قدیمی علاقے میں سیدہ سکینہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا کا بھی مزار مقدس ہے۔سیدہ عائشہ بنت حضرت امام صادق رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضری کے بعد سیدہ نفیسہ بنت حسن بن زید بن حسن ابن علی کے مزار پر حاضری ہوئی۔آپ کا نکاح اسحاق مؤتمن بن جعفر الصادق سے ہوا۔آپ اہل بیت میں ایک مشہور عالمہ گزری ہیں۔48 سال کی عمر میں مصر ہجرت کر کے تشریف لائیں۔ یہاں ان سے علم اور فیوض و برکات حاصل کرنے والوں کا ہجوم رہا

کرتا تھا۔اہل مصراس وقت بھی آپ کی بہت عزت وتکریم کرتے تھے اورآج بھی اہل مصر کی ان سے عقیدت ہے۔اس احاطے میں ایک بڑی مسجد ہے۔اہل قاہرہ کے لیے یہ اہم زیارت کی جگہ ہے۔جس صبح کو ہم یہاں فاتحہ کے لیے حاضر ہوئے تو دیکھا کہ لوگوں کا بڑا ہجوم ہے۔لیکن یہ منفرد ہجوم تھا۔لوگ خاموش اور غمگین تھے، کچھ عورتیں رو رہی تھیں کچھ غمزدہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے عبد العلیم سے پوچھا تو بتایا کہ قاہرہ میں اکثر لوگ یہاں جنازے لے کر آتے ہیں اور یہیں نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔جتنی دیر میں ہم فاتحہ پڑھ کر اوراس قدیم مسجد کی عمارت کو دیکھ کر باہر نکلے تو دیکھا کئی جنازے مسجد میں رکھے ہوئے تھے اور کئی ایمبولنس سے جنازے اتارے جارہے تھے۔

سیدہ رقیہ حضرت علی کی صاحب زادی والدہ کا نام ام حبیب الصھباء ہے۔ان کا نکاح حضرت علی کے بھتیجے مسلم بن عقیل سے ہوا۔اسی احاطے میں حضور اکرم ﷺ کی پھوپھی حضرت عاتکہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا اور امام علی محمد بن امام جعفر صادق کے مزارات ہیں۔اس احاطے کی دیکھ بھال ٹھیک سے نہیں کی جارہی ہے۔حالانکہ یہاں زیارت کرنے والوں کی بڑی تعداد ہوتی ہے۔ یہ علاقہ بھی قدیم قاہرہ کا ہے۔اسی سے کچھ دوری پر حضرت امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزار مبارک ہے۔ایک وسیع احاطے میں یہ واقع ہے مگر اندر نہیں جاسکے کیونکہ مرمت کا کام ہورہا تھا۔ حضرت امام شافعی کے ماننے والے دنیا کے اکثر ممالک میں موجود ہیں۔چار امام میں ایک بڑا نام نامی آپ کا بھی ہے۔فتویٰ آن لائن نے آپ کا مختصر۔تعارف اس طرح پیش کیا ہے:

''امام شافعی کے فقہی مسلک کو مذہب شافعی کہتے ہیں۔آپ کا نام محمد بن ادریس الشافعی ہے۔امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃُ اللہ علیہ کا سال وفات اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا سال ولادت ایک ہے یعنی آپ 150ھ میں فلسطین کے ایک گاؤں غزہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی زمانہ بڑی تنگدستی میں گزرا، آپ کو علم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ 7 سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا تھا، 15 برس کی عمر میں فتویٰ دینے کی اجازت مل گئی تھی۔آپ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر مسائل حل کرنے کے لئے اور برکت حاصل کرنے کے لئے حاضری دیا کرتے تھے۔آپ امام مالک کی شاگردی میں رہے اوران کی وفات تک ان سے علم حاصل کیا۔آپ نے اصولِ فقہ پر سب سے پہلی کتاب

''الرسالہ'' لکھی ''الام'' آپ کی دوسری اہم کتاب ہے۔آپ نے مختلف مکاتیب کے افکار و مسائل کو اچھی طرح سمجھا اور پرکھا پھر ان میں سے جو چیز قرآن وسنت کے مطابق پائی اسے قبول کرلیا۔جس مسئلے میں اختلاف ہوتا تھا اس پر قرآن وسنت کی روشنی میں مدلل بحث کرتے۔آپ صحیح احادیث کے مل جانے سے قیاس و اجتہاد کو چھوڑ دیتے تھے۔آج بھی مصر، لبنان، شام اور فلسطین میں شافعی مسلک کے پیروکار موجود ہیں۔آپ کے مقلد شافعی کہلاتے ہیں۔آپ نے 204ھ میں مصر میں وفات پائی۔''

اس کے بعد جن زیارتوں سے سرفراز ہوا اس کی تفصیل اس طرح ہے۔صحابیٔ رسول اکرم ﷺ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بدری صحابہ ہیں اور اہل صفہ میں سے ہیں۔آقائے نامدار ﷺ کی خدمت گزاری ان کا خاص مشغلہ تھا۔چنانچہ سفر میں آنحضرت ﷺ کی سواری کھینچنے کی خدمت ان ہی کے ذمے ہوتی تھی۔خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس دمشق کی فتح کا مژدہ آپ ہی لے کر آئے تھے۔اس کے بعد حضرت امام ابوالقاسم بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضری دی۔پھر فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضری ہوئی۔آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں عمان کے عامل رہے۔آپ کے بارے میں ویکی پیڈیا نے لکھا ہے کہ:

''عمرو بن العاص کو جس کارنامہ کی بدولت امتیاز حاصل ہوا وہ فتح مصر ہے۔آپ نے صرف چار ہزار جانبازوں کے ساتھ مصر کی سرحد عبور کی۔بابلیوں اور العریش پر قبضہ کرکے عین شمس پہنچے اور طویل محاصرے سے قصر شمع کو فتح کیا۔اس قلعہ کے پاس آپ نے فسطاط کا شہر بسایا جو بعد میں اسلامی مصر کا دارالحکومت قرار پایا۔اس فتح کا سب سے اہم معرکہ اسکندریہ کی فتح ہے جس کے بعد مقوقس شاہ مصر نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کرلی۔اور مصر کی تسخیر مکمل ہوگئی۔''

(بحوالہ اردو ویکی پیڈیا)

اس کے بعد سیدہ رابعہ بصریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مزار پر حاضری ہوئی۔خواتین اولیاء اللہ میں آپ کا مقام سب سے بلند ہے۔آپ کی ولایت دنیا بھر میں مشہور ہے۔قرونِ اولیٰ کی معروف صوفی شخصیت رابعہ بصری کی پیدائش 95ھ سے 99ھ کے دوران عراق کے شہر بصرہ میں

ہوئی۔خواجہ حسن بصری آپ کے مرشد تھے۔آپ سے بہت سے کرامات کا ظہور ہوا۔ان سے کئی واقعات منسوب ہیں ان میں سے ایک جو بہت مشہور ہے وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت رابعہ بصری جذب کی حالت میں بصرہ کی گلیوں میں ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے ہاتھ میں پانی لیے جارہی تھیں۔لوگوں نے ان سے پوچھا کہ یہ آپ کیا کرنے جارہی ہیں؟ تو رابعہ بصری نے جواب دیا کہ میں اس آگ سے جنت کو جلانے اور اس پانی سے دوزخ کی آگ بجھانے جارہی ہوں، تاکہ لوگ اپنے معبودِ حقیقی کی پرستش جنت کی لالچ یا دوزخ کے خوف سے نہ کریں، بلکہ لوگوں کی عبادت کا مقصد محض اللہ کی محبت بن جائے۔

انھیں کے مزار کے پاس ہی حضرت ذوالنون مصری علیہ الرحمۃ والرضوان کا مزار ہے۔یہ بڑے صوفی بزرگ گزرے ہیں۔تصوف میں آپ کا بڑا مقام ہے۔آپ کے ہی شاگردوں میں بایزید بسطامی ہیں۔ان کے علاوہ مفسر الاحلام علامہ ابن سیرین، شارح بخاری شیخ الاسلام امام بن حجر عسقلانی، سیدی کمال بن الھمام، حضرت سید احمد بن عطاء اللہ اسکندری اور کئی بزرگان دین کے مزارت پر حاضری کا شرف حاصل ہوا۔

قاہرہ کا شہرِ خموشاں

اوپر جن مقامات مقدسہ کا ذکر ہوا ہے۔یہاں کوئی سیاح آسانی سے نہیں پہنچ سکتا کیونکہ یہ ایک ایسے علاقے میں ہے جہاں جانا بہت مشکل ہے اور سب کو معلوم بھی نہیں ہے۔کیونکہ پہلی دفعہ جب ہم عزیزی عبدالعلیم کے ساتھ اس علاقے میں گئے تو ایسا لگا جیسے ہم کسی گاؤں یا قصبہ میں پہنچ گئے ہیں۔لیکن حیرت اس وقت ہوئی جب ہم نے صرف چھوٹے بڑے ویران گھر دیکھے۔اس کی ویرانی کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی قصبہ یا گاؤں نہیں ہے۔بلکہ یہ سب کے سب قبریں ہیں۔جتنے بھی گھر دیکھ رہے ہیں دراصل یہ قبر یا مقبرہ ہیں۔یہ کئی کیلومیٹر تک پھیلا ہوا یہ ایک ویران شہر کی طرح ہے۔ہمیں بہت حیرت ہوئی کیونکہ اس طرح کی کوئی جگہ ہم پہلی دفعہ دیکھ رہے تھے۔مصر میں لوگ اپنی قبروں کی لیے خود جگہ خریدتے ہیں۔بہت سے لوگ تو مرنے سے پہلے اس میں دیوار اور چھت بنالیتے ہیں اور موت کے بعد گھر والے وہیں دفن کرتے ہیں۔مصر میں میرے

ایک میزبان نے مجھے ایسی ہی ایک جگہ دیکھائی اور کہا کہ یہ ہمارا آخری گھر ہوگا۔ جب ہم نے تفصیل پوچھی تو بتایا کہ یہ میرے قبر کی زمین ہے۔اس زمین پر انھوں نے چھوٹا گھر بھی بنالیا ہے۔ یہ رواج شروع سے ہی ہے اسی لیے تمام قبروں کے ساتھ ایک گھر ملے گا۔ ہر خاندان والوں کے لیے اپنی خریدی ہوئی جگہ ہے جہاں وہ دفن ہوتے ہیں۔قاہرہ کا یہ علاقہ اتنے بڑے حصے میں پھیلا ہوا کہ یہ اپنے آپ میں ایک شہر ہے جسے شہر خموشاں کا نام دے سکتے ہیں۔

اسکندریہ کی زیارات

اسکندریہ میں نبی اللہ حضرت دانیال علیہ السلام کا مزار مقدس بھی موجود ہے۔ یہ ایک مسجد کے اندر ہے جسے مسجد نبی دانیال کہتے ہیں۔حضرت دانیال کا مزار اس مسجد کے وسط میں واقع ہے۔ لیکن مسجد کی زمین سے کافی نشیب میں ہے۔لکڑی سے بنی سیڑھیوں کی مدد سے اندر جاکر مزار پر حاضری دی جاسکتی ہے۔ساتھ ہی اسی مقام پر حضرت لقمان کا بھی مزار ہے۔ایسا لگتا ہے کہ اس وقت زمین کی سطح وہی رہی ہوگی۔اب یہ کم وبیش بیس فٹ کی گہرائی میں ہے۔ایک عجیب بات یہ ہے کہ جب میں سمرقند گیا تو وہاں بھی حضرت دانیال کا مزار دیکھا۔سمرقند کے بیرون شہر پہاڑی پر یہ مقام واقع ہے۔اس کے نیچے خوبصورت نہر بہہ رہی ہے۔اس کے قریب ہی ایک چشمہ ہے جو مستقل جاری ہے یہ چشمہ بھی لوگوں کی عقیدت کی جگہ ہے۔ ہر زیارت کرنے والے اس کا پانی پیتے ہیں۔اس پانی کو شفا مانتے ہیں۔ مسلم، عیسائی اور یہودی تینوں اقوام حضرت دانیال کو اپنا نبی مانتے ہیں اسی لیے مسلمانوں کے علاوہ عیسائی اور یہودی بھی بڑی تعداد میں زیارت کے لیے آتے ہیں۔حضرت دانیال کی قبر لمبائی سترہ میٹر کیوں ہے۔اس کے متعلق ایک روایت یہ ہے کہ بادشاہ کے حکم سے اتنی لمبی قبر بنائی کیونکہ عیسائی - یہودی سب عقیدت کرتے تھے اور کچھ لوگ پوجنے بھی لگے تو بادشاہ نے کسی اور جگہ سے منتقل کر کے قبر یہاں بنوائی اور لمبائی اتنی رکھی تاکہ کسی کو اصل قبر کس جگہ ہے اس کا علم نہ ہوسکے۔حضرت دانیال کی قبر مبارک کے حوالے سے ایران کے علاقہ شوش میں بھی دعوی کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔لیکن اسکندریہ میں نبی دانیال کے نام سے مسجد ہے۔

اسکندریہ میں صحابی رسول صلی اللہ ﷺ حضرت ابو درداء کا مزار مبارک بھی موجود ہے۔ یہ

وہی صحابی ہیں جن سے کئی احادیث مروی ہیں۔آپ کا شمار جید صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ قصیدہ بردہ شریف کے خالق ہیں۔رسول اکرمﷺ کی شان میں لکھی گئی یہ نعت دنیا بھر میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔اس نعت پاک کے کئی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔اس نعت کے لکھے جانے کے سبب امام بوصیری کو خواب میں رسول اللہﷺ کی زیارت نصیب ہوئی تھی اور آپ بیماری سے شفایاب بھی ہوئے تھے۔یہ مقام جامع مسجد حضرت ابوالعباس المرسی کے ساتھ ہی ایک مسجد میں ہے۔جامع مسجد عباس مرسی ایک بڑی مسجد ہے جس میں عارف باللہ حضرت ابوالعباس المرسی کا مزار ہے۔آپ کا شمار بھی بڑے بزرگوں اور صوفیوں میں ہوتا ہے۔ان کے علاوہ ہم نے عارف باللہ سیدی عبدالرزاق الوفائی کے مزار پر بھی حاضری دی۔

مجموعی طور پر یہ کہا جائے تو بیجا نہیں ہوگا کہ مصر کی سرزمین کو اولیائے کرام،صحابۂ کرام اور انبیاء علیھم السلام نے فیوض و برکات سے سرفراز کیا ہے۔یہ وہی ملک ہے جس کا تعلق حضرت موسیٰ،حضرت ابراہیم،حضرت یوسف علیھم السلام سے ہے۔اسی ملک میں کوہِ طور بھی واقع ہے اور بئیر موسیٰ اور کئی ایسے مقدس مقامات ہیں جہاں جانے کا شرف نہیں مل سکا۔روحانی اعتبار سے سفر کرنے والوں کے لیے مہینوں قیام کرنا ہوگا تب شاید ان مقامات کی زیارت ہو سکے۔شکر ہے اب تک تین دفعہ مصر کا سفر کر چکا ہوں اس لیے چند مقامات کو دیکھنے کو موقع ملا۔

راس البر

مصر کے تیسرے سفر میں اس مقام کی زیارت نصیب ہوئی۔یہ جگہ قاہرہ سے تقریباً دوسو کیلو میٹر کی دوری پر ہے۔پروفیسر یوسف عامر صاحب نے ہمارے لیے اپنی گاڑی بھیجی جس سے ہم اس جگہ کو دیکھ سکے۔یہ وہی جگہ ہے جس کا ذکر قرآن پاک کے سورۂ رحمان میں ہے۔یہاں بحر متوسط اور دریائے نیل کا سنگم ہے۔دور ہی سے پانی کا دوالگ رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔قرآن پاک کا یہ اعجاز یہاں اپنی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے کہ اس سمندر میں لہریں بھی اٹھتی ہیں اور موجوں میں تلاطم بھی ہوتا ہے۔یہ پانی آپس میں ایک دوسرے سے ٹکراتے بھی ہیں لیکن بالکل الگ رہتے ہیں۔قرآن میں اس کا ذکر یوں آتا ہے۔مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ (19) اس نے دو سمندر ملا دیے

جو باہم ملتے ہیں۔ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (20) ان دونوں میں پردہ ہے کہ وہ حد سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (21) پھر تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

میں نے کئی ممالک میں سمندر کے ساحل دیکھے ہیں لیکن اس مقام کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہاں عجیب سے روحانی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا میں عجیب سی فرحت ہے اور سمندر کے کناروں کی رونق بھی نا قابل بیان ہے۔

بحیرۂ قارون اور وادئ ریان

فیوم کا سفر مصر کے اردو اساتذہ کے مشورے سے کیا۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ ان کے مشورے کے سبب ان علاقوں کو دیکھ سکا۔ ہندستان کے شہر اورنگ آباد میں سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ بابا شاہ مسافر کے مقبرے کے احاطے میں ''پن چکی'' موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اس کھام ندی کے کنارے ہے۔ لیکن کس طرح اس کی تعمیر ہوئی یہ صیغۂ راز میں ہے۔ اندر داخل ہونے والے صدر دروازے کے دونوں کناروں پر چھوٹے مینار بنے ہیں جہاں سے پانی نیچے کی طرف آتا ہے۔ اسی پانی کی روانی سے آٹے کی چکی چلائی جاتی تھی جس سے آٹا پیسا جاتا تھا۔ کیونکہ اس خانقاہ میں بڑی تعداد میں عقیدت مند آیا کرتے تھے۔ ان کے لیے لنگر کا نظم تھا۔ اتنی بڑی تعداد کے لیے ہاتھ کی چکی سے آٹا پیسنا مشکل کام تھا۔ سو اس پن چکی سے کام لیا جاتا تھا۔ آج اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی یہ پانی اسی طرح رواں ہے اور چکی بھی چل رہی ہے۔ اسی طرح کی پن چکی ہم نے فیوم شہر میں دیکھا۔ یہ مصر کا قدیم شہر ہے۔ اس شہر میں یہ پن چکی بہت مشہور ہے لیکن یہ پن چکیاں نہروں سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان سے کاشتکاری کے لیے پانی کا استعمال کیا جاتا تھا۔

فیوم شہر سے پہلے ہی ایک علاقہ ہے جسے بحیرۂ قارون کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ ایسا ہے کہ کہیں ریگستان ہے تو کہیں ہریالی بھی ہے۔ اس علاقے میں داخل ہوتے ہی ایک بڑا بحیرہ ہے۔ (پانی کا بڑا ذخیرہ جسے ہم جھیل کہتے ہیں)۔ روایت یہ ہے کہ قارون جسے اللہ نے دنیا میں بہت زیادہ دولت دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی دولت کا حال یہ تھا کہ اس کے خزانے کے گھروں کی چابھیاں چالیس پہلوان مل کر اٹھاتے تھے۔ لیکن وہ اللہ کی نافرمانی کا مرتکب ہوا تو اللہ نے اسے اس کی دولت اور

محلات کے ساتھ سب کچھ کو اسی میں غرق کر دیا۔

اسی سے کچھ دوری پر ایک علاقہ ہے جس کا نام ''یوسف الصدیق'' ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وہی علاقے ہیں جس کا تعلق عزیز مصر حضرت یوسف علیہ السلام سے ہے۔ لیکن ان علاقوں میں اس عہد کی کچھ باقیات موجود نہیں ہیں۔ یہ ریگستان بھی ہے اور کا شکاری کی زمین بھی ہے۔

اسی سے تقریباً پچاس کیلومیٹر کی دوری پر وادیٔ ریان واقع ہے۔ یہ ایک بہت بڑا ریگستانی سلسلہ ہے جس کا رقبہ سترہ سو کیلومیٹر یا اس سے کچھ زیادہ ہے۔ اس وادی میں کئی آبی ذخیرے ہیں۔ لیکن قابل دید ''شلالات'' ہیں۔ اس کا معنی ہے پانی کے جھرنے۔ اس وادی میں داخل ہونے کے لیے ایک صدر دروازہ ہے جہاں غیر ملکیوں سے اچھی خاصی فیس وصول کی جاتی ہے۔ یہ بالکل ریگستان ہے دور دور تک کوئی درخت بھی نظر نہیں آئے گا۔ صرف نشیب و فراز والے ریگستانی ٹیلے ہیں۔ تقریباً پچاس کیلومیٹر کی دوری طے کرنے کے بعد ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں ریگستان کے درمیان ایک ایسی جگہ ہے جہاں ریگستان میں کئی جانب سے جھرنے بہہ رہے ہیں۔ یہیں پر کچھ ہرے بھرے درخت نظر آئے۔ اسی سے متصل ایک مٹی کی خوبصورت مسجد بنی ہوئی ہے۔ اسی کے پاس ایک چھوٹا سا ریسٹورینٹ بھی ہے۔ اس سے کچھ دوری پر ایک بڑا بحیرہ ہے جہاں اس جھرنے کا پانی جمع ہوتا ہے۔ یہ جگہ قدرت کا انوکھا نمونہ ہے۔ اس کے نظارے ایمان کو روشن کرتے ہیں کہ اللہ نے اس ریگستان میں کیسے پانی کے جھرنے کو جاری کیا۔ یہاں پہنچ کر کیسا محسوس ہوتا ہے یہ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔

مصر کے یہ اسفار روحانی، علمی اور ادبی اعتبار سے بہت یادگار ہیں۔ یہ سلسلہ ابھی یہیں ختم نہیں ہوا ہے کیونکہ اب اردو ادب کے حوالے سے ایسے روابط استوار ہو گئے ہیں کہ آمد و رفت کا سلسلہ ان شاء اللہ برقرار رہے گا۔

○○○

روداد یورپ ادبی قافلہ

میرے تمام اسفار میں یہ سفر تجربات ومشاہدات کے لحاظ سے بالکل منفرد رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ادبی قافلہ واقعی صرف ادبی ہی رہا۔ اور ایسا رہا کہ ہر دن سیمنار، مذاکرہ اور مشاعرہ کی محفل میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ یہ ادبی قافلہ جناب ڈاکٹر سید تقی عابدی کی قیادت میں تھا۔ عابدی صاحب نے ہی اس کو ترتیب دیا تھا اور ہر طرح کے انتظامات بھی انھوں نے ہی کیا تھا۔ عابدی صاحب اردو کے نامور محقق، ادیب اور شاعر ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ وہ ایک ڈاکٹر ہیں اور اسی پیشے سے کناڈا میں منسلک ہیں۔ لیکن وہ اپنے پیشے کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی خدمت میں ہمیشہ مصروف رہتے ہیں۔ وہ ایک ماہر طبیب ہیں اس میدان میں بھی ان کی کافی شہرت ہے۔ اردو ادب میں بھی وہ عالمی شہرت کے مالک ہیں۔ ہمیشہ کچھ نیا کرنے کا تجربہ کرتے رہتے ہیں۔ یورپ کے ممالک ہوں یا برطانیہ وہ ہمیشہ اردو کی کانفرنسوں اور جلسوں میں شریک ہوتے ہی رہتے ہیں بلکہ ان کے بغیر یہاں کی ادبی محفلیں ادھوری رہتی ہیں۔ برصغیر سے باہر اردو کے ادیبوں میں تحقیق وتنقید کے میدان میں کام کرنے والوں میں سب سے نمایاں نام اور اہم تحقیقی وتنقیدی کام تقی عابدی کا ہی ہے۔ اب تک ان کے پچاس سے زائد علمی، ادبی اور تحقیقی کام سامنے آچکے ہیں۔ ہندستان، پاکستان، مصر اور کئی ممالک میں ان پر تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ ان کی خدمات کے عوض ہند وپاک کے کئی ادبی اور علمی اداروں نے انھیں اعزازات سے بھی نوازا ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ وہ فارسی زبان پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ تقی عابدی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے اردو کے نامور شعرا کی شخصیت اور فن پر بہت ہی معیاری اور تحقیقی کام کیا ہے ان میں حالی، اقبال، فیض،

انیس، دبیر اور کئی معاصر شعرا پر ان کا کام اردو دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے یہ پروگرام تو کئی مہینوں پہلے ہی بنایا تھا مگر ہمیں ایک ماہ قبل اس وقت بتایا جب سارے پروگرام مرتب ہو گئے تھے۔ اس ادبی قافلے کا منصوبہ تو یہ تھا کہ برطانیہ کے بعد جرمنی اور اسپین میں بھی کئی پروگرام ہوں گے مگر کسی وجہ سے اس قافلے کا پروگرام صرف برطانیہ تک محدود رہا۔ اس قافلے کا برطانیہ کی کئی ادبی تنظیموں سے اس لیے اشتراک کیا گیا تھا تاکہ مقامی طور پر وہ نظم و نسق کریں اور مستقبل میں علمی و ادبی کام کو مشترکہ طور پر برطانیہ میں کیسے بڑھایا جائے اس پر غور و خوض بھی کریں۔ جن تنظیموں سے اشتراک رہا ان میں 'اہل قلم' جس کا خاص رول تھا اور جس کے سرپرست خود تقی عابدی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو مرکز لندن، مسلم ہینڈس نوٹینگھم، یورک شائر ادبی فورم بریڈفورڈ، بزم ادب شیفلڈ، خزینۂ شعر و ادب مانچسٹر، اقبال اکیڈمی برمینگھم، فیض کلچرل فاؤنڈیشن لندن۔ اپنے آپ میں اس ادبی قافلے کی یہ سب بڑی کامیابی تھی کہ اس بینر تلے برطانیہ کی اتنی تنظیمیں ایک ساتھ آئیں۔ ان کا ساتھ آنا ایک نئی پہل تھی۔ برطانیہ میں ادبی قافلے کے اختتام کے بعد تمام ذمہ داروں نے محسوس کیا کہ اس طرح کے اشتراک سے ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے اور باہمی تعاون کو فروغ بھی ملتا ہے۔

بہرکیف اس اہم پروگرام کے لیے ہم 5 جولائی 2018 کو دہلی سے روانہ ہوئے۔ اس قافلے میں میرے علاوہ جموں یونیورسٹی شعبۂ اردو کے صدر اور اردو کی سرگرم عمل شخصیت پروفیسر شہاب عنایت ملک، بھوپال سے اردو اکیڈمی کی سکریٹری نصرت مہدی جو ایک اچھی شاعرہ اور ادیبہ ہیں، شریک تھیں۔ حسن اتفاق یہ تھا کہ تقی عابدی صاحب ان دنوں اپنے ادبی دورے پر ہندستان میں تھے اس لیے انھوں نے یہیں سے اس قافلے کی قیادت سنبھال لی۔ نصف شب کی فلائٹ سے ہم روانہ ہوئے۔ صبح کوئی سات بجے ہم لندن کے ہیتھرو ائیر پورٹ پر اترے۔ امیگریشن پر کچھ تو ہجوم کے سبب اور کچھ سختی کے سبب تاخیر ہوئی۔ خیر ایک گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد ہمارا نمبر آیا۔ سامان لینے کے بعد ہم باہر نکلے تو تقریباً سبھی کو کافی اور چائے کی سخت حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ عابدی صاحب سمجھ گئے اس لیے ہم کافی ہاؤس میں بیٹھ گئے اور پروگرام کے مطابق شہزاد ارمان صاحب کو یہیں ملنا تھا، سو کچھ ہی دیر میں ان سے بھی ملاقات ہو گئی۔ ان سے

معلوم ہوا کہ امریکہ سے عبدالرحمان عبد صاحب کچھ ہی دیر میں اسی ائیر پورٹ پر آنے والے ہیں اس لیے ہم نے ان کا انتظار کیا۔

ڈاکٹر عبدالرحمان عبد بنیادی طور پر پاکستانی ہیں۔ نیو یارک، امریکہ میں رہتے ہوئے تقریباً نصف صدی کا عرصہ ہو چکا ہے اس لیے اب وہ باضابطہ امریکی شہری ہیں۔ پیشے سے عبدالرحمان صاحب بھی ماہر طبیب ہیں۔ اردو ادب سے ان کا خاص شغف ہے۔ وہ ایک اچھے اور فی البدیہہ شاعر کے ساتھ ساتھ ادیب بھی ہیں۔ ادب کے رجحان و رویے پر ان کی خاص نظر رہتی ہے۔ وہ امریکہ میں اپنے طور پر ادبی سرگرمی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ عبدالرحمان صاحب امریکہ میں مشہور سماجی کارکن کے طور پر بھی پہچانے جاتے ہیں۔ اس ادبی قافلے میں بھی انھوں نے اپنے طور پر تعاون کیا تھا۔ اس ادبی قافلے میں جو اہم شخصیات شریک تھیں ان میں سید تقی عابدی، عبدالرحمان عبد، شہزاد ارمان، ڈاکٹر جاوید شیخ، مہ جبیں غزل انصاری، قیصر عباس، ایوب اولیا، فرزانہ نیناں، نغمانہ کنول، فاروق ساغر، ڈاکٹر فاطمہ حسن۔ ہندستان سے میں (پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین)، پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر نصرت مہدی اور سپریم کورٹ کے مشہور وکیل جناب خلیل الرحمان صاحب۔

ائیر پورٹ سے شہزاد ارمان صاحب کے ساتھ ہوٹل کے لیے روانہ ہوئے۔ عابدی صاحب نے اچھے ہوٹل میں بکنگ کرائی تھی حالانکہ یہ وہ دن تھے جب یورپ میں سیاحوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ خیر ہوٹل پہنچ کر ہمیں یہ بتایا گیا کہ جلدی سے فریش ہو جائیں کیونکہ ہمیں دو پہر کے کھانے کے لیے، اردو مرکز لندن کے سربراہ جناب ڈاکٹر جاوید شیخ صاحب کے یہاں جانا ہے۔ جاوید صاحب نصف دہائی سے لندن میں مقیم ہیں۔ اردو مرکز کے تحت وہ مختلف ادبی سرگرمیاں کرتے رہتے ہیں اور ہمیں بھی ویزا کے لیے انھیں کی جانب سے دعوت ملی تھی۔ ہم دو پہر کے بجائے سہ پہر کو ان کے گھر پہنچے۔ انھوں نے اور ان کی اہلیہ نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ ان کا مکان کافی کشادہ تھا۔ عام طور پر بڑے شہروں میں اتنے کشادہ مکانات کم ہی لوگوں کے پاس ہوتے ہیں۔ سلام و دعا اور تعارف کے بعد ہماری ملاقات دہلی کی مشہور ادبی شخصیت جناب خلیل الرحمان سے ہوئی۔ حیرت ہے کہ ان سے دہلی میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ خلیل

صاحب خالص دلی والے ہیں اس لیے ان میں دہلی کی تہذیب کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ ایک مشہور وکیل بھی ہیں لیکن حیرت اس پر ہوئی کہ ادب کا کافی گہرا مطالعہ بھی ہے۔ فارسی بہت اچھی جانتے ہیں۔ گفتگو ہو رہی تھی اور کیچن سے قورمہ اور بریانی کی خوشبو بھی آ رہی تھی۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ لندن میں یہ کیسے ممکن ہے۔ تب یہ راز کھلا کہ جناب خلیل صاحب کو کھانا پکانے کا بھی بہت شوق ہے اور وہ خالص دلی والے ایسے کھانے بھی بناتے ہیں جن کا اکثر لوگوں نے صرف نام سنا ہے۔ خلیل صاحب کی ایک بڑی خاصیت یہ ہے کہ وہ کھانے بنانے سے زیادہ کھلانے پر یقین رکھتے ہیں۔ دلی میں اکثر ان کے گھر پر دعوتیں ہوتی رہتی ہیں۔ خیر ہم بھوکے بھی تھے اور کھانا بھی کافی لذیز تھا اس لیے بلا تاخیر کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ دیر تک علمی و ادبی گفتگو بھی ہوتی رہی اور چائے کافی کے بعد جوں ہی ڈرائینگ روم میں پہنچے پاکستان سے پروفیسر محمد کامران صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی اور ان کی اہلیہ صائمہ کامران جو ایک اچھی شاعرہ ہیں، پہنچ گئے۔ اس طرح یہ قافلہ مکمل ہوا۔ ڈرائینگ روم میں میڈیا والے منتظر تھے۔ تقی عابدی صاحب نے ان کو بریفنگ دی اور ادبی قافلے کے اغراض و مقاصد پر باتیں کیں۔ رات گئے ہم ہوٹل پہنچے۔ طے یہ ہوا کہ صبح کو ہی تیار ہو کر نکلنا ہے کیونکہ دس بجے سے ''اقبال کا فکر وفن'' پر سیمینار پاکستان ایمبیسی، لندن میں شروع ہونا تھا۔

لندن کے کسی سیمینار میں شرکت کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ سوچا کیا لندن میں اتنے اردو والے ہیں؟ لیکن پروگرام شروع ہوتے ہی ہال بھر گیا۔ یہاں کئی اہم اردو کی شخصیات سے ملاقات ہوئی۔ ان میں بی بی سی کے مشہور براڈ کاسٹر جناب رضا علی عابدی، ایوب اولیا کے علاوہ کئی ادیب و شاعر سے ملاقاتیں ہوئیں۔ سہ پہر تک یہ پروگرام چلا اور بہت کامیاب رہا۔

اسی شام ہمیں نوٹنگھم کے لیے روانہ ہونا تھا کیونکہ یہاں شام 6 بجے پروگرام شروع ہونا تھا۔ عام طور پر برطانیہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں شام کو ہی اس طرح کے پروگرام منعقد ہوا کرتے ہیں۔ نوٹنگھم میں فرزانہ نیناں اور شہزاد ارمان مقامی میزبان تھے۔ شہزاد ارمان ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر ہیں، خوش فکر ہیں۔ ادبی سرگرمیوں میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ انتہائی خوش اخلاق اور ادب نواز شخصیت کے مالک ہیں۔ فرزانہ نیناں 'نوٹنگھم آرٹس اینڈ لٹریری سوسائٹی' کی

چیئر پرسن ہیں۔اب برطانوی شہری ہیں اور نوٹنگھم میں مقیم ہیں۔کئی دہائیوں سے وہ برطانیہ میں رہتی ہیں لیکن مشرقی تہذب سے اسی طرح لگاؤ ہے جیسے پھول پودے سے لگا ہو۔فرزانہ نیناں کی شہرت اگرچہ ان کی شاعری کے سبب زیادہ ہے مگر وہ صرف شاعرہ نہیں ہیں وہ ایک اچھی نثر نگار، ادیبہ اور ڈیجیٹل ٹکنالوجی سے اردو کو ہم آہنگ کرنے والی برصغیر کی اقدار سے معمور ایک مشرقی خاتون ہیں۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنی تنظیم کے ذریعے اور دوسری کئی تنظیموں کے اشتراک سے اردو کی محفلیں سجاتی رہتی ہیں۔یہ سرگرمیاں اگر ایک جانب اردو زبان وادب کی ترویج میں مفید ہیں تو دوسری جانب فرزانہ کو یہ بھی خیال رہتا ہے کہ برطانیہ میں مقیم افراد کو اپنی تہذیبی سرگرمیوں کی کمی کا احساس ہوتا ہے اسی کے پیش نظر وہ ''ریڈیو فضا'' سے نوع بنوع پرگراموں کا انعقاد کرتی رہتی ہیں۔ یہاں ''اردو ادب میں تصوف کی روایت'' پر سیمنار ہوا۔اس کے بعد مشاعرہ بھی ہوا۔'مسلم ہنڈس' تنظیم نے بھی اس پروگرام میں معاونت کی۔ یہاں لندن کے مقابلے زیادہ تعداد میں لوگ موجود تھے۔مرد سے زیادہ خواتین کی تعداد تھی۔ برطانیہ کے اس شہر میں پاکستانی احباب کی تعداد زیادہ ہے۔وہ اپنی معاشی سرگرمیوں کے علاوہ ادبی اور تہذیبی سر گرمیوں سے بھی جڑے رہتے ہیں۔یہ بہت ہی اہم بات ہے۔اس پروگرام میں ان کی شرکت اور دلچسپی سے یہی اندازہ ہوا کہ نئی نسل کے بھی لڑکے اور لڑکیاں بہت دلچسپی سے حصہ لے رہی تھیں۔ یہ وہ پہلو ہیں جو اردو کے فروغ کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔

دوسرے دن بریڈفورڈ جانا تھا۔یارک شائر ادبی فورم کی جانب سے نسائی ادب پر سیمنار تھا۔ مہ جبیں غزل انصاری صاحبہ جو اس تنظیم کی چیئر پرسن ہیں ان کی سرپرستی میں یہ سیمنار ہورہا تھا۔ محترمہ مہ جبیں غزل انصاری کی شخصیت کو اردو زبان وادب کے تناظر میں دو جہتوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ایک تو ان کا شعری تخلیق کا منظرنامہ اور دوسرا اردو زبان وادب کی ترویج کی کوششیں۔ دونوں لحاظ سے مہ جبیں غزل انصاری صاحبہ بلند مقام پر فائز ہیں۔ان کا تعلق پاکستان کے شہر عروس البلاد کراچی سے ہے۔ ان کے شوہر نامدار ڈاکٹر نسیم الحق انصاری صاحب کا تعلق بھی پاکستان سے ہے۔ ان کے اب تک تین مجموعہ کلام منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلا ''ادھورے خواب'' دوسرا ''سنہرے خواب'' اور تیسرا شعری مجموعہ ''زندگی'' کے نام سے ہے۔یارک شائر ادبی

فورم ایک فعال تنظیم ہے جو ہر سال بین الاقوامی مشاعرے اور مذاکرے کا اہتمام کرتی ہے۔اس تنظیم سے جڑے تمام افراد الگ الگ پیشے سے وابستہ ہیں لیکن سب کے اندر ادب کا ستھرا ذوق موجود ہے۔ پاکستان کی مشہور شخصیت اور ادب میں اعلیٰ مقام پر فائز محترمہ فاطمہ حسن صاحبہ جو پاکستان کے کئی بڑے اداروں کی سرپرست ہیں۔خوش فکر شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔انھوں نے نسائی ادب کے سیمنار کی صدارت کی اور ڈاکٹر تقی عابدی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ہم سبھوں نے اظہار خیال کیا۔سیمنار کے بعد بہت کامیاب مشاعرہ ہوا۔فاطمہ حسن صاحبہ نے مشاعرہ لوٹ لیا۔اختتام پر پاکستانی بریانی سے ضیافت ہوئی۔ دوسرے دن دوپہر کو انھوں نے تمام مندوبین کو اپنے گھر دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ یہاں بھی بہت دیر تک علمی و ادبی گفتگو ہوتی رہی۔فاطمہ صاحبہ انھیں کے گھر پہ مقیم تھیں۔اس سفر میں ان کو قریب سے جاننے کا موقع ملا اور ان کی علمی و ادبی فتوحات کا اندازہ ہوا۔

بریڈفورڈ میں ایک اہم اضافہ یہ ہوا کہ یہاں جناب مقصود الٰہی شیخ سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک نامور ادیب ہیں لیکن ایک ادیب سے زیادہ وہ برطانیہ میں اردو کے فروغ کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔وہ جن حالات میں جس طرح برطانیہ میں تقریباً چھ دہائیوں سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں وہ حروف زریں سے لکھنے جانے کی مستحق ہیں۔مقصود الٰہی شیخ کی شخصیت کے کئی جہات ہیں۔ان کی شناخت ایک صحافی، فکشن نگار، اور محقق و ناقد کے طور پر ہے۔ان کی ایک بڑی خدمت ''مخزن'' کی ادارت اور بریڈفورڈ سے اس کی اشاعت ہے۔اس رسالے کو برطانیہ کے علاوہ ہندو پاک اور دیگر ممالک میں کافی شہرت ملی۔ یہ دستاویزی نوعیت کا جریدہ تھا جس کے تمام انتظام و انصرام انھوں نے خود کیا۔انھوں نے افسانے میں ایک نیا تجربہ "پوپ کہانی" کے نام سے کیا۔ان کا شمار اردو میں "پوپ کہانی" کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ان سے میری پہلی ملاقات ترکی میں ہوئی تھی۔وہ تپاک سے ملے اور ہندستان میں علمی و ادبی کام پر بات چیت ہوئی۔

ہمارا اگلا پڑاؤ شیفلڈ تھا جہاں نعتیہ ادب پر سیمنار منعقد ہوا۔ یہاں نسبتاً کم لوگ تھے مگر سیمنار بہت کامیاب ہوا۔ یہاں بھی خواتین کی تعداد زیادہ تھی۔خواتین نے ہی پروگرام کو سنبھالا۔اس پروگرام میں محترمہ صبا عالم شاہ نے جس طرح نظامت کی اور جس خوبصورت لب و لہجے میں باتیں

کیں وہ باعث حیرت تھی ،انھوں نے سب کا دل جیت لیا۔ان کی نظامت سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ یہاں اردو نئی نسل میں بھی زندہ وتابندہ ہے۔سیمنار کے بعد مشاعرے میں نئی نسل کی کئی مقامی خواتین نے اپنا کلام پیش کیا۔ان کے کلام کے موضوعات واسالیب اورفن پراعتماد کو دیکھ کرایسالگا کہ ابھی اردو زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ یہاں اردو کی خدمت کرنے والی شخصیت فیاض نقوی، قیصر عباس،کوثر شاہ،صائمہ ناز اور مطیع اللہ صاحبان سے ملنا ہمارے سفر میں ایک خوشگوار اضافہ تھا۔

اگلے دن ہمیں مانچسٹر جانا تھا جہاں "خزینۂ شعروادب'' کے اشتراک سے سیمنار اور مشاعرہ ہونا تھا۔اس تنظیم کی صدر ایک معروف شاعرہ محترمہ نغمانہ کنول صاحبہ ہیں۔ ان کے نو یا دس مجموعۂ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ برطانیہ اور یورپ کے علاوہ برصغیر میں بھی اپنی شاعری اورادبی سرگرمیوں کے سبب جانی پہچانی جاتی ہیں۔شیفلڈ سے مانچسٹر کی دوری شاید تین گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ قافلے کو دیر سے نکلنا تھا۔مانچسٹر میں ہماری دوست محترمہ صباحت قمر صاحبہ رہتی ہیں۔صباحت صاحبہ کا تعلق پاکستان سے ہے۔وہ جی سی یونیورسٹی میں اردو کی لیکچرر تھیں مگر شادی کے بعد یہاں منتقل ہو گئیں۔ یہاں آکر انھوں نے وکالت کی تعلیم حاصل کی اور اب وہ وکالت کے پیشے سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان سے فون پر برابر رابطہ رہا اور طے تھا کہ مانچسٹر پہنچتے ہی ملاقات ہوگی۔لیکن صباحت صاحبہ نے ہم سے کہا کہ ہم آپ کو لینے آجائیں گے تا کہ آپ کے ساتھ زیادہ وقت گزارا جاسکے۔ وہ صبح صبح ہی اپنے شوہر جناب زاہد صاحب کے ساتھ ہمارے ہوٹل پہنچ گئیں۔ دونوں بہت خوش اخلاق اور ملنسار ہیں۔ہم نے تقی عابدی اور دیگر احباب سے ان کا تعارف کرایا اور ان کے ساتھ مانچسٹر کے لیے نکل پڑے۔انھوں نے شہر کی سیر کرائی ، دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھایا اور طے شدہ پروگرام کے مطابق پانچ بجے ہوٹل پہنچ گئے۔

شام چھ بجے سے مانچسٹر کے ایک ہوٹل میں پروگرام تھا ہم وقت سے نہیں پہنچ سکے کیونکہ شام کو ٹریفک زیادہ تھی۔آدھے گھنٹے تاخیر سے جب ہال میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہال بھرا ہوا ہے اور سامعین منتظر ہیں۔ یہاں برصغیر کی طرح نہیں کہ وقت سے ایک گھنٹہ لیٹ پروگرام شروع ہو۔ بلکہ ہر جگہ وقت مقررہ پر پروگرام شروع ہوئے۔خیر یہاں " غالب کا انداز بیاں اور'' کے عنوان سے سیمنار ہوا جس میں مقامی ادیبوں کے علاوہ قافلے کے تمام احباب نے مقالے پیش کیے اور

بعد میں مشاعرے پراس کا اختتام ہوا۔عشائیہ کے بعد ہم ہوٹل پہنچے۔اگلے دن لندن واپس جانا تھا۔یہاں فیض فاؤنڈیشن کے زیراہتمام فیض پر سیمنار ہونا تھا۔صبح کو روانگی سے قبل صباحت صاحبہ اور زاہد صاحب ملنے آئے۔انھوں نے تحائف بھی پیش کیے اور پھر ملاقات کی خواہش ظاہر کر کے ہم سے رخصت ہوئے۔دوپہر تک ہمارا قافلہ لندن کے لیے روانہ ہوا۔

لندن میں ہمارے دوست جانب فہیم اختر صاحب رہتے ہیں۔دہلی سے روانہ ہونے سے قبل ہی ہم نے ان کو سارا پروگرام بتا دیا تھا۔انھوں نے بڑے اخلاق سے ہم پر دباؤ ڈالا کہ پروگرام کے اختتام پر آپ کچھ دن میرے ساتھ رکیں۔اس لیے ہم نے اپنا ٹکٹ دو دن بعد کا کرایا تھا۔شام کو ہلکی بارش ہورہی تھی۔ہم سیمنار ہال میں موجود تھے۔پروگرام شروع ہوا لیکن میں نے اس میں اپنا مقالہ پیش کرنے سے معذرت کر لی تھی کیونکہ مجھے فہیم صاحب کے ساتھ ان کے گھر جانا تھا۔فہیم صاحب اپنی گاڑی سے مجھے لینے پہنچ گئے۔میں نے سب کو الوداعی سلام کہا اور فہیم صاحب کے ساتھ روانہ ہوگئے۔مجھے افسوس ہوا کہ میں نے شہاب بھائی کو کیوں نہیں روک لیا تھا۔مگر اب سفر کو ملتوی کرنا ان کے لیے مشکل تھا اس لیے مجبوراً ان کو بھی خدا حافظ کہہ کر نکل آئے۔

برطانیہ میں یہ پہلا دن تھا جب ہم خالصتاً تفریح کے لیے رکے۔فہیم صاحب نے پہلے ایک شاندار ریسٹورینٹ میں کھانا کھلوایا پھر ادھر ادھر شہر میں گھومتے رہے۔رات کو ان کے گھر گئے۔ان کا گھر ویملڈن کے نزدیک تھا۔گھر کافی اچھا اور کشادہ تھا۔ان کی خوشحالی دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ ہمارے ہندستانی بھائی بھی یہاں اچھی اور معیاری زندگی گزار رہے ہیں۔دو دنوں تک انھوں نے نہ صرف خوب ضیافت کی بلکہ لندن کی سیر بھی کرائی۔جو کچھ بھی لندن کو دیکھ سکا یہ سب فہیم بھائی کی وجہ سے ہی ہوا۔اس طرح 13 جولائی 2018 کو اس دس روزہ ادبی قافلہ کا اختتام ہوا۔مجھے خوشی ہے کہ یہ صرف ادبی سرگرمیوں کا سفر رہا۔اس سفر کو میں تقی عابدی صاحب کے نام معنون کرتا ہوں۔

○○○

ہرات شہر اولیاء

انسٹی ٹیوٹ آف انڈو پرشین اسٹڈیز کے صدر پروفیسر سید اختر حسین ، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی ، دہلی نے تین ماہ قبل افغانستان میں ایک کانفرنس کے انعقاد کی بات کی اور مجھے دعوت دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ آپ کو ضرور شریک ہونا ہے۔ افغانستان کا نام آتے ہی دل میں ایک خوف کا احساس پیدا ہوا لیکن ساتھ ہی افغانستان دیکھنے کا دیرینہ شوق بھی بیدار ہوا لیکن شوق پر خوف بھاری تھا۔ اسی کشمکش میں برجستہ میں نے اختر صاحب سے کہا کہ جناب افغانستان کے علاوہ اور کوئی ملک آپ کو نظر نہیں آیا؟ حسب عادت اختر صاحب زور سے ہنسے اور کہا کہ دنیا تو گھوم چکے ہیں اس ملک کو بھی دیکھ لیں جہاں عوامی رابطے کی سخت ضرورت ہے۔ میں اپنے خوف کو چھپا نہیں سکا اور میں نے جواباً کہا بات تو درست ہے لیکن اس کے لیے ابھی زندگی پڑی ہے۔ کبھی اور سہی لیکن خدا کے لیے آپ بھی اس ارادے سے باز آئیں (اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ انھوں نے ایک بار پروگرام بنا لیا تو بنا لیا اب ملتوی یا رد کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔) پروفیسر اختر صاحب نے اپنی دلچسپ گفتگو جاری رکھی۔ ان کی خصوصیت ہے کہ وہ مخاطب کو کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لیتے ہیں سو نتیجہ یہی نکلا کہ مجھے بادل نخواستہ ان کے ہمراہی کے لیے حامی بھرنی ہی پڑی۔ اب میں نے سوچا صرف ایک ہی راستہ ہے کانفرنس کے موضوع کو بہانا بنایا جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کی تنظیم انسٹی ٹیوٹ آف انڈو پرشین اسٹڈیز پورے ملک میں فارسی زبان کی ترویج

کے لیے کام کرتی ہے لہذا موضوع بھی فارسی کا ہی ہوگا اس لیے آسانی سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔لیکن جب انھوں نے موضوع بتایا تو میرا خوف اشتیاق میں بدل گیا کیونکہ کانفرنس کا موضوع ہی ایسا منتخب کیا تھا کہ اردو- فارسی کے احباب نے اس سمت میں کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔انھوں نے بتایا کہ افغانستان اور ہندستان کے درمیان ربط واشتراک کی جو تاریخ ہے وہ کئی جہتوں سے نا قابل فراموش ہے۔تہذیبی اور ثقافتی حوالے اپنی جگہ ہیں اور موجودہ حالات میں سیاسی اور تجارتی روابط بھی اپنی جگہ لیکن ایک ایسا حوالہ بھی ہے جس کے لیے اب تک علمی اور ادبی اعتبار سے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی ہے۔میں اختر صاحب کی ساحرانہ گفتگو سنتا رہا اور مجھے اعتماد تھا کہ میرے پاس ان کی جادو بیانی کی کاٹ موجود ہے۔لیکن جب انھوں نے ہرات اور اجمیر کے مابین روحانی رشتے کی بات کرتے ہوئے بتایا کہ اس کانفرنس کا موضوع ''سلسلۂ چشتیہ کی صوفیانہ روایت کا تسلسل ہرات سے اجمیر تک'' ہے اور یہ ادبی قافلہ بزرگوں کی آرامگاہ ہرات میں ان مقدس بارگاہوں کی زیارت بھی کرے گا اور اس قافلے کا سب سے اہم پڑاؤ چشت شریف ہوگا۔ یہ وہی چشت شریف ہے جس کا تعلق خواجہ اجمیری سے ہے۔ چشتیہ سلسلے کا آغاز یہیں کے صوفی بزرگ ابو اسحاق شامی سے ہوا ہے۔خواجہ اجمیری کا روحانی تعلق اسی جگہ سے ہے۔ یہ ایسی باتیں تھیں کہ تمام خطرات اور خدشات کو بالائے طاق رکھ کر میں نے بخوشی شرکت کے لیے حامی بھر لی۔اس کے بعد پروفیسر اختر حسین فاتحانہ مسکراہٹ لیے میرے کمرے سے روانہ ہوگئے۔ میں دیر تک سوچتا رہا کہ صدیوں کے اس روحانی رشتے پر باتیں تو ہوتی ہیں لیکن تصوف کے عنوان پر ہرات میں شاید یہ پہلی کانفرنس ہوگی۔ میری عقیدت اور محبت جاگ اٹھی تھی افغانستان جانے کا اشتیاق اس لیے بڑھ گیا کہ شہر ہرات میں پیر ہرات حضرت خواجہ عبداللہ انصاری، مولانا جامی اور کئی بزرگوں کے دربار کی زیارت کا موقع ملے گا اور چشت شریف میں خواجہ قطب الدین مودود چشتی رحمۃ اللہ الیہ کی بارگاہ میں جانے کا شرف بھی حاصل ہوگا۔لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی جب گھر میں اس سفر کا ذکر کیا تو سختی سے منع کیا گیا کہ ہرگز نہ جائیں وہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں کیوں خود کو خطرے میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ کسی طرح گھر والوں کو سمجھانے میں کامیاب ہوا لیکن خویش و اقارب جس نے بھی اس سفر کے بارے میں سنا، مجھے سختی سے منع کرنے کی کوشش کی مگر کانفرنس کے موضوع نے میرے ارادے کو متزلزل نہیں ہونے دیا۔

ایک ماہ قبل باضابطہ دعوت نامہ ملا اور کانفرنس کی زبان فارسی، انگریزی اور اردو قرار پائی اس

لیے میں نے اپنا مقالہ اردو میں لکھا۔ زیادہ تر مندوبین نے فارسی میں مقالے لکھے اور کچھ مقالے انگریزی زبان میں بھی لکھے گئے تھے۔ 31 اگست 2019 کو روانہ ہونا تھا اور 4 ستمبر کو واپسی کی تاریخ متعین کی گئی۔ لیکن اختر صاحب اکیسویں صدی کے ابن بطوطہ ہیں ایک ماہ میں دو بار امریکہ کا سفر کیا۔ کانفرنس کی تاریخ سے محض تین دن قبل امریکہ سے دہلی لوٹے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو دن قبل ویزا کے لیے فارم جمع کیے گئے۔ ہم تقریباً دس لوگ ایک ساتھ افغانستان ایمبیسی پہنچے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ویزا آفیسر جناب فقیری صاحب جس حسن سلوک سے پیش آئے وہ غیر معمولی تھا۔ باہر کے ہال میں بیٹھنے کے بجائے اندر مخصوص کمرے میں عزت و احترام کے ساتھ ہم سب کو بیٹھایا گیا چائے اور کافی سے ضیافت ہوتی رہی۔ اسی درمیان ویزا آفیسر تمام تفصیلات معلوم کرتے رہے اور چند گھنٹوں میں ہم سبھوں کو ویزے مل گئے۔ یہ اختر صاحب کی جادو بیانی، کانفرنس کے موضوع کی جدت وندرت، کانفرنس کے جائے وقوع کی اہمیت نجانے کس کا اثر تھا؟ لیکن جو بھی وجہ رہی ہو اس حسن سلوک سے ہمارے دلوں میں افغانستان ایمبیسی کے عملے اور آفیسران کی عزت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے دوست سینئر ٹی وی جرنلسٹ ڈاکٹر مہتاب عالم جو نیوز 18 کی جانب اس قافلے میں شامل تھے انھیں بھوپال سے 30 اگست کی رات پہنچنا تھا۔ مسئلہ ان کے ویزے کا تھا کہ انھیں کیسے ویزا ملے گا اور سفر کیسے ممکن ہو پائے گا کیونکہ 31 کی دوپہر میں ایک بجے فلائٹ کی روانگی کا وقت تھا۔ لیکن اختر صاحب پُر امید تھے انھوں نے ویزا آفیسر سے بات کر رکھی تھی۔ لہٰذا دوسرے دن دس بجے وہ ایمبیسی پہنچے اور انھیں بھی گیارہ بجے تک ویزا مل گیا۔ میں ایمبیسی کے باہر اپنے بیٹے محمد شادن کے ساتھ کار میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کے آتے ہی ہم ائیر پورٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔ بیٹے نے صحیح راستے کا انتخاب کیا اس لیے ہم لوگ وقت پر ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ تمام احباب ہمارے منتظر تھے۔ ڈاکٹر ندیم اختر اور ڈاکٹر محمود عالم ہمیں دیکھتے ہی خوشی سے کھِل اٹھے کیونکہ انھیں اختر صاحب کے نہ پہنچ پانے کی پریشانیوں کا اندازہ تھا۔ بہر کیف ان دونوں احباب نے سب کا پاسپورٹ لیا اور جلد ہی چیک اِن کی کارروائی مکمل کی۔ اب ہم لوگوں نے راحت کی سانس لی اس کے بعد کسی نے چائے پی اور کسی نے ٹھنڈے مشروبات سے اپنی پریشانیوں کو دور کیا۔ اس طرح پروفیسر سید اختر حسین کی قیادت میں ۱۲

رکنی وفد نے سفر کا آغاز کیا اس وفد میں پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین جے این یو، پروفیسر علیم اشرف ڈی یو، پروفیسر مظفر عالم حیدرآباد، پروفیسر عارف ایوبی لکھنؤ، سید سلمان چشتی اجمیر شریف، ڈاکٹر محمود عالم حیدرآباد، ڈاکٹر ندیم اختر دہلی، محترمہ نسرین جہاں کلکتہ، محمد ابرارالحق جے این یو، ڈاکٹر مہتاب عالم بھوپال اور محمد فیروز عالم، این سی پی یو ایل شامل تھے۔

ایک گھنٹے کی تاخیر سے طیارے پر سوار ہونے کا اعلان کیا گیا۔ ہم سب ایک ساتھ کام ائیر پر سوار ہوئے۔ کابل میں فلائٹ تبدیل کرنی تھی یہاں تین گھنٹے کا وقفہ تھا۔ ہمارا ٹکٹ ہرات تک تھا لیکن ہم سے کہا گیا کہ آپ لوگوں کا اپنا سامان کابل میں لینا ہوگا اور دوبارہ ہرات کی فلائٹ کے لیے چیک اِن کرانا ہوگا۔ ایسا عموماً ہوتا نہیں ہے ہمیں براہ راست سامان ہرات میں ملنا چاہیے تھا۔ ہم نے سوچا ممکن ہے سکیورٹی کے پیش نظر ایسا کیا گیا ہو۔ اس لیے اس تشویش کے ساتھ ہم کابل کے لیے روانہ ہوئے۔ طیارے سے ہی افغانی ضیافت کا آغاز ہو گیا۔ طیارے کی کھڑکی سے پہلے لاہور اس کے بعد سندھ کے ریگستان کو دیکھتے رہے۔ اچانک سنگلاخ وادیوں کے اوپر سے ہمارا طیارہ محو پرواز ہوا۔ فضا اتنی صاف تھی کہ نیچے کے علاقے بہت حد تک صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ہم حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ ان پتھریلی وادیوں میں لوگ کیسے رہتے ہوں گے۔ ہر شخص اپنی حیرتوں کا اظہار کر رہا تھا اور اختر صاحب کی لائیو کمنٹری جاری تھی۔ عارف ایوبی صاحب کی خاموشی سے لوگ لطف لے رہے تھے کوئی کسی کو کابل پہنچنے کی دھمکی دے رہا تھا، کوئی خوش گپی میں مصروف تھا کہ اتنی دیر میں ہمارا طیارہ کابل ائیر پورٹ کے رن وے پر اترنے لگا۔ سب سے پہلے نیٹو اور امریکی جنگی جہازوں کا دیدار ہوا اس نے ہمارے خوف کو اور بھی بڑھا دیا۔ رن وے پر جب جہاز رکا تو سامنے فارسی زبان میں حامد کرزئی انٹرنیشنل ائیر پورٹ کا بورڈ نظر آیا۔ ہمارے قائد نے ہمیں بتایا کہ یہ دنیا کا واحد ائیر پورٹ ہے جو کسی زندہ شخصیت کے نام پر ہے۔ خیر طیارے کا دروازہ کھلا کابل کی ٹھنڈی ہواؤں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم دل میں خوف و ہراس لیے سیڑھیوں سے اترنے لگے۔ ڈاکٹر علیم اشرف چونکہ بار بار کابل آچکے ہیں اس لیے ذرا بے خوف نظر آئے اور سامنے والی بس میں سوار ہو گئے ادھر ڈاکٹر اختر حسین صاحب سے کسی افغانی آفیسر نے بڑی محبت وعقیدت سے سلام پیش کیا اور کہا کہ تمام مہمان بس میں سوار ہونے کے بجائے ایک طرف

آ جائیں۔ ہمیں ڈر بھی لگا کہ شاید ہم سے خصوصی طور پر تفتیش ہوگی۔ جب تمام مندوبین کو گنا گیا تو دو لوگ کم تھے۔ معلوم ہوا علیم صاحب اور ان کے ساتھ فیروز صاحب بس میں سوار ہیں۔ انھیں جلدی سے اتارا گیا۔ اب ہم استقبال کرنے والے میزبان کی جانب سے کسی خاص حکم کا انتظار کر رہے تھے کہ انھوں نے بتایا آپ ہمارے مہمان ہیں اور جناب ہمایوں محتاط اور سمیہ رامش صاحبہ کا حکم ہے کہ آپ لوگوں کو کوئی تکلیف نہ ہو پائے اس لیے آپ ہمارے ساتھ آئیں۔ ہم چل پڑے کسی نے سامان کے متعلق پوچھا تو انھوں نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا آپ لوگ فکر مند نہ ہوں۔ ہم کرتے بھی کیا؟ وہ بجائے ائیر پورٹ کے مین دروازے سے داخل ہونے کے ایک نامعلوم راستے سے باہر کی طرف ہمیں لے چلے۔ افغانی پولیس نے ہمیں سلام کیا تو خوف کچھ کم ہوا۔ اچانک ہم تنگ راستے سے ایک چھوٹے باغ میں داخل ہو گئے۔ راحت بخش ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ کابل ائیر پورٹ چاروں جانب سے پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ ائیر پورٹ کے جس کنارے پر ہم لے جائے گئے وہ وی وی آئی پی لانج تھا اور اسی کے سامنے یہ چھوٹا خوبصورت باغ تھا جس میں سلیقے سے میز اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہم سے کہا گیا کہ چاہیں تو یہاں تشریف رکھیں یا اندر مہمان خانے میں تشریف رکھیں۔ کابل کی اس سہانی شام اور خوبصورت فضا کو دیکھتے ہوئے سب نے بیک زبان باہر بیٹھنے کو ہی ترجیح دی۔ اس خوبصورت منظر کو دیکھ کر سب نے اپنے اپنے کیمرے سے ان مناظر کو قید کرنا شروع کر دیا۔ ہمارے دوست مہتاب عالم ہماری تصویریں بنا رہے تھے۔ پروفیسر عارف ایوبی جو عادتاً کم سخن ہیں انھوں نے چپکے سے ہماری کئی تصویریں بنائیں اور قریب آ کر محبت سے کہا کہ دیکھیے یہ آپ کی تصویریں ہیں، کیسی لگیں؟ پہلے تو میں ان کے محبت بھرے لہجے سے متاثر ہوا اور حیران بھی ہوا کہ تصویر لینے کا ہنر انھیں آتا ہے۔ ایوبی صاحب سے یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ نام ضرور سنا تھا مگر اس سفر میں ایک اچھے دوست سے ملاقات ہوئی۔ ایوبی صاحب اور مہتاب بھائی کی تصویروں کا ہم موازنہ کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں اس افغانی آفیسر نے ہمارا پاسپورٹ طلب کیا۔ ڈاکٹر محمود عالم اور ندیم اختر نے بڑھ کر سب کے پاسپورٹ کو جمع کیا اور ان کے حوالے کر دیا۔ وہ سب کا پاسپورٹ لے کر ائیر پورٹ کے اندر داخل ہوئے۔ کچھ ہی دیر میں سبھوں کے پاسپورٹ پر امیگریشن کی مہر لگا کر واپس آ گئے۔ ہماری

حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ ہماری عدم موجودگی میں ہمارا امیگریشن ہوگیا۔ اس کے بعد چائے، کافی، چاکلیٹ اور مختلف طرح کے افغانی بسکٹ سے ہماری ضیافت ہوئی۔ اب ہمارا خوف بالکل زائل ہو چکا تھا اور بے فکری سے کبھی چائے تو کبھی کافی کا لطف لے رہے تھے کہ اچانک ایک صاحب مہمان خانے میں داخل ہوئے اور بڑی عزت و احترام اور محبت سے قافلے کے ایک ایک فرد سے ملاقات کی۔ اختر صاحب نے بتایا کہ یہ محترم ہمایوں محتاط صاحب ہیں انھیں کے حکم سے ہم لوگوں کو وی وی آئی پی ضیافت مل رہی ہے۔ ہمایوں محتاط حکومت افغانستان میں ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں اور ان کی اہلیہ سمیہ رامش بھی اسمبلی کی ممبر ہیں جو اس کانفرنس کے انعقاد میں آئی آئی پی ایس سے اشتراک کر رہی ہیں۔ انھوں نے دہلی یونیورسٹی سے فارسی زبان و ادب میں ایم۔ اے کیا ہے۔ وہی بنیادی طور پر ہماری میزبان تھیں۔

لانج میں بیٹھے ہوئے ہم ہند و افغان تعلقات پر محو گفتگو تھے کہ معلوم ہوا کہ ہرات جانے والی فلائٹ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے لیٹ ہے۔ اسی درمیان جناب سید فاضل سنچارکی معاون وزیر اطلاعات و ثقافت، حکومت افغانستان تشریف لے آئے۔ کانفرنس میں شرکت کے لیے وہ اسی فلائٹ سے ہرات جا رہے تھے۔ ان سے فرداً فرداً سب کا تعارف ہوا۔ اجمیر اور ہرات کے روحانی رشتوں پر دلچسپ باتیں ہوئیں۔ سنچارکی صاحب اور ہمایوں محتاط کی بُردباری اور اخلاق سے ہم بہت متاثر ہوئے۔ اتنے میں کسی عملے نے بتایا کہ ہرات کے لیے طیارہ پرواز کو تیار ہے۔ تمام مسافر سوار ہو چکے تھے لیکن ہم خصوصی طور پر ہمایوں محتاط اور سنچارکی صاحبان کی معیت میں سوار ہوئے۔ طیارے کے مسافر ہمیں غور سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایک گھنٹے میں ہم ہرات ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ اس طیارے کے پرواز بھرتے ہی اعلان ہوا کہ تمام لائٹیں بند کر دی جائیں گی اور ایسا ہی ہوا طیارے کے اندر بالکل اندھیرا ہی رہا۔ اس کی وجہ معلوم کی تو بتایا گیا کہ احتیاط کے سبب ایسا ہے کیونکہ جن راستوں سے اس کو پرواز بھرنی ہے وہ فوجیوں اور طالبان کے علاقے ہیں۔ شاید رات کے آٹھ بج چکے تھے جب ہم ہرات پہنچے۔ نیچے اترتے ہی سمیہ رامش اور کئی میزبانوں نے ہمارا استقبال کیا۔ انھوں نے بہت محبت اور احترام سے سب کو خوش آمدید کہا۔ ان کے ساتھ ہی ہرات کی خوشگوار فضائیں جیسے ہمیں خوش آمدید کہہ رہی

ہوں، تیز اور خنک ہوائیں ہمیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ پُرسکون اور راحت بخش فضا سے ایسا لگا جیسے واقعی یہ بزرگوں کا شہر ہے اسی لیے ایک خاص طرح کی روحانی کیفیت کا ہمیں احساس ہوا۔ ہم ایک دوسرے سے سرگوشی میں یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ سمیہ رامش صاحبہ نے ہمیں چلنے کو کہا۔ اس کے بعد یہاں بھی وہی ہوا۔ ہم وی آئی پی گیٹ سے سیدھے ایک خوبصورت مہمان خانے میں داخل ہوئے۔ باہر سے یہ ایک چھوٹا سا ہال تھا لیکن اندر کی زیبائش و آرائش قابل دید تھی دیواروں پر وسط ایشیائی اور افغانی طرز کی نقاشی اور دیدہ زیب فارسی مصوری کے نمونے آویزاں تھے۔ سمیہ رامش نے ہماری ضیافت کا انتظام کر رکھا تھا۔ وہ بہت خوش دیکھائی دے رہی تھیں کیونکہ ہمارے علاوہ افغانستان سے شرکت کے لیے اور بھی کئی ادیب و شاعر اسی فلائٹ سے پہنچ چکے تھے۔ لیکن ان کی خوشی کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ ان کے استاد ڈاکٹر سید اختر حسین اور ڈاکٹر علیم اشرف کا اپنے شہر میں وہ استقبال کر رہی تھیں۔

ہرات کی روحانی فضا میں ہم اس مہمان خانے سے متصل پارکینگ کی طرف روانہ ہوئے۔ سامنے کئی بلیٹ پروف گاڑیاں موجود تھیں۔ ہم پہلی بار لینڈ کروزر کی بیلٹ پروف گاڑی میں سوار ہوئے۔ آگے پیچھے مخصوص سکیورٹی کی کئی گاڑیاں تھیں اور درمیان میں ہماری پانچ گاڑیاں فراٹے بھرتی ہرات کے خاموش شہر میں شور مچا رہی تھیں۔ انڈین قونصلیٹ تک تقریباً دس کیلومیٹر کا یہ سفر عجیب طرح کا تجربہ تھا۔ سوچا تھا افغانستان کے شہروں کو کئی طرح کی جنگوں کا سامنا ہے تو شاید شام ہوتے ہی دکانیں بند ہو جاتی ہوں گی اور شہر خاموش ہو جاتا ہوگا لیکن جس شاہراہ سے ہم گزر رہے تھے اس کے دونوں کنارے پر رونق تھے۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں، لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ گاڑیوں کے نام پر اکثر موٹر سائیکل یا آٹو سڑکوں پر چل رہے تھے۔ سڑک بہت عمدہ تھی اس کی عمدگی ہمارے لیے باعث استعجاب بھی تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہاں کی سڑکیں بہت اچھی ہیں۔ رات کی تاریکی میں ''قہرمان ملی'' پر چلتے ہوئے کسی خوف کا احساس نہیں ہوا شاید اپنے میزبانوں کے اخلاق وجہ تھی یا سکیورٹی کے انتظامات۔ ہمارے برابر مہتاب عالم بیٹھے ہوئے تھے ایک جرنلسٹ کی طرح ان کی آنکھیں مناظر کو دیکھ رہی تھیں تو ان کا دماغ بھی اسی طرح چل رہا تھا وہ مستقل سوال کیے جا رہے تھے اور میں باہر کے مناظر دیکھنے میں محو تھا اسی لیے ان کے سوالوں کو ٹالنے کی کوشش کر

رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم انڈین قونصلیٹ کے سامنے پہنچ گئے۔ پانچ آہنی دروازوں سے گزرنے کے بعد گاڑیاں قونصلیٹ کے صدر دروازے پر رکیں۔ جناب کمار گورو قونصلیٹ جنرل، ہرات اپنے آفیسران کے ساتھ استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ جس تپاک سے انھوں نے اس وفد کا استقبال کیا وہ بڑی بات تھی۔ رات کے تقریباً دس بجنے والے تھے۔ انڈین قونصلیٹ میں ہمارے قیام کا انتظام تھا۔ انھیں اندازہ تھا کہ ہم نو بجے تک پہنچ جائیں گے اس لیے کھانا وقت پر تیار ہو چکا تھا۔ ہمارے انتظار میں ان آفیسران نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس لیے ہم سب ڈائننگ ہال کی طرف روانہ ہوئے۔ کھانے کی میز پر انڈین قونصلیٹ جناب کمار گورو ادبی قافلہ کا شکریہ ادا کرنے لگے کہ آپ نے ہمیں یہ اعزاز بخشا کہ ہم آپ کی میزبانی کر رہے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ آج تک کوئی بھی اتنا بڑا انڈین ڈیلیگیٹ نہیں آیا۔ جب اس کی وجہ پوچھی گئی تو انھوں نے کئی وجوہات کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ دراصل ہمارے پاس چند ہی بلیٹ پروف گاڑیاں ہیں اس لیے بیک وقت چھ سے زائد افراد کسی بھی ڈیلیگیٹ میں نہیں آتے۔ اس ادبی قافلے کے لیے کیونکہ میڈیم سمیہ رامش نے بھی کچھ گاڑیوں کا انتظام کیا تھا اسی لیے یہ ممکن ہوسکا۔ کمار گورو ہماری موجودگی سے بہت خوش دیکھائی دے رہے تھے اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ وہ جے این یو کے طالب علم رہ چکے تھے اور پروفیسر سید اختر حسین ان کے استاد تھے۔ ہمارے قافلے میں شامل جناب ندیم اختر ان کے کلاس ساتھی رہ چکے تھے۔ ان دونوں کی موجودگی ان کی خوشی کی وجہ تھی لیکن اس سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہرات میں ادبی کانفرنس کے لیے ہندستان سے اتنے دانشور یہاں تشریف لائے ہیں۔ ڈائنگ ٹیبل پر کھانے سے زیادہ ہم کمار گورو کی گفتگو اور افغانستان کے حالات سننے میں محو تھے کہ قونصلیٹ کے ایک آفیسر نے آکر اطلاع دی کہ تمام مہمانوں کے سامان کمروں میں پہنچا دئے گئے ہیں۔ ہم سب تھک بھی چکے تھے اس لیے اپنے اپنے کمروں کی چابیاں لیں اور کمرے کی جانب روانہ ہوئے۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں ایک ہدایت دی گئی کہ اپنے کمروں کی کھڑیاں اور دروازے نہ کھولیں کیونکہ کچھ خطرات ہیں۔ اس بات نے ہماری سراسیمگی بڑھا دی۔ ہمیں بتایا گیا کہ ابھی حال ہی میں ہرات قونصلیٹ پر حملہ ہوا تھا اور ایسے کئی حملوں کے منصوبوں کا وقت سے پہلے انکشاف ہوگیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی ہدایت دی کہ

بغیر سکیورٹی کے آپ لوگوں کو باہر نہیں نکلنا ہے اور نہ شہر جانا ہے۔ہم تو بڑے شوق سے آئے تھے کہ برصغیر کے تاریخی شہر ہرات کی سیر کریں گے بزرگوں کی دربار میں حاضری ہوگی۔لیکن اس پابندی نے ہمیں ذرا مضمحل کر دیا۔کمرے میں داخل ہوئے تو اچھا لگا کشادہ کمرہ اور ضرورت کی تمام اشیا وہاں موجود تھیں۔شہر کی جانب کھڑکی کھلتی تھی ،لیکن کھڑکی پر بلیٹ پروف دروازے لگے ہوئے تھے۔جب کسی چیز کے لیے منع کیا جاتا ہے تو یہ انسانی فطرت ہے کہ اسے دیکھنے کا اشتیاق بڑھ جاتا ہے سو میں نے حسب ہدایت دروازے کو بند کیا۔تمام لائٹس کو بند کر کے کھڑکی کے ذرا سے حصے کو کھول کر دیکھا۔ ہرات شہر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ایک حسین نظارہ تھا سامنے ہی مسجدوں کے بلند مینارے نظر آرہے تھے۔خاموش رات کے پُر کیف مناظر سے دل مسرور ہوا لیکن جلد ہی کھڑکی کے پٹ کو بند کر کے سو گیا۔

دراصل انڈین قونصلیٹ جو 'باغ ملی' کے قریب ہے یہ عمارت کسی زمانے میں فائیو اسٹار ہوٹل ہوا کرتا تھا لیکن اسے امریکیوں نے اپنا قونصلیٹ بنا لیا۔ان کے خالی کرنے کے بعد ہندستانی حکومت نے اسے ہرات میونسپل کارپوریشن سے کرایے پر لے لیا۔اس کا جائے وقوع بہت ہی دلکش ہے ایک جانب پہاڑ ہے اور دوسری جانب فراز میں شہر واقع ہے۔اس عمارت میں کافی کمرے موجود ہیں اسی لیے ہندستانی حکومت کے جو بھی مہمان ہوتے ہیں وہ یہیں قیام کرتے ہیں۔شہر کے اہم شاہراہ پر واقع یہ عمارت ضرور پُر رونق ہے مگر ہمارے لیے کئی طرح کی پابندیاں نظر بندی سے کم نہیں تھی۔سڑک سے عمارت تک آنے کے لیے پانچ آہنی دروازوں اور سخت سکیورٹی سے گزرنا پڑتا تھا۔اندر داخل ہوتے ہی ایک نئی دنیا تھی جو افغانستان کے شہر ہرات سے بالکل الگ تھی۔یہاں آفیسر سے نیچے درجے تک تقریباً ستر عملے ہیں،ان کی بھی یہی حالت ہے کہ وہ اس چہار دیواری سے بغیر کسی ضرورت کے باہر نہیں جاتے۔اسی لیے اس کیمپس میں دل بہلانے کے لیے اسپورٹس وغیرہ کی سہولت موجود ہے تاکہ یہاں مقیم افراد کی دلبستگی ہو سکے۔

افغانستان دنیا کے نقشے پر ایک ایسا ملک ہے جسے موجودہ تناظر میں صرف جنگ وجدال کے لیے جانا جاتا ہے لیکن ہمارے تجسس کا سبب اس ملک کی تہذیبی اور ثقافتی وراثتیں تھیں۔کیونکہ افغانستان کا شہر 'ہرات' کسی زمانے میں اپنی تمدنی اور معاشرتی زندگی کے اعتبار سے دنیا کو اپنی

جانب متوجہ بھی کرتا تھا اور اثر انداز بھی ہوتا تھا۔ افغانستان کے بارے میں دائرۃ المعارف (ویکی پیڈیا اردو) میں 'سی آئی اے ورلڈ فیکٹ بک' کے حوالے سے یہ معلومات درج ہیں:

''افغانستان کی آبادی جولائی 2011ء کے مطابق اعداد و شمار کے مطابق دو کروڑ 89 لاکھ 35 ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ جس میں 42 فیصد پشتون ہیں۔ جب کہ دوسری قوموں میں ایرانی نسل سے تعلق رکھنے والے تاجک 27 فیصد، منگول نسل کے ہزارہ 9 فیصد، ازبک جو نسل کے اعتبار سے ترک ہیں 9 فیصد جبکہ آرمک چار فی صد، ترکمان تین فی صد، بلوچ دو فی صد اور باقی ماندہ چار فی صد دیگر مختلف اقوام پر مشتمل ہے۔ افغانستان کی بڑی آبادی پشتونوں پر مشتمل ہے، جو مشرقی جنوبی علاقوں میں آباد ہیں۔''

''ہرات ایک قدیم شہر ہے جس میں کئی تاریخی عمارات آج بھی قائم ہیں حالانکہ گذشتہ چند دہائیوں کی خانہ جنگی اور بیرونی جارحیت کے باعث شہر کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ ہرات ہندوستان، چین، مشرق وسطی اور یورپ کے درمیان قدیم و تاریخی تجارتی راستے پر واقع ہے۔ ہرات سے ایران، ترکمانستان، مزار شریف اور قندھار جانے والے راستے آج بھی محل وقوع کے اعتبار سے اہم شمار ہوتے ہیں۔''

آج بھی ہرات اپنی زندہ دلی اور صوفیانہ اقدار کے سبب دنیا میں جانا جاتا ہے۔ ہرات خشک میوے کے علاوہ انگور کی کھیتی کے لیے بہت مشہور ہے۔ فارسی کی بہت ہی مشہور کتاب ''چہار مقالہ'' میں یہاں انگور کے ایک سو پچاس سے زائد اقسام کا ذکر ملتا ہے۔ جب ہم نے یہاں کے لوگوں سے معلوم کیا کہ کیا اب بھی اتنے اقسام کے انگور دستیاب ہیں تو ہمیں بتایا گیا کہ اتنے تو نہیں لیکن اب صرف 56 قسموں کے انگور کی کاشت ہوتی ہے۔ اتفاق سے یہ انگور کے موسم کے آغاز تھا اس لیے ہم کئی اقسام کے انگور کی لذتوں سے آشنا ہوئے۔ حالانکہ ابھی تمام اقسام کے انگور بازار میں نہیں آئے تھے لیکن ایک خاص قسم کا انگور جس کا نام ''انگور حسینی'' ہے اس کے چھلکے بہت ہی باریک اور نازک تھے، منہ میں ڈالتے ہی گھل جاتے تھے، سائز میں بھی عام انگور سے بڑے، بہت ہی

لذیذ اورخوش رنگ تھے یہ بہت دنوں تک تر وتازہ نہیں رہتے۔ ہمارے لیے اس انگور کی لذت ایک نیا تجربہ اور نیا ذائقہ تھا۔اس کے علاوہ تربوز،خربوز اورانجیر کا بھی یہ موسم تھا۔ یہاں کے پھل بہت ہی میٹھے اور لذت میں جداگانہ تھے۔ہمیں اچھا لگا کہ اس موسم میں ہم یہاں موجود تھے اور ان پھلوں کی لذت سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ ہرات کی کالی کشمش اور منقیٰ بہت مشہور ہے۔خشک میووں میں کاغذی بادام، پستہ، انجیر، چلغوزہ، ہیزل نٹ، کئی طرح کے خشک میوے ہرات، کی خاص کاشت ہیں۔ ہرات کا زعفران اور ہینگ بھی پوری دنیا میں مشہور ہے۔

یکم ستمبر ہرات میں یہ ہماری پہلی صبح تھی۔قونصلیٹ کے احاطے میں چہل قدمی کرتے ہوئے محسوس ہوا کہ فضا بہت ہی صاف ستھری ہے کوئی آلودگی نہیں۔ ہواؤں کے تیز جھونکے جیسے ہمارا استقبال کررہے ہوں اور سفر کی تکان دور کررہے ہوں۔معلوم ہوا کہ یہاں ہمیشہ اسی طرح تیز ہوائیں چلتی ہیں یہ ہمارے لیے نیا انکشاف تھا۔نئے شہر، نئے ملک میں یوں بھی ہر چیز کو اشتیاق اور تجسس کی نگاہ سے دیکھنے کی عادت ہوتی ہے۔اس لیے جب ہم ناشتے کے بعد حسب دستور اسی احتیاط اور سخت سکیورٹی کے درمیان 'ہوٹل ارگ' کے لیے روانہ ہوئے۔ ہوٹل اور قیام گاہ کی دوری محض ایک کیلومیٹر تھی مگر سکیورٹی نے ہمیں آزادنہ جانے کی اجازت نہیں دی۔ ہوٹل ارگ کے سامنے ہی ہرات یونیورسٹی تھی۔لڑکے اور لڑکیاں بڑی تعداد میں یونیورسٹی کے اردگرد نظر آئے تو مجھے حیرت بھی ہوئی کہ اسی افغانستان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں عورتوں کو آزادی نہیں اور وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے گھر سے نہیں نکلتیں لیکن یہاں مشاہدہ اس کے برعکس تھا۔میں یونیورسٹی کے طلبہ وطالبات کو اس نظر سے دیکھ رہا تھا کہ کیا لڑکے اور لڑکیاں الگ الگ گروپ میں ہیں یا مخلوط طور پر یونیورسٹی میں موجود ہیں۔ہمیں ہندستان کی جامعات سے یہاں کے طلبہ وطالبات صرف اس طرح مختلف نظر آئیں کہ خواتین نے نقاب پہن رکھا تھا۔ جب ہوٹل ارگ پہنچے تو یہاں بھی خواتین کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ یہ ہمارے ان تصورات کو باطل کررہی تھیں جو میڈیا کے ذریعے پہلے سے ہمارے ذہنوں میں موجود تھے کہ افغانستان میں عورتوں پر بے جا پابندیاں ہیں۔اس کانفرنس میں شہر ہرات کی کئی طالبات موجود تھیں ان میں سے کئی خواتین نے اپنے مقالے بھی پیش کیے۔خوشی تو اس بات پر ہوئی کہ اکثر نئی نسل کی خواتین کے مقالے تصوف کی

روایت پر تھے جو پُرامن بقائے باہمی کے تصورات پر مبنی تھے جو دیرینہ روایت کے فروغ کی وکالت کررہے تھے۔ کئی مقالوں میں ہند-افغان روابط کی نشاندہی بھی کی گئی۔

دراصل ہندستان اور افغانستان کا رشتہ بہت قدیم ہے۔ یہ دو ممالک اگرچہ فاصلے کے اعتبار سے بہت نزدیک نہیں اور کوئی سرحد بھی آپس میں نہیں ملتے لیکن کئی لحاظ سے ان کے مابین جو رشتہ ہے وہ یقیناً تاقیامت برقرار رکھے گا۔ ان رشتوں کو کوئی سرحد پابند بھی نہیں کرسکتی۔ ان رشتوں میں سب سے اہم رشتہ سلسلۂ چشتیہ کا ہے جس کا آغاز اسی صوبے کے شہر ''چشت'' سے ہوتا ہے جس کی ایک اہم کڑی اجمیر شریف ہے۔ سلسلۂ چشتیہ ہرات سے اجمیر تک ایک ایسا روحانی پُل ہے جو ہر حال میں قائم و دائم رہے گا۔ ان دو ملکوں کے درمیان یہ ایسا رشتہ ہے جس کا تعلق روحانیت اور تصوف سے ہے۔ ہرات افغانستان کا ایسا صوبہ ہے جس کو 'مدینۃ الاولیا' بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں بزرگانِ دین کی متعدد آرمگاہیں ہیں۔ افغانستان میں مشہور ''پیر ہرات''، یعنی خواجہ عبداللہ انصاری کا سلسلۂ نسب نویں پشت میں مشہور صحابی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ آپ نے اس پورے خطے کو دینی، اسلامی اور روحانی تعلیمات سے روشن کیا۔ مولانا جامی جن کے متصوفانہ فارسی اشعار ساری دنیا میں پڑھے جاتے ہیں بالخصوص اردو اور فارسی جاننے والے ان کو تصوف کے حوالے سے ہمیشہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں بیان کرتے ہیں اور خانقاہوں میں ان کے کلام پڑھے جاتے ہیں۔ ان کا مزار بھی اسی شہر ہرات میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ اہلِ سلوک کی بڑی تعداد ہے جو یہاں مدفون ہیں۔ اولیائے کرام کے فیوض و برکات کے سبب ہی یہ شہر زمانے کے نشیب و فراز کے بعد بھی آباد اور مرفع حال ہے۔ اس شہر کا یوں تو دنیا کا کئی ممالک سے براہ راست تجارتی اور ثقافتی روابط رہے ہیں لیکن ہندستان کا سب سے مضبوط تعلق خواجۂ اجمیری کے سبب ہے۔ حالیہ دنوں میں ایک اور رشتہ استوار ہوا ہے جسے سلمٰی ڈیم یعنی ''بندِ دوستی ہند و افغان'' کے نام سے جانتے ہیں۔ صوبہ ہرات کا ایک مشہورِ زمانہ قریہ چشت بھی ہے۔ یہ وہی قریہ ہے جس کی نسبت سے چشتیہ سلسلے کا آغاز ہوا۔ خواجہ معین الدین چشتی نے یہیں کے بزرگ ابواسحاق شامی سے کسبِ فیض کیا اور پورے برصغیر میں چشتی سلسلے کا آغاز کیا۔ تصوف کے اس سلسلے نے دنیا میں اور بالخصوص برصغیر میں امن و محبت کے پیغام کو عام کیا۔ شہر ہرات کی اسی اہمیت اور صوفی ازم

کی ضرورت وافادیت کے پیش نظرانسٹی ٹیوٹ آف انڈو پرشین اسٹڈیز نے شہر ہرات میں دوروزہ بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا۔اس تنظیم نے ''سلسلۂ چشتیہ کا تسلسل ہرات سے اجمیر تک: ایک روحانی پُل'' کے عنوان سے بتاریخ 1-2 ستمبر 2018 ہندافغان فاؤنڈیشن اورنوا ندیشان کلچرل، سوشل آرگنائزیشن کے اشتراک سے منعقد ہوا۔اس کانفرنس میں ہندستان سے ۱۲ رکنی وفد کے علاوہ افغانستان کے مختلف شہروں سے ادبا اور دانشوروں نے شرکت کی۔

سمینار کا آغاز یکم ستمبر 2018 کی صبح قرآن پاک کی تلاوت سے ہوا۔اس کے بعد ہندستان اور افغانستان کے قومی ترانے گائے گئے۔دونوں ملکوں کے مابین خوش آئند تعلقات پر نیک خواہشات کے ساتھ اس افتتاحی سیشن میں خیر مقدمی کلمات محترمہ سمیہ رامش نے پیش کیا۔ گورنر آف ہرات جناب محمد آصف رحیمی نے افتتاحی خطاب فرمایا۔کلیدی خطبہ سید سلمان چشتی نے پیش کیا۔مہمان خصوصی کی حیثیت سے انڈین قونصلیٹ جنرل ہرات جناب کمار گور شریک ہوئے۔سید فاضل سنچارکی معاون وزیر اطلاعات وثقافت، کابل، افغانستان مہمان اعزازی کے طور پر شریک ہوئے اور جناب ہمایوں محتاط ڈائریکٹر جنرل سناش نامہ ملی، افغانستان نے اپنا بھرپور تعاون پیش کیا۔اس کانفرنس میں نئی نسل کی بڑی تعداد نے حصہ لیا اور کانفرنس میں پڑھے گئے مقالوں میں ہند- افغان تعلقات بالخصوص تصوف اور روحانیت کے سلسلے پر باتیں ہوئیں لیکن زیادہ تر مقالوں میں اس بات پر زور دیا گیا کہ نئی نسل کو ماضی کی روایات سے واقف کرایا جائے کیونکہ صارفیت کے اس دور میں تصوف ہی امن وامان کا واحد راستہ ہے۔اس کانفرنس سے جو سب سے اہم پیغام گیا وہ یہی تھا کہ تصوف عالمی امن وامان کے لیے ضروری ہے۔اس کے علاوہ اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا گیا کہ ہندستان اور افغانستان ایک اچھے دوست ممالک ہیں۔ ہندستان افغانستان کی از سرنو باز آبادکاری میں بہت معاون بھی ہے جس کے لیے افغان قوم شکر گزار ہے۔لیکن اس رشتے کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہرات اور اجمیر کے درمیان جو سلسلۂ چشتیہ کے ذریعے ایک روحانی پل بنا ہے اس پر محبت اور امن کے قافلوں کی آمدورفت میں اضافہ ہونا چاہیے۔

سیمنار کے دوسرے دن ظہرانے کے بعد شہر ہرات کی تاریخی عمارات اور بزرگوں کی

آرامگاہوں کی زیارت کا اہتمام کیا گیا۔قونصلیٹ کی سکیورٹی اور سمیہ رامش صاحبہ اوران کے ساتھ کئی میز بانوں پر مشتمل یہ قافلہ گوہرشاد بیگم اور علی شیر نوائی کے مقبروں کو دیکھنے کے لیے روانہ ہوا۔ یہ ہرات کے قدیمی مدرسہ کے احاطے سے متصل ہے جس کے خستہ حال مینارے ماضی کی داستان سنا رہے تھے۔امیر علی شیر نوائی کا اس عہد کے دانشوروں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ ایک مقبول ومعروف شاعر تھے۔ان کی شاعری فارسی اورازبک زبان میں ہے اسی لیے انھیں ’ذواللسان‘ شاعر کہا گیا۔آج بھی افغانستان اورازبکستان میں انھیں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم لوگ گوہرشاد بیگم کے مقبرے کی طرف گئے۔گوہرشاد کے بارے میں ویکی پیڈیا میں جو تفصیلات درج ہیں وہ قارئین کی معلومات کے لیے یہاں درج کررہا ہوں:

”گوہرشاد سلطنت تیموریہ کے دوسرے فرمانروا شاہ رخ تیموری کی اہلیہ تھیں۔ وہ تیموری دور کی ایک بااثر اوراہم شخصیت غیاث الدین ترخان کی صاحبزادی تھیں۔کہا جاتا ہے کہ ان کے خاندان کو ترخان کا خطاب بذات خود چنگیز خان نے دیا تھا۔ ہرات میں تیموری دربار میں انتظامی فرائض انجام دینے والے دو بھائیوں کے ساتھ مل کر گوہرشاد نے تیموری سلطنت کے ابتدائی دنوں میں اہم کردارادا کیا۔1405ء میں ان کی خواہش پر ہی تیموری سلطنت کا دارالحکومت سمرقند سے ہرات لایا گیا۔ کیونکہ گوہرشاد کا تعلق فارس سے تھا اس لیے ان کے عہد میں فارسی زبان اور فارسی ثقافت سلطنت تیموریہ کا ایک اہم جز بن گئی۔ملکہ اورشاہ رخ نے فن،تعمیرات، فلسفے اورشاعری کے لیے عظیم خدمات انجام دیں جس کے نتیجے میں معروف فارسی شاعر جامی سمیت اس وقت کے بہترین فنکار، ماہرین تعمیرات،فلسفی اورشعرانے تیموری دربار کا رخ کیا۔ ہرات میں آج بھی تیموری طرز تعمیر کی چند نشانیاں موجود ہیں۔1447ء میں شوہر کے انتقال کے بعد گوہرشاد نے اپنے من پسند پوتے (الغ بیگ) کو تخت پر بٹھایا اوراگلے دس سالوں تک وہ دریائے دجلہ سے چین کی سرحدوں تک پھیلی اس سلطنت کی حقیقی حکمران رہی۔19 جولائی 1457ء کو 80 سال کی عمر میں انہیں سلطان ابوسعید

> کے حکم پر قتل کر دیا گیا۔ گوہر شاد کا مزار ہرات میں اس کے قائم کردہ مدرسے کے احاطے میں واقع ہے جس کے مینار آج بھی سلامت ہیں۔ گوہر شاد نے 1418ء میں مشہد، خراسان میں ایک مسجد تعمیر کروائی تھی۔ فارسی و تیموری طرز تعمیر کا یہ عظیم شاہکار آج بھی مشہد میں ملکہ گوہر شاد کی یاد دلاتا ہے۔ خراسان میں ان کی بہن گوہر تاج کا مزار بھی واقع ہے۔''

(بحوالہ: آزاد دائرۃ المعارف، ویکی پیڈیا)

ہرات میں اختیارالدین کا قلعہ وسط ایشیا کا ایک مشترکہ تہذیبی ورثہ ہے۔ اس قلعے کو کئی بادشاہوں نے اپنی حکمرانی کے لیے استعمال کیا۔ سکندر اعظم نے بھی اس قلعے کو اپنا مسکن بنایا تھا اس کی سن تعمیر ۳۳۰ قبل مسیح بتائی جاتی ہے۔ گوہر شاد بیگم نے بھی اس قلعے کی تعمیر میں خاص کردار ادا کیا تھا۔ یہ کئی بار مسمار ہوا اور بالآخر ۱۹۷۶ میں یونیسکو نے محفوظ ورثے کے طور پر از سر نو اس کی مرمت کی۔ بنیادی طور پر یہ مٹی سے تعمیر کیا ہوا قلعہ ہے۔ موجودہ حالت میں بھی یہ دور سے مٹی کا بنا ہوا قلعہ معلوم ہوتا ہے جو موجودہ صورت میں اینٹ اور مٹی ہی ہے۔ یہ وسیع و عریض علاقے میں واقع ہے۔ کم وقت میں پورے قلعے کو دیکھنا مشکل تھا اس لیے جلدی جلدی ہم لوگوں نے قلعے کے کچھ اندرونی اور بالائی حصے کو دیکھا۔

اس کے بعد ہم خواجہ عبداللہ انصاری جنہیں 'پیر ہرات' کہا جاتا ہے ان کے دربار میں حاضر ہوئے۔ ہماری آمد کی اطلاع وہاں کے منتظمین کو دے دی گئی تھی اس لیے ہمیں مخصوص طور پر زیارت کرائی گئی۔ سید سلمان چشتی جو 'چشتیہ فاؤنڈیشن، اجمیر' کے چیئرمین ہیں، ان کی موجودگی سے اس قافلے کو مزید اہمیت ملی وہ اجمیر شریف سے خصوصی طور پر چادر ساتھ لائے تھے جو یہاں کے بزرگوں کے مزارات پر پیش کرنی تھی۔ خواجہ عبداللہ انصاری کا مزار ایک وسیع و عریض احاطے میں ہے جس کے مینارے اور دیواریں اپنی قدامت اور دستبرد زمانہ کی شہادت دے رہی تھیں۔ تیموری عہد کی یہ عمارت آج بھی اپنی ماضی کی شان و شکوہ کی گواہ ہے۔ اس احاطے میں کئی بزرگان دین کی قبریں بھی ہیں۔ خواجہ عبد اللہ انصاری کا مزار جالیوں سے بند تھا۔ یہ دروازہ مخصوص تقریبات کے موقعے پر ہی کھلتا ہے لیکن سید سلمان چشتی صاحب کے تعارف اور اجمیر شریف کے

رشتے کی عظمت کو سن کر وہاں کے منتظمین نے ہمارے لیے اس دروازے کو کھلوایا اور ہم سب سلمان چشتی کے ساتھ چادر پیش کرنے کی سعادت سے فیض یاب ہوئے۔ خواجہ عبداللہ انصاری کے بارے میں آزاد دائرۃ المعارف، ویکی پیڈیا میں بہت مبسوط تعارف لکھا۔ میں اسی کو یہاں قارئین کی معلومات کے لیے درج کر رہا ہوں:

''شیخ ابو اسماعیل عبداللہ حیراوی انصاری یا پیر ہرات (پیدائش: 4 مئی 1006ء فات: 8 مارچ 1089ء) گیارہویں صدی میں ہرات (خراسان، موجودہ صوبہ ہرات افغانستان) کے رہنے والے فارسی زبان کے مشہور صوفی شاعر تھے۔ آپ پانچویں صدی ہجری/ گیارہویں صدی عیسوی میں ہرات کی ایک نادر شخصیت، مفسر قرآن، راوی، مناظر اور شیخ طریقت تھے جو عربی اور فارسی زبانوں میں اپنے فن تقریر اور شاعری کے باعث جانے جاتے تھے۔ آپ 04 مئی 1006ء 369ھ کو ہرات کے قدیم قلعہ کھنڈر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ابو منصور ایک دکان دار تھے جو جوانی میں کئی سال بلخ میں گزار چکے تھے۔ عبد اللہ، شیخ ابوالحسن خرقانی کے مرید تھے اور اپنے شیخ پر اعتماد اور ان کا بہت احترام کرتے تھے جیسا کہ انہوں نے بیان کیا: "عبداللہ ایک چھپا ہوا خزانہ تھا اور اس کی چابی ابوالحسن خرقانی کے ہاتھوں میں تھی"۔ آپ سنی فقہ حنبلی کے پیرو تھے۔ آپ کا عہد تیموری میں تعمیر ہونے والا مزار مشہور زیارت گاہ ہے۔ انہوں نے اسلامی تصوف اور فلسفہ پر فارسی اور عربی زبان میں بہت سی کتب لکھیں۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف "مناجات نامہ" ہے جو فارسی ادب کا شاہکار شمار کی جاتی ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی تصانیف کے علاوہ ان کے شاگردوں اور دوسرے لوگوں سے ان کے بہت سے اقوال روایت ہوئے جو تفسیر میبودی، " کشف الاسرار" میں شامل کیے گئے۔ یہ قرآن کریم کی قدیم ترین مکمل صوفی تفاسیر میں سے ہے اور کئی مرتبہ 10 جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ انہوں نے علم حدیث، تاریخ اور علم النسب پر مہارت حاصل کی۔ وہ امیر، قوی اور با اثر

لوگوں کی صحبت سے دور رہا کرتے تھے۔ان کی مجلس وعظ میں شمولیت کے لیے لوگ دور دراز سے آتے تھے۔جب بھی ان کے مریدین ومعتقدین ان کوکوئی تحفہ پیش کرتے وہ غریبوں اورضرورت مندوں کے حوالے کردیا جاتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی شخصیت متاثر کن تھی اورخوش لباس تھے۔ ہرات کے خواجہ عبد اللہ انصاری کا سلسلہ نسب نویں پشت میں مشہور صحابی حضرت ابوایوب انصاری سے جاملتا ہے۔خاندان کی تاریخ کی مثل میں بیان کیا گیا سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ابواسماعیل خواجہ عبداللہ انصاری ولد ابومنصور بلخی ولد جعفر ولد ابومعاذ ولد محمد ولد احمد ولد جعفر ولد ابومنصور تابعی ولد ابو ایوب انصاری۔اسلام کے خلفاء راشدین میں سے تیسرے خلیفہ عثمان بن عفان کے زمانہ میں ابومنصورتابعی نے خراسان کی فتح میں حصہ لیااوراس کے بعد ہرات میں رہائش اختیار کی،ان کے فرزند خواجہ عبد اللہ انصاری 1088ء 481ھ میں فوت ہوئے۔فقیہ ابن قیم جوزی نے اپنی تصنیف الوابل الصیب من الکلم الطیب میں انصاری کا حوالہ "شیخ الاسلام" کے گرانقدر خطاب سے دیا ہے۔''

(بحوالہ: آزاددائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا)

اس کے بعد یہ قافلہ جامع مسجد ہرات جسے مسجد جامی بھی کہا جاتا ہے کہ زیارت کے لیے روانہ ہوا۔ یہ مسجد شہر کی قلب میں واقع ہے اورعہد تیموری کی فن عمارت سازی کی بے مثل یادگار ہے۔اس کی تعمیر غوری بادشاہ غیاث الدین غوری نے 1200 عیسوی میں شروع کی، بعد کے مختلف ادوار میں مختلف بادشاہوں نے اس کی مرمت اورتوسیع میں حصہ لیااس طرح یہ تیموری،صفوی اور ازبک حکمرانوں کی ایک یادگار ہےاور ہرات میں یہ مسجد زائرین کے لیےایک اہم مقام ہے۔

شام ہونے کوتھی اور ہدایت کے مطابق ہمیں سورج کے غروب ہونے سے پہلے اپنے قیام گاہ واپس ہونا تھا۔ ہرات میں کئی اوراہم تاریخی اورقابل دید عمارتیں تھیں اس لیے آخر میں طے یہ پایا کہ دیگر مقامات کے بجائے صرف مولانا جامی کے مزار پر حاضری دی جائے۔مولانا جامی یہ وہی بزرگ ہیں جوفارسی زبان کے بڑے شاعر ہونے کے باوصف تصوف اورروحانیت کے لیے

جانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری سے اہل اردو بھی واقف ہیں اور ان کی شاعری کے تراجم بھی موجود ہیں۔ وکی پیڈیا کا یہ اقتباس ان کے تعارف کے لیے کافی ہے:

''خراسان کی ولایت جام کے ایک قصبہ خرجرو میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں باپ کے ساتھ ہرات اور سمرقند گئے جو اس زمانے میں اسلامی علوم اور فارسی ادب کا مرکز تھے۔ تعلیم کے بعد سلوک وعرفان کی طرف رجوع کیا اور سعد الدین محمد کاشغری اور خواجہ علی سمرقندی کے حلقۂ طریقت میں ان کا شمار خلفا میں ہونے لگا۔ 1472ء میں حج کیا۔ مختلف شہروں کی سیاحت کر کے ہرات واپس آئے اور وہیں انتقال کیا۔ سلطان ابوسعید گرگانی، سلطان حسین مرزا، میر علی شیر نوائی، اوزون حسن، آق قیونلو، سلطان یعقوب، سلطان محمد فاتح اور سلطان بایزید دوم مولانا جامی کی بڑی عزت کرتے تھے۔ گوشہ نشین اور درویش منش تھے۔ نظم ونثر کی تصانیف 49 ہیں۔ نظم میں سات مثنویاں ہفت اورنگ سلسلۃ الذہب، سلامان وابسال، تحفۃ الاحرار، صحبۃ الابرار، یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں، فرد نامۂ سکندری اور غزلوں کے تین مجموعے آپ کی یادگار ہیں۔ نثر میں گیارہ کتابیں تصنیف کیں۔''

(بحوالہ: اردو وکی پیڈیا)

دو روزہ سیمنار کے بعد انڈین قونصلیٹ جنرل ہرات جناب کمار گورو کی جانب سے چشت شریف کی زیارت اور سلمیٰ ڈیم کی سیر کا اہتمام کیا گیا جو ہندستان اور افغانستان کی دوستی کی علامت ہے۔ چشت شریف کی زیارت ہم سبھوں کے لیے بہت اہم تھا لیکن وہاں جانا بھی ایک مشکل مرحلہ تھا کیونکہ ہرات سے چشت کا بذریعہ روڈ سفر طے کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی اور نہ ہی اس پہاڑی سلسلے کے پُر پیچ راستوں کو ایک دن میں طے کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے کمار گورو صاحب نے خصوصی طور پر افغان حکومت سے ہیلی کاپٹر انتظام کرنے کو کہا۔ لہذا بڑی تگ ودو کے بعد دو ہیلی کاپٹر کا انتظام ہوا کیونکہ ہمارے اس قافلے کے ساتھ خود قونصلیٹ جنرل بھی شامل تھے اور سمیہ رامش صاحبہ بھی اس لیے قافلے میں شامل تھیں۔ زائرین کی کل تعداد ۲۴ ہوگئی لہٰذا دو ہیلی کاپٹر میں

ہم سوار ہوکر دس بجے روانہ ہوئے۔ان ہیلی کاپڑس پر مخصوص سیکورٹی کے افراد بھی تھے۔تقریباً ایک گھنٹے کے اس سفر میں اوپر سے ہرات شہر اور صوبے کی سنگلاخ وادیوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ہمارے ذہنوں میں تھا کہ روحانی اعتبار سے دنیا بھر میں چشت کا کا نام ہے تو چشت شہر بڑا شہر ہوگا لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ ایک چھوٹا قریہ ہے جہاں ہر طرح کی سہولیات بھی موجود نہیں ہے۔ اس قریہ کے زیادہ تر مکانات بھی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ بہت زیادہ آبادی بھی نہیں ہے۔ حالانکہ قدرتی مناظر کے لحاظ سے یہ مالا مال ہے۔قریہ چشت کے درمیان سے ہی دریائے ہری رود بہتی ہے جس کی وجہ سے یہاں کاشتکاری دیگر علاقوں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ چونکہ حکومت ہند نے اسی دریا کے حصے پر سلمٰی ڈیم بنایا ہے اس لیے آس پاس کے گاؤں والے اس سے خوشحال ہوگئے ہیں۔ یہاں دیگر فصلوں کے علاوہ زعفران کی کاشت زیادہ ہونے لگی ہے۔ ہم ہیلی کاپٹر سے اترے تو ہیلی پیڈ کے قریب ہی کئی گاڑیاں اور مقامی پولیس اور آفیسران ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ پہلے وہ ہمیں ایک مہمان خانے میں لے گئے جہاں چشت کے تازہ پھلوں اور خالص افغانی طرز سے ضیافت کی گئی۔اس کے بعد ہم خواجہ قطب الدین مودود چشتی کے مزار پر حاضری کے لیے روانہ ہوئے۔ یہاں سلسلۂ چشتیہ کے صوفیا ہماری آمد کی اطلاع سن کر پہلے سے دربار مودود چشتی میں ہمارے منتظر تھے۔ان کے استقبال کے والہانہ انداز نے ہمیں متاثر کیا اور ان کی سادگی، بردباری اور اجمیر شریف سے سید سلمان چشتی کی آمد کی خبر نے انھیں سراپا مشتاق بنا رکھا تھا۔سید سلمان چشتی کے ساتھ ہم روضہ مبارک پر حاضر ہوئے۔ یہاں موجود اس سلسلے کے صوفیا نے مخصوص طریقے سے سلام و فاتحہ خوانی کے بعد سید سلمان چشتی کو خرقہ پیش کیا، سید اختر صاحب کو عبا پیش کیا اور جناب کمار گورو کو کچھ تحائف پیش کیے اس کے ساتھ قافلے میں شامل تمام افراد کے لیے دعائیں کیں۔انھوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا کہ ہندستان سے اس طرح کا قافلہ ہماری زندگی میں پہلی دفعہ مودود چشتی کے بارگاہ میں حاضر ہوا ہے۔اجمیر سے چشت کے تعلق کو وہ سب بخوبی جانتے تھے ان کے دل میں بھی اجمیر کی زیارت کا شوق تھا۔لہذا آئی آئی پی ایس کی جانب سے انھیں بھی اجمیر آنے کی دعوت دی گئی۔اس دعوت سے وہ بہت خوش ہوئے اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ کاش چشت اور اجمیر کا یہ روحانی رشتہ اور مضبوط ہو۔دونوں جانب سے

لوگوں کی آمدورفت ہو۔ ہمارے قافلے کے سربراہ سید اختر حسین نے اس رشتے کی ابتدا کی تھی، انھوں نے اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہماری پہلی کوشش تھی اب ان شاء اللہ اس کا تسلسل ہوگا۔

خواجہ مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ یہ وہی بزرگ ہیں جن سے سلسلۂ چشتیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ خواجۂ اجمیر، معین الدین اسی قریہ کی نسبت سے چشتی کہلاتے ہیں۔ جس سلسلے کا شجرہ اس طرح ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علی مرتضی، خواجہ حسن بصری، خواجہ عبدالواحد بن زید، خواجہ فضیل ابن عیاض، خواجہ ابراھیم بن ادہم البلخی، خواجہ حذیفہ مرعشی، خواجہ ابوہبیرہ بصری، خواجہ ممشاد علوی دینوری، خواجہ ابواسحاق شامی، خواجہ ابواحمد ابدال، خواجہ ابومحمد چشتی، خواجہ ابویوسف چشتی، خواجہ قطب الدین مودود چشتی، خواجہ شریف زندنی، خواجہ عثمان ہارونی، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری۔

خواجہ قطب الدین مودود چشتی علیہ الرحمہ کے بارے میں تصوف کے تمام کتابوں میں تفصیلات درج ہیں۔ لیکن میں یہاں قارئین کے لیے ویکی پیڈیا کا اقتباس درج کررہا ہوں تاکہ اختصار سے مستند معلومات پہنچ سکیں:

> ''خواجہ مودود چشتی بن خواجہ ابو یوسف آپ کی ولادت بمقام چشت شریف مورخہ 430 ہجری اور وفات رجب 527 ہجری کو ہوئی۔ خواجہ قطب الدین مودود چشتی خواجہ ابو یوسف ناصرالدین چشتی (375ہجری 459 ہجری) کے فرزند تھے اور خواجہ ابو یوسف ناصر الدین سید ابو نصر محمد سمعان (ہجری 398 ہجری) کے فرزند تھے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کو چشت ہرات کے مقام پر دفنایا گیا۔ سلاجقہ کے ظہور (429 ھ) کے ایک سال بعد سید المشائخ خواجہ قطب الدین مودود چشتی پیدا ہوئے، آل سلجوق کی دور تاسیس (485۔ 498 ھ) انہوں نے اپنی جوانی میں دیکھا جبکہ مسلسل شمشیر زنی سے سلجوقیوں نے ایک عظیم سلطنت قائم کر دی تھی، سلاجقہ کے تیس سالہ دور عروج (455۔ 485 ھ) کو انہوں نے اپنے عالم شباب سے لے کر 55 سال کی پختہ عمر تک بچشم سر دیکھا، جبکہ الپ ارسلان اور ملک شاہ کی بادشاہی اور نظام الملک کی

وزارت نے سلجوقی سلطنت کے آفتاب کو نصف النہار تک پہنچا دیا تھا، اس کے بعد خواجہ مودود چشتی نے سلجوقیوں کا تیرہ سالہ دور خانہ جنگی (498ھ۔552ھ) بھی دیکھا، جبکہ ملک شاہ کے بیٹے باہم مصروف پیکار تھے، آخر میں انہوں نے سلجوقی سلطنت کا دور زوال (498ھ۔552ھ) بھی دیکھا، جس میں محمد اور سنجر اپنے خاندان کے روبہ زوال قوت کو سنبھالتے ہوئے نظر آئے، اس دوران میں سنجر کے 41 سالہ دور حکومت کے ابتدائی 16 سال ہی آپ دیکھ سکے۔ (بحوالہ: تاریخ سلاجقہ۔سید ابوالاعلیٰ مودودی)۔

مزید تفصیلات اس طرح ہیں:

خواجہ قطب الدین مودود خواجہ ابو یوسف کی ملاقات شیخ احمد جام ملقب بہ زندہ پیل سے بھی ہوئی تھی۔ خواجہ ابو یوسف چشتی کا وصال 459ھ میں ہوا تو ان کے بڑے بیٹے خواجہ مودود چشتی ان کے خلیفہ اور جانشین مقرر ہوئے، آپ کے دوسرے بیٹے کا نام شیخ تاج الدین ابوالفتح تھا، خواجہ مودود چشتی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ قرآن مجید 7 سال کی عمر میں حفظ کیا۔ اپنی تعلیم 16 سال کی عمر میں مکمل کی، آپ 29 برس کی عمر میں سجادہ نشین ہوئے اور خلق اللہ کی ہدایت میں مشغول ہو گئے، خواجہ قطب الدین مودود چشتی مشائخ چشت سے تھے آپ کے مریدوں کی تعداد بے شمار تھی خلفاء کی تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے اور خلفاء خاص کی تعداد ایک ہزار بتائی گئی ہے۔ جو شخص دلی مراد لے کر آپ کے مزار پر تین روز جائے اس کی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں، آپ ہمیشہ فقراء اور مساکین کے ساتھ صحبت پسند کرتے تھے، نیا کپڑا ہرگز نہیں پہنتے تھے۔ خواجہ قطب الدین مودود چشتی خواجہ معین الدین اجمیری چشتی کے بھی شیخ الشیوخ تھے۔ خواجہ قطب الدین مودودی بن خواجہ ابو یوسف کے خلفاء کی تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے، اس سے آپ کے حلقہ رشد و ہداہت کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا سلسلہ دعوت اس قدر وسعت اختیار کر گیا۔ اس کے اثرات صرف

ہرات تک محدود نہ رہے بلکہ دور دور علاقوں مغرب میں خراسان، عراق، شام اور حجاز تک اور جنوب میں سیستان، بلوچستان اور برصغیر پاک ہندوسندھ تک پہنچے۔ مغرب میں آپ کے نظریات کی تبلیغ آپ کے خلفاء نے کی، ان میں خواجہ شریف زندنی، خواجہ عثمان ہارونی، قابل ذکر ہیں۔ خواجہ قطب الدین مودود بن خواجہ ابو یوسف کی عمر 29 برس کی تھی جب آپکے والد کا انتقال ہوا، آپ نے خرقہ ادارت اپنے والد سے حاصل کی اور اپنے والد کے سچے جانشین ثابت ہوئے، آپ نے کسی امیر یا بادشاہ کے دروازہ پر کبھی قدم نہیں رکھا، آپ ہر شخص کی تعظیم و تکریم کرتے تھے، سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے تھے، سادہ زندگی بسر کرتے اور سادہ لباس پہنتے تھے۔''

(وکی پیڈیا؛ آزاد دائرۃ المعارف)

اس کے بعد ہم سلمٰی ڈیم کی طرف روانہ ہوئے۔ افغانستان کی تعمیر نو کے لیے حکومت ہند نے کئی منصوبے شروع کیے ہیں لیکن ان میں سلمٰی ڈیم کی اہمیت اپنی جگہ ہے کیونکہ اس ڈیم سے پانی کی فراہمی کے علاوہ بجلی کی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا۔ ایک سو میٹر اونچا اور ۵۴۰ میٹر چوڑے سلمٰی ڈیم میں ۴۲ میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ سلمٰی ڈیم حکومت ہند کی جانب سے افغانستان کو ایک تحفہ ہے جو ہندستان اور افغانستان کی دوستی کی علامت ہے۔ اب یہ ڈیم پورے طور پر حکومت افغانستان کے زیر نگرانی ہے۔ یہاں بھی ہمارے قافلے کا استقبال کیا گیا اور چائے ناشتے سے ضیافت کی گئی۔ اس کے بعد ہم چشت شریف کی جانب واپس ہوئے۔ یہاں اس قافلے کے لیے گورنر ہرات کے نائب کی جانب سے ظہرانے کا شاندار اہتمام کیا گیا تھا۔ افغانی طرز کے کھانے اور دسترخوان کے بارے میں سنا تھا لیکن یہاں اس کا مشاہدہ ہوا۔ اس کے بعد ایک چھوٹی نشست کا انعقاد ہوا جس میں چشت شریف کی اہم شخصیات نے حصہ لیا۔ انھوں نے انڈین قونصلیٹ کے سامنے کچھ مطالبات بھی رکھے جسے بہت سنجیدگی سے کمار گوروصاحب نے سنا اور یقین دہانی کرائی۔ آئی آئی پی ایس کے صدر سید اختر حسین نے اپنی تقریر میں ضیافتوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہندافغان اور بالخصوص اجمیر اور ہرات کے روحانی رشتوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی

اورخواہش ظاہر کی یہ سلسلہ جاری رہے اورنئی نسل کو بھی اس جانب مائل کیا جائے کیونکہ امن وشانتی کا موجودہ عہد میں یہی سب سے بہتر راستہ ہے۔

میز بانوں کا شکریہ ادا کر کے ہم شہر ہرات کے لیے روانہ ہوگئے۔ شام کے چار بجے ہم انڈین قونصلیٹ پہنچ چکے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ چھ بجے شام کو تیار رہنا کیونکہ ہرات میں واقع ''منظر جہاد'' میوزیم جانا ہے اس کے بعد کھانے کی ایک دعوت میں شریک ہونا ہے۔ منظر جہاد میں دراصل روسیوں کی شکست کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ اس میوزیم میں روسی اسلحے، ٹینک اور جنگی جہاز جو وہ چھوڑ کر چلے گئے تھے ان کو اس میوزیم میں رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ میوزیم کے اندرونی حصے میں شہداء کی تصاویر کے علاوہ مصوری کے ذریعے افغانستان میں مختلف جنگوں کی تباہ کاریوں کو دیکھایا گیا ہے۔ اس میوزیم کو دیکھنے کے بعد احساس ہوا کہ اس ملک کو کتنی بھیانک تباہ کاریوں سے گزرنا پڑا ہے تاہم یہاں کی زندگی میں وہی زندہ دلی کی رونق موجود ہے۔ بے شک یہ اللہ کا کرم ہے۔ اس سے افغانی عوام کی جفاکشی اور بہادری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور ان کے حالات پر ترس بھی کھایا جاسکتا ہے۔ اس میوزیم کو دیکھنے کے بعد ہم ایک عجیب سی کیفیت کے شکار ہوگئے۔ میزبان شاید یہ سمجھ رہے تھے اس لیے انھوں نے جلد ہی ہمیں عشائیہ کے لیے قریب کے ایک پر رونق ہوٹل میں لیے گئے جو ایک چھوٹی پہاڑی پر واقع ہے۔ 'دسترخوان شیراز' کے بارے میں ہم لوگوں نے سنا تھا مگر یہاں جس انداز سے انواع واقسام کے کھانوں کا اہتمام کیا تھا اسے دیکھ کر حیرت ہوئی اور یہ لگا کہ اتنا کیوں اہتمام کیا گیا۔ ہم سب لوگ بہت تھکے ماندے تھے اس لیے بہت زیادہ کھانے کی طرف راغب نہیں ہوئے مگر اپنے میزبان کا سب نے دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔ ہندستانیوں کے لیے افغانی عوام کی محبت نے ہمارا دل جیت لیا۔ ۴/ستمبر کو علی الصباح اسی سخت سکیورٹی میں ہم ایئر پورٹ پہنچے۔ یہاں بھی ہمیں بہت کچھ نہیں کرنا پڑا ہمارے میزبانوں نے ہمارے سفر کی تمام کاروائیوں کو مکمل کیا اور ہم افغانستان کی محبتوں کو سمیٹے بخیر وخوبی اپنے ملک واپس آ گئے۔

OOO

امام بخاری کے ملک میں چند روز

ازبکستان کو موجودہ دور میں کئی اعتبار سے شہرت اور اہمیت حاصل ہے لیکن اگر عقیدت کی بات کی جائے تو اس ملک کو محدثین، مفسرین اور اولیا وصوفیاء کا ملک کہا جاتا ہے۔ یہی نسبتیں اس ملک کی عظمت کے لیے بہت کافی ہیں۔ اسی ملک سے حضرت امام بخاری کا بھی تعلق ہے اور میرے نزدیک یہ تمام نسبتیں ملک ازبکستان کے لیے بہت اہم ہیں۔ ازبکستان کو دیکھنے کی تمنا میرے دل میں انہیں نسبتوں کے سبب تھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے یہ سعادت تعلیمی سفر کے طور پر عطا کی۔

ازبکستان کا ایک شہر جسے دنیا میں کافی شہرت حاصل ہے۔ یہ شہر اسلامی ملکوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس شہر کا نام ''بخارا'' ہے۔ یہ ازبکستان کا پانچواں بڑا شہر ہے۔ دنیا کے قدیم ترین شہروں میں اس کا نام لیا جاتا ہے۔ بخارا قدیم تہذیب کا نمائندہ شہر ہے۔ بخارا کے ساتھ سمرقند کا بھی نام لیا جاتا ہے لیکن سمرقند کے مقابلے میں بخارا زیادہ مشہور ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شہر پر کئی اقوام کی حکومتیں رہی ہیں اور اسلامی مملکت کے طور پر بھی بخارا دنیا میں سرفہرست ہے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بخارا شاہراہ ریشم (Silk Route) پر واقع ہے یہاں صدیوں سے تجارت کے لیے بہت سے ملکوں سے لوگ آتے تھے اس لیے تاجروں کی آمد و رفت سے ایک مشترکہ تہذیب کی بنیاد پڑتی ہے۔ آج بھی بخارا شہر میں قدیم سرائے اور بازار موجود ہیں جو صدیوں کی تہذیبی گہما گہمی کی یاد دلاتی ہیں۔ ان تمام سرایوں کو آج بھی اسی طرح محفوظ رکھا گیا البتہ ان میں جدید دور کی دکانیں ہیں جن میں زیادہ تر قومی صنعت و حرفت کی نمائش گاہ ہیں۔ مرکزی ایشیا میں اس شہر کو جائے وقوع کے لحاظ سے کافی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے کافی کام ہوئے ہیں۔ آج بھی یہاں کی مساجد اور مقبرے قدیم زمانے کی یاد دلاتے ہیں اور دنیا بھر سے سیاح اس شہر کو دیکھنے آتے ہیں۔ بعض سیاحوں نے سمرقند اور بخارا کو 'مزارات کا شہر' کہا ہے۔ ان کا یہ خیال بھی اس لیے درست ہے کہ اس سرزمین میں عالمی شہرت یافتہ بزرگان دین اور صحابہ کرام کے مزرات موجود ہیں اسی لیے اس سرزمین کو روحانی سرزمین بھی کہا جاتا ہے۔ تاریخ اسلام میں بخارا پہلی مرتبہ 850ء میں دولت سامانیہ کا دارالحکومت قرار پایا۔ سامانیوں کے دور عروج میں یہ شہر اسلامی دنیا میں علم و ادب کے مرکز کے طور پر جانا جاتا تھا۔ ایک زمانے میں بخارا ایرانی تہذیب کا اہم ترین مرکز تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے تین سو سال پُرانا ہے۔ اس شہر کو 5 ویں اور 7 ویں صدی عیسوی میں فن تعمیر کے حوالے سے تمام مملکتوں میں ممتاز مقام حاصل تھا۔ اس شہر کو حضرت امام بخاری کی وجہ سے بھی جانا جاتا ہے اور عزت اور احترام سے اس شہر کا نام لیا جاتا ہے کیونکہ قرآن کریم کے بعد پوری دنیا میں جو کتاب سب سے اہم مانی جاتی ہے وہ محمد بن اسماعیل معروف بہ امام بخاری کی ''صحیح البخاری'' ہے۔ امام بخاری نے بڑی محنت و مشقت سے رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کو جمع کیا۔ ان کی اس کتاب کو پوری دنیا میں سب سے زیادہ مستند مانا جاتا ہے۔ اسی لیے ازبکستان کے شہر بخارا کو پوری دنیا میں ایک خاص عظمت کا مقام حاصل ہے۔ اس ملک کو حضرت امام ترمذی علیہ الرحمۃ والرضوان کی وجہ سے بھی شہرت اور عظمت حاصل ہے۔ امام بخاری کے بعد امام ترمذی جن کا تعلق شہر ترمذ

سے ہے جو بلخ سے کچھ فاصلے پر دریائے آمو کے کنارے واقع ہے۔ امام ترمذی کی شخصیت عالم اسلام میں عقیدت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے کیونکہ آپ نے امام بخاری اور امام ابوداؤد سے درس حدیث لینے کے بعد اسی طریق کو اپنایا۔ حدیث کو جمع کرنے کئے لیے آپ نے بھی خراسان، عراق اور حجاز کا سفر کیا'' جامع ترمذی'' کو بھی عالم اسلام میں استناد کا درجہ حاصل ہے۔ اسی لیے اس کی لاتعداد تشریحات لکھی گئیں۔ پورے عالم اسلام میں اور بالخصوص برصغیر کے تمام مدارس میں صحیح البخاری اور جامع ترمذی پڑھائی جاتی ہیں۔ ان دونوں کتب کی وجہ سے بھی اس ملک کو احادیث کی نسبت سے عز و شرف حاصل ہے۔ موجودہ ازبکستان میں ترمذ ایک مشہور شہر ہے بڑی تعداد میں لوگ اس شہر کی زیارت کی غرض سے آتے ہیں کیونکہ اس شہر کی نسبت امام ترمذی سے ہے۔ ویسے تدوین حدیث کے لحاظ سے اس ملک کی خدمات کی نظیر نہیں ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی اس ملک سے ایسی بڑی ہستیوں کا نام جڑا ہوا ہے کہ ان کے اسمائے گرامی ہی اس ملک کی عظمت کے لیے کافی ہیں۔ جیسے حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جائے پیدائش یہی سرزمین ہے۔ صاحب ہدایہ کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے۔ ابوریحان محمد بن احمد البیرونی جیسے عظیم شخص کا بھی تعلق اسی ملک سے ہے۔ البیرونی جیسا سائنسداں، ماہر فلکیات، ماہر طب، ماہر علم نجوم اور کئی علوم پر دسترس رکھنی والی اس شخصیت کا تعلق ازبکستان کے خوارزم صوبے سے ہے۔ ان کے علاوہ کئی علماء و مشائخ کی یہ سرزمین ہے۔ بالخصوص بخارا کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس شہر کو سات خواجگان کا شہر بھی کہا جاتا ہے (اس کی تفصیلات آئندہ باب میں ملاحظہ فرمائیں) اسی طرح مرزا لغ بیگ جس نے علوم و فنون کو مرکزی ایشیا میں عام کیا۔ ان تمام ماضی کی شخصیات اور علم کے تسلسل کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ نے اس ملک پر خاص رحمت کی ہے۔

بطور مہمان پروفیسر تاشقند میں میری آمد:

تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کی دعوت پر تاشقند جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ میرے لیے اعزاز کی بات تھی کہ اس ادارے نے مہمان پروفیسر کے طور پر لیکچرز دینے کے لیے

مدعو کیا۔ میں شکر گزار ہوں ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا کا کہ انھوں نے میرے نام کی تجویز اپنی یونیورسٹی میں پیش کی اور جنوب ایشیائی زبانوں کے شعبے کی صدر پروفیسر الفت محبّ نے تمام کارروائی مکمل کی اور محترم ریکٹر (جو بنیادی طور پر وائس چانسلر ہیں، یہاں انھیں ریکٹر کہا جاتا ہے) نے منظوری دی۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں بی۔ اے سے پی ایچ ڈی تک کی تعلیم کا نظم ہے۔ تاشقند جانے سے قبل اس شعبے کے بیشتر اساتذہ سے دہلی میں ملاقات تھی اور جن اساتذہ سے ملاقات نہیں تھی ان کے بارے میں دہلی میں تعلیم حاصل کر رہے تاشقند کے طالب علموں نے بتایا تھا۔ جے این یو کے طالب علم عزیزی مظفر زادہ سفر اور دیگر متعلقات کے حوالے سے وہ مستقل میرے رابطے میں رہے ویزا اور سفر کے دیگر تمام مرحلوں میں میری مدد کی۔ عزیزی مظفر فکر مند رہے کہ میرا قیامِ تاشقند بہتر ہو، وہ خود وہاں موجود نہیں تھے مگر ہر دن کی خبر لیتے اور ان کے کئی دوست احباب تاشقند میں ان کی جگہ میری ضیافت میں مصروف رہے۔ اسی طرح کمالہ ساتبالدئیوا جو پہلے جے این یو کی طالبہ تھیں اب جامعہ میں ہیں، انھوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور اور خود تاشقند میں نہ ہونے کا افسوس کیا، ان طالب علموں کو اللہ دین و دنیا میں سرخروئی عطا کرے۔ اس کے علاوہ انڈین کلچر سینٹر کے سابق ڈائریکٹر پروفیسر قمر رئیس (مرحوم) کی سرگرمیوں کے سبب تاشقند سے واقفیت تھی اور لال بہادر شاستری سینٹر فار انڈین کلچر کے موجودہ ڈائریکٹر پروفیسر چندر شیکھر صاحب کی علمی و ادبی کاوشوں کے سبب تاشقند میں اردو۔ ہندی تعلیم اور دیگر سرگرمیوں سے آشنائی ہوئی تھی اس لیے تاشقند جاتے ہوئے مجھے بالکل بھی اجنبیت کا احساس نہیں تھا کہ میں کسی غیر ملک میں جا رہا ہوں۔ 24 اپریل 2019 کی رات جب تاشقند ائیر پورٹ پر اترا تو تاریخ بدل چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر محیا اور پروفیسر الفت ائیر پورٹ کے باہر میرے لیے منتظر ہیں۔ میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ رات آدھی گزر گئی ہے اور یہ دو محترم خواتین میرے لیے زحمت کر رہی ہیں۔ ائیر پورٹ سے باہر نکلتے ہی سرد ہواؤں کی جھونکوں نے میرا استقبال کیا اور تاشقند کی مٹی کی سوندھی خوشبو نے مشام جاں کو معطر کر دیا۔ کچھ ہی دیر قبل بارش رُکی تھی اس لیے موسم کافی خوشگوار تھا، خنکی بڑھ چکی تھی لیکن ڈاکٹر محیا اور

پروفیسر الفت نے جس گرمجوشی سے میرا استقبال کیا اس نے موسم کی سرد ہواؤں کو مات دے دی۔ ان کے ہمراہ انسٹی ٹیوٹ کے مہمان خانے پہنچا، انھوں نے وہاں ضرورت کی تمام چیزوں کا پہلے سے انتظام کر رکھا تھا اس لیے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ رات کے دو بج چکے تھے اس لیے انھیں رخصت کرتے ہی بستر پر دراز ہو گیا۔ دہلی کی گرمی سے آکر لحاف میں سونے کا لطف ہی کچھ اور تھا اس لیے بہت اچھی نیند آئی۔ لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ اگر یہ اساتذہ چاہتے تو کسی طالب علم کو مجھے لینے کے لیے بھیج سکتے تھے مگر خود دونوں معزز خواتین اساتذہ نے ائیر پورٹ آکر یہ تاثر دیا کہ ازبکستان کے لوگ مہمان نواز ہیں۔ دوسرے دن صبح ڈاکٹر محیا صاحبہ کے گھر ناشتہ کی دعوت تھی، پر تکلف ازبکی ناشتے کا لطف لیا اور کچھ ضروری کام کے بعد ان کے ہمراہ انسٹی ٹیوٹ پہنچا، بہت ہی والہانہ انداز میں شعبے کے اساتذہ نے مصافحہ کیا اور پرخلوص استقبال کیا۔ چونکہ اس دن مجھے کلاس نہیں لینی تھی اس لیے نصاب تعلیم پر گفتگو کی اور اپنی کلاسوں کے حوالے سے معلومات حاصل کیں۔ تقریباً دو گھنٹے صدر شعبہ کے ساتھ اسٹاف روم میں موجود رہا، یہی صدر کا کمرہ ہے اور یہی اسٹاف روم بھی ہے۔ پروفیسر الفت صاحبہ مستقل دفتری کاموں میں مصروف رہیں لیکن جس لمحے انھیں فرصت ملتی میری خیریت دریافت کر لیتیں اور یہ کہتیں کہ مطمئن رہیں آپ کو یہاں کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی۔ ان کے ملنے جلنے کے انداز سے مجھے محسوس ہو چکا تھا کہ یہاں کا ماحول بڑا خوشگوار ہے۔ ڈاکٹر محیا کو میری زیادہ فکر تھی کیونکہ انھیں کی تجویز سے میں تاشقند پہنچا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر لولا مکتوبہ مرتضیٰ خوجائیوا سے ملاقات ہوئی، مجھے لگا ہی نہیں کہ ان سے پہلی مرتبہ ملاقات ہو رہی ہے۔ انھوں نے ہر ممکن تعاون پیش کیا اور اس کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ اس دوران کمرے میں طالب علموں کے آنے جانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ انھیں میرے آنے کی اطلاع تھی لہٰذا ہر آنے والے طلب علم نے مجھے قیاس سے پہچانا کہ یہی ہندستانی استاد ہیں، سب نے بڑے احترام اور تشویق سے سلام کیا۔ کمرے میں داخل ہونے والے طلبہ وطالبات سے اساتذہ جس خلوص اور اپنائیت سے باتیں کر رہے تھے یہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی اور دل میں

سوچا کہ کسی بھی تعلیمی ادارے میں اساتذہ اور طالب علموں کے درمیان ایسا سلوک یقیناً تعلیمی ماحول میں ایک خوشگوار اضافہ ہوتا ہے۔

یہاں کا تعلیمی نظام اور علمی ماحول

انسٹی ٹیوٹ میں جس دن میری پہلی کلاس تھی ڈاکٹر محیا میرے ساتھ کلاس روم میں موجود تھیں انھوں نے میرا تعارف ازبکی زبان میں کرایا۔ زبان سمجھنا تو مشکل تھی مگر طلبہ وطالبات کے چہرے بشرے سے خوشی کے تاثرات نمایاں تھے۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں ایک کلاس 80 منٹ کو ہوتا ہے اور مجھے مسلسل دو کلاسیں لینی تھیں۔ میں نے ان کا عندیہ معلوم کیا کہ وہ کیا پڑھنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر محیا اور تمام طلبہ وطالبات نے اردو گرامر پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے بھی اس انسٹی ٹیوٹ کے نصاب کے مطابق پاؤر پوائنٹ کے ذریعے اسباق تیار کررکھے تھے۔ کلاس شروع ہوئی تو طالب علموں نے جس اشتیاق سے درس میں حصہ لیا وہ میرے لیے باعث مسرت اور باعث حیرت بھی تھا کیونکہ یہ پہلی جماعت کی کلاس تھی یعنی بی۔ اے سال اول، جس میں اردو ہندی دونوں زبانوں کے طالب علم ایک ساتھ موجود تھے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ اردو سمجھ پائیں گے لیکن وہ جس طرح میری باتوں کو سمجھ رہے تھے اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اساتذہ نے ان پر خوب محنت کی ہے ورنہ چھ سات مہینوں میں کسی دوسری زبان پر ایسی مہارت ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے نصاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ تمام اردو والوں کو ہندی ایک سبجیکٹ کے طور پر اور ہندی والوں کو اردو ایک سبجیکٹ کے طور پر لازمی طور پر پڑھنا ہوتا ہے۔ اسّی منٹ کا وقت کب ختم ہوا معلوم نہیں ہوا۔ کچھ وقفے کے بعد یہی کلاس دوبارہ شروع ہوئی۔ اتنی دیر میں تمام طالب علم مجھ سے مانوس ہو چکے تھے جو تھوڑی بہت اجنبیت کا احساس تھا وہ بالکل ختم ہو چکا تھا۔

ہر روز گیارہ بجے آدھے گھنٹے کا وقفہ ہوتا یہ وقفہ یادگار رہا کیونکہ اس وقت صدر کے کمرے میں تمام اساتذہ ایک ساتھ بیٹھ کر چائے ناشتہ کرتے، ہر استاد اپنے گھر سے کچھ لے کر آتے اور ساتھ مل کر چائے اور ناشتے کے ساتھ خوش گپی کرتے۔ تمام اساتذہ نے میرا خاص خیال رکھا اور

ہر روز نئے از بکی کھانے کا لطف اٹھایا۔محترمہ خمارہ صاحبہ بڑے خلوص سے چائے تیار کرتیں اور سب کو پیش کرتیں۔ یہ ماحول دیکھ کر میں بے انتہا خوش تھا۔

دو تین اہم باتیں جس کو میں نے ستائش کی نظروں سے دیکھا وہ یہ کہ کلاسیں صبح ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوتی تھیں اس لیے اساتذہ اور طالب علم سب وقت سے پہلے کلاس میں موجود ہوتے۔ مین گیٹ پر ہر روز کچھ آفیسران موجود ہوتے جو یہ دیکھتے کہ طلبہ وطالبات صحیح لباس میں آرہے ہیں یا نہیں؟ کلاس شروع ہوتے ہی ہر کلاس روم میں یہ آفیسران رجسٹر لے کر پہنچتے، مجھے معلوم نہیں ہوا کہ کونسا رجسٹر ہے لیکن اتنا اندازہ ہوا کہ ٹائم ٹیبل میں جو کلاس درج ہے وہ ہوری ہے یا نہیں؟ استاد موجود ہیں یا نہیں؟ اور طالب علموں کی اتنی تعداد موجود ہے یا نہیں جتنی کی رجسٹر میں درج ہے؟ یہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ تعلیم کے معاملے میں انسٹی ٹیوٹ کا نظام سخت ہے۔ایک طالب علم نے مجھے بتایا کہ اگر ورکنگ ڈے میں ہم طالب علم شہر یا شہر کے باہر گروپ میں جانا چاہیں تو ممکن نہیں کیونکہ پولیس دریافت کر لیتی ہے کہ پڑھائی چھوڑ کر کہاں سیر وتفریح ہورہی ہے۔ یہ بات بہت اچھی لگی اور اندازہ ہوا کہ اس ملک میں تعلیم کا گراف کیوں اتنا اوپر ہے۔تینوں جماعت کی کلاسوں میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ پائی اور لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیاں تعلیم میں زیادہ سنجیدہ نظر آئیں۔ میں اپنے علمی اسفار میں اس سفر کو بھی بہ نظر تحسین دیکھتا ہوں کہ تاشقند جیسے عالمی شہرت یافتہ شہر میں اردو کی شمع روشن کرنے والے موجود ہیں۔ان سب سے ملاقات میرے لیے ایک نعمت سے کم نہیں البتہ انسٹی ٹیوٹ کے ریکٹر صاحب سے ان کی مصروفیات کے سبب ملاقات نہیں ہو سکی جس کا قلق ہے لیکن اس کمی کو نائب ریکٹر جناب نادر عبداللہ یوا صاحب نے پوری کی، ان سے خوشگوار ملاقات رہی۔

اس انسٹی ٹیوٹ نے اردو ہندی ممالک یعنی ہندستان اور پاکستان سے اپنا رشتہ ہموار رکھا ہے ہر سال طلبہ وطالبات زیادہ تر ہندستانی اور وظیفے پر ہندستان کی بڑی یونیورسیٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جاتے ہیں۔حکومت ہند کی جانب سے اس انسٹی ٹیوٹ میں مہاتما گاندھی کے نام سے ایک ہال تیار کیا گیا ہے جسے ''ہندستانی سینٹر'' کہا جاتا ہے اور پاکستان نے بھی ایک ہال بنوایا ہے

جو اس سے قدرے چھوٹا ہے اسے ''پاکستانی کورنز'' کہا جاتا ہے۔ لال بہادر شاستری سینٹر فار انڈین کلچر، تاشقند کی جانب سے بھی ان کی مستقل حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ مگر اس رشتے اور آمد و رفت کے سلسلے کو مزید فروغ دینے کی ضرورت ہے تاکہ اساتذہ اور طلبہ و طالبات کو اہل زبان کے ساتھ رہنے اور ان کی تہذیب کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ مرکزی ایشیا میں چونکہ ازبکستان ایک ابھرتی ہوئی طاقت ہے اس لیے اس ملک کو ہندستان جیسے عظیم ملک کے ساتھ مزید تعلیمی معاہدے کرنے کی ضرورت ہے تاکہ زبان اور اقتصاد کی سمت میں مزید ترقی کے امکانات روشن ہو سکیں۔

تاشقند مشرق وسطیٰ میں اردو- ہندی کا عظیم مرکز

مشرق وسطیٰ میں اردو اور ہندی کے لیے تاشقند ایک اہم مرکز ہے۔ تاشقند کو کئی اعتبار سے اہمیت اور شہرت حاصل ہے لیکن برصغیر کے لیے اس شہر کی ایک بڑی شناخت اردو اور ہندی کی تدریس بھی ہے کیونکہ تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے تحت 1947 سے اس ادارے میں اردو- ہندی کی تعلیم دی جا رہی ہے اور یہ سلسلہ اب بھی برقرار ہے۔ تاشقند میں کئی جدید اور روایتی تعلیمی ادارے موجود ہیں لیکن تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کو ایک خاص اہمیت اس لیے بھی حاصل ہے کہ اس ادارے میں دنیا کی اہم مشرقی زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کسی بھی غیر ملک میں دوسرے ملک کی زبان کی تعلیم اور درس و تدریس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ براہ راست اس ملک کی تہذیب اور اس کے تمدن سے آگہی حاصل کرنا۔ اردو ہندستان کی قدیم زبان ہے جو ایک عرصے تک سرکاری زبان بھی رہی ہے اس کے بولنے والوں کو تعداد برصغیر میں تقریباً تیس کروڑ ہے۔ اردو اور ہندستان پر ازبکستان اور مشرق وسطیٰ کے تہذیبی اور تمدنی اثرات زندگی کے کئی شعبوں میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اردو زبان میں کثرت سے مشرق وسطیٰ کی زبانوں اور علاقائی بولیوں کے الفاظ آج بھی موجود ہیں۔ جہاں تک ازبکستان اور ہندستان کے باہمی رشتوں کی بات ہے تو مقام شکر ہے کہ زمانۂ قدیم میں بھی شاہراہ ریشم کے ذریعے اقتصادی تعلقات رہے تھے لیکن اس سے زیادہ علمی، مذہبی اور معاشرتی سطح پر گہرے رشتے

موجود تھے۔آج بھی ہندستان کے بہت سے رسوم ورواج میں مشرق وسطیٰ کی معاشرتی زندگی کے عناصر موجود ہیں۔صرف یہی نہیں کہ بابر نے ہندستان پر حکومت کی اس لیے یہ اثرات موجود ہیں۔بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بابر نے ہندستان پر غیر ملکی بن کر حکومت نہیں کی بلکہ ہندستان کو اپنا ملک بنایا اور خود کو ہندستانی بنانے میں بابر نے اپنے لیے فخر سمجھا اسی لیے اس عہد میں معاشرتی سطح پر جتنی ترقیات ہوئیں ان میں مشترک قدریں اس زمانے میں بھی موجود تھیں اور آج بھی سماجی سطح پر لین دین کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں جسے ہم 'ہند- وسط ایشیائی قدر' کہہ سکتے ہیں۔ان کی آمد کے بعد ہندستان میں بہت تیزی سے تبدیلیاں واقع ہوئیں ان میں ایک اہم واقعہ اردو زبان کا نکھر کر سامنے آنا ہے۔اسی لیے اردو اور ہندی زبانوں میں ایسے محاورے، الفاظ،ضرب الامثال موجود ہیں جو ان ممالک کی مشترکہ اقدار کی شاندار وراثت کی امین ہیں۔

اردو اور ہندی زبان کی تدریس اور تعلیم کے لیے سب سے پہلے یہ ادارہ قائم ہوا۔ پہلے اس ادارے کا نام ''ترکستان انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز'' تھا جہاں اردو- ہندی کے علاوہ کئی اور مشرقی زبانیں پڑھائی جانی شروع ہوئیں 1911 میں اس ادارے کا نام تبدیل ہو کر ''تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز'' رکھا گیا۔اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ تہذیبی،لسانی اور اقتصادی اعتبار سے جن ممالک سے نزدیک رہا ہے ان کی تہذیب وتمدن کو زبان کے ذریعے سیکھا اور سیکھایا جائے۔چنانچہ اس ادارے نے محنت ومشقت سے ایشیائی ممالک میں اپنی ایک شناخت قائم کی اور بہت تیزی سے یہ ادارہ ایشیا اور یوروپ کے ممالک میں پہچانا جانے لگا لیکن مزید ترقی کے لیے اس ادارے کو دنیا کے دیگر اداروں سے کچھ سیکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ مجموعی طور پر اردو- ہندی زبان وادب کی تعلیم وتدریس کی وجہ سے ہمارے لیے یہ ادارہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔

اس ادارے سے اردو اور ہندی کی کئی نامی گرامی شخصیات وابستہ رہی ہیں۔ابھی پروفیسر الفت محبّ صاحبہ اس شعبے کی صدر ہیں۔ان کے علاوہ بڑی تعداد میں ان کی رفیق کار موجود ہیں۔

جن میں ڈاکٹر سراج الدین نورمتوف، ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا، ڈاکٹر لولا مکتوبہ (مرتضٰی خوجائیوا)، موجودہ صدیقوا، سلیمانوا معمورا، شارا حمیدوا مخلصہ، کمالہ ایرگا شیوا اور محترمہ تمارا خوجائیوا صاحبہ یہ سب کے سب بہت ہی اخلاص اور محنت ومشقت سے درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ ان اساتذہ میں بہت سے ایسے ہیں جن کے مضامین ملک اور بیرون ملک کے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور انھوں نے ہند وپاک کے علاوہ کئی بیرونی ممالک کے سیمناروں میں شرکت بھی کی ہے۔ زیادہ تر اساتذہ پی ایچ ڈی کے علاوہ ڈی لٹ کی بھی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔

ازبکستان میں تدریس کا ایک ایسا انوکھا نظام بھی ہے جسے دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی ہوئی۔ یہاں اساتذہ سبکدوش نہیں ہوتے۔ سبکدوشی کے بعد بھی یہ جب تک چاہیں تدریس سے وابستہ رہ سکتے ہیں۔ فی الوقت محترمہ تمارا خوجائیوا صاحبہ ہیں جو تقریباً اسّی سال کی نفیس خاتون ہیں وہ اب بھی بڑی سنجیدگی سے درس وتدریس سے وابستہ ہیں، عمر کے اس حصے میں بھی جس طرح ان کو چاق وچوبند دیکھا وہ قابل رشک ہے۔ اسی طرح محترمہ موجودہ صدیقوا بھی سبکدوشی کے بعد بھی پابندی کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ آتی ہیں اور کلاسیں لیتی ہیں۔ دوسری قابل ستائش بات یہ ہے کہ تمام اساتذہ بڑے خلوص اور دوستانہ ماحول میں ایک ساتھ رہتے ہیں، کسی کے چہرے پر کسی کے لیے کوئی شکن نہیں دیکھا، سب ایک دوست کی طرح ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور ساتھ مل کر انسٹی ٹیوٹ کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ طلبہ وطالبات کی بھی بڑی تعداد ہے۔ یہ تمام اساتذہ طالب علموں کے ساتھ شفقت ومحبت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ طالب علموں سے اپنے بچوں اور دوستوں جیسا بے تکلفانہ سلوک کو دیکھ کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ دعا کرتا ہوں کہ یہ علمی درسگاہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے اور ہند-ازبکستان دوستی مزید مضبوط ہو۔

کہا جاتا ہے کہ کسی اجنبی ملک میں جس کی زبان نہ آتی تو وہاں پہنچنے والا اندھا اور بہرہ ہوتا ہے کیونکہ زبان سمجھ نہیں سکتا اور راستے معلوم نہیں ایسے میں اگر کوئی ساتھ نہ ہو تو تاشقند جیسا جنت نشان شہر بھی کسی غیر ملکی کے لیے دلفریبیاں تو پیدا کرسکتا ہے لیکن اس کے حسن وجمال کو دیکھنا اور

محسوس کرنا محال ہوتا ہے۔ خدا بھلا کرے ڈاکٹر محیا، پروفیسر الفت اور ڈاکٹر لولا مکتوبہ کا کہ انھوں نے اس بات کو محسوس کیا اور کچھ طالب علموں کو میرے ساتھ رہنے کی ہدایت کی۔ ان میں شاہجہاں سعد اللہ زادہ اور سمندر رسلاموکا نام سر فہرست ہے۔ سمندر نام کے ایک اور صاحب ملے جو مہمان خانے کے نگراں تھے۔ یہ نام شاید قارئین کے لیے عجیب ہو لیکن اس نام کا مطلب پانیوں کا سمندر نہیں ہے بلکہ اس کا معنی آگ کا ایسا کیڑا ہے جو آگ میں رہتا ہے اور جلتا نہیں اسی لیے اکثر لوگوں کو اردو کا یہ شعر سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے:

یار کے پنجۂ حنائی میں نامہ کیا پَر جلے سمندر کا

بہر کیف یہ دونوں طالب علم میرے لیے اس سفر میں میری آنکھ اور کان بنے۔ پہلے دن ملاقاتوں کے سلسلے کے بعد مہمان خانے جانے سے بہتر میں نے تاشقند کے تاریخی مقامات کی سیر کو ترجیح دی۔ ہم ''خست امام'' اسے ہست امام بھی کہتے ہیں جو شاید حضرت امام سے بگڑ کر خست امام کے نام سے مشہور ہو گیا ہے، کی زیارت کے لیے نکل پڑے۔ موسم خوشگوار تھا، بادل چھائے ہوئے تھے، ہلکی خنکی تھی، ہوائیں تیز چل رہی تھیں اس سہانے موسم میں تاشقند کی سڑکیں اور گلیاں اپنی جانب متوجہ کر رہی تھیں۔ چار سو میٹرو اسٹیشن سے نکل کر جوں ہی بازار کی جانب روانہ ہوئے تیز بارش نے ہمارا استقبال کیا۔ غنیمت تھا کہ ہم مارکیٹ میں تھے فوراً ہی ایک چھتری خریدی۔ چھتری کی قیمت ستر ہزار دینے پڑے، مجھے ذرا تکلیف ہوئی کہ ستر ہزار سوم میں ایک چھتری؟ (یہ ستر ہزار تقریباً ساڑھے پانچ سو انڈین روپے تھے) معاملہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں سو دو سو میں بہت سی چیزیں خریدی جا سکتی ہیں لیکن یہاں کی کرنسی کی قیمت چونکہ بہت کم ہے اس لیے کوئی بھی چیز لیں دس بیس ہزار سے شروع ہوتی ہے۔ لہذا ہم جیسوں سے جب دس بیس ہزار کسی معمولی چیز کے لیے طلب کیا جاتا ہے تو عجیب لگتا تھا اسی لیے پندرہ دنوں میں بھی یہاں کی کرنسی سے میں ہم آہنگ نہیں ہو سکا۔ بہر کیف ہلکی ہلکی پھوار اور ٹھنڈی ہواؤں نے موسم کو اور بھی سہانا کر دیا تھا، شاہجہاں کے ساتھ گرم گرم ازبکی کباب اور چائے کے بعد جب بارش رکی تو ہم ''خست امام'' کی

جانب روانہ ہوئے کچھ ہی دیر میں اس کمپلکس کے سامنے موجود تھے۔شام کی ہلکی سرمئی روشنی میں یہ وسیع وعریض کمپلکس بہت ہی خوبصورت لگ رہا تھا۔لب سڑک واقع اس کمپلکس کے سامنے والے حصے میں ایک مسجد تھی جو اپنے طرز تعمیر کے سبب دیدہ و دل کو ذوق نظارہ سے مسرور کر رہی تھی۔وضو کے بعد مسجد میں داخل ہوئے تیموری طرز تعمیر کی شاندار عمارت،گنبد ومحراب کے نقش و نگار، بڑے ستون اور لکڑی کے بڑے دروازے اور لکڑی کے قومی نقش ونگار سیاحوں کو حیرت زدہ کر رہے تھے۔اس کے وسط میں ایک اور گنبد والی مسجد نما عمارت ہے جو بنیادی طور پر قرآن میوزیم ہے اس میوزیم میں تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دست مبارک سے لکھا قرآن پاک موجود ہے جو تین سو اڑتیس (338) چمڑے کے اوراق پر مشتمل ہے۔اسی قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے آپ شہد ہوئے تھے ۔اس قرآن پاک پر آپ کے خون مبارک کے نشانات موجود ہیں۔اس قرآن پاک کے بارے میں تصدیق سے کہا گیا ہے کہ یہ وہی قرآن کریم ہے جس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون مبارک کے نشانات موجود ہیں۔جس وقت آپ کی شہادت ہوئی آپ اسی قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے تھے۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے قرآن پاک کی حفاظت اور کسی بھی طرح کی تحریف سے پاک رکھنے کے لیے چھ نسخے تیار ہوئے جس میں سے پانچ نسخوں کا کوئی علم نہیں کہ کہاں ہیں۔صرف یہ نسخہ جو تاشقند میں موجود ہے وہی اب تک دریافت ہو سکا ہے۔یہ نسخہ امیر تیمور کے زمانے میں عراق سے لایا گیا تھا۔اس میوزیم میں ایک تصدیق نامہ اس کے استناد کے سرٹیفکٹ کے طور پر رکھا گیا ہے جس میں درج متن کی اردو تلخیص اس طرح ہے:

> ''یہ قرآن پاک حضرت عثمان کے ہاتھوں ساتویں صدی عیسویں میں 644-646 عیسوی کے درمیان تحریر کیا گیا۔تیسرے خلیفہ کے عہد تک جنگ میں بہت سے حفاظ کی شہادت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تشویش ہوئی کہ کہیں حفاظ ختم ہو گئے تو قرآن پاک کو کیسے محفوظ رکھا جائے گا لہٰذا انھوں نے اسی مقصد کے

پیش نظر چھ نسخے تیار کرائے۔ان میں سے یہ ایک ہے جو عراق کے شہر بصرہ سے یہاں امیر تیمور کے ذریعے لایا گیا۔ پہلے اسے سمرقند میں اسلامک اسکول نادر دیوان بیگی میں رکھا گیا۔1869 میں سوویت تسلط کے بعد اس قرآن پاک کو سینٹ پیٹر برگ کے میوزیم لے جایا گیا جہاں اس کے پچاس عکسی نسخے بنائے گئے۔1917 میں روسی انقلاب کے بعد اس قرآن پاک کو تاتاریوں کے سپرد کر دیا گیا۔1926 میں بہت گزراشات کے بعد دوبارہ اسے تاشقند لایا گیا۔1989 میں تاشقند کے پہلے صدر اسلام کریموف اور ان کے وزیروں کے مشورے سے اس قرآن پاک کو بورڈ آف مسلم، ازبکستان کے سپرد کیا گیا اور اب یہ اس میوزیم میں محفوظ ہے۔ (یونیسکو نے اس کے استناد کی سند جاری کی ہے)۔''

تاشقند کی بارش میں نور سے نہلائی ہوئی اس مسجد کا نظارہ روح پرور تھا۔مسجد سے نکل کر درمیان میں واقع قرآن میوزیم پہنچے یہاں دنیا کے نادر و نایاب قرآن کریم کے نسخے موجود ہیں اور اب تک قرآن کریم کے جتنی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں ممکنہ طور پر یہاں موجود ہیں اس کے علاوہ قرآن و حدیث کے کئی اہم مخطوطات بھی ہیں ۔ہم دیر تک اس کی زیارت کرتے رہے لیکن جب باہر جانے کی سوچا تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔اس لیے اسی میوزیم میں بیٹھے رہے بارش کی وجہ سے لوگوں کی بھیڑ کم تھی لہذا زیارت کا اچھا موقع مل گیا۔

اسی کمپلکس کے آخری سرے پر مسجد نما عمارت تھی جو اب آرٹ گیلری میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس گیلری میں بالخصوص تاشقند اور بالعموم ازبکستان کی قومی دستکاری کی چیزیں برائے فروخت تھیں جن میں سب سے دیدہ زیب لکڑی سے بنی ہوئی رحل اور دیگر اشیا کے علاوہ قدیم اور قومی طرز کے زیورات سیاحوں کو اپنی جانب ملتفت کر رہے تھے۔ بارش یونہی جاری تھی کبھی ہلکی اور کبھی تیز،مغرب کے بعد ہم یہاں سے روانہ ہوئے شاہجہاں نے مجھے گیسٹ ہاؤس پہنچایا اور وہ خود اپنے فلیٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔

جمعہ کو کچھ دیر کے لیے ہم انسٹی ٹیوٹ گئے اساتذہ سے ملاقاتیں کیں، تاشقند اور ہندستان کے روابط، اردو اور ہندی زبان کے فروغ کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی۔ ابھی ہم طے ہی کر رہے تھے کہ کس جانب جانا چاہیے کہ اتنے میں پروفیسر چندر شیکھر صاحب کا فون آیا انھوں نے فون پر ہی تاشقند میں میرا استقبال کیا اور لنچ کی دعوت دی لیکن ہم اساتذہ کے ساتھ لنچ کر چکے تھے تاہم بلا تاخیر شاہجہاں سعداللہ زادہ کے ساتھ لال بہادر شاستری سینٹر فار انڈین کلچر، تاشقند میں کلچرل کاؤنسلر پروفیسر چندر شیکھر صاحب سے ملنے پہنچ گئے۔ بڑے تپاک سے انھوں نے خیر مقدم کیا دیر تک تاشقند اور تاشقند میں اردو، ہندی اور فارسی کے علاوہ یہاں کے علمی و ادبی ماحول اور شخصیات سے متعلق باتیں کیں۔ کیونکہ اگلی صبح انھیں دہلی کے لیے نکلنا تھا انہیں بہت سی تیاریاں کرنی تھیں اس لیے ان سے اجازت لے کر ہم شاہجہاں کے ساتھ خیابان تیمور اور تیمور میوزیم دیکھنے نکلے۔

خیابان تیمور ازبکستان ہوٹل کے عین مقابل واقع ہے۔ یہ یہاں کا قدیم ہوٹل ہے جو تاشقند کے اہم شاہراہ پر واقع ہے اسی کے سامنے بہت ہی خوبصورت پارک ہے جس کو خیابان تیمور کہتے ہیں۔ بہت سلیقے سے اس کا رکھ رکھاؤ کیا جاتا ہے۔ ویسے ازبکستان کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں کی ہر چیز میں ایک سلیقہ ہے اور جمالیاتی ذوق دیکھنے کو ملتا ہے خواہ وہ سڑکوں پر لگے بجلی کے کھمبے ہوں یا سڑکوں پر بنے نشانات، چھوٹی سے چھوٹی چیزوں میں خوبصورتی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، سو اس پارک میں بھی یہ تمام چیزیں دیکھنے کو ملیں۔ سڑک کے دونوں کناروں پر خوبصورت ہرے بھرے چنار، پستہ اور مختلف انواع کے درختوں کے ساتھ ''کشتاں'' کے خوبصورت اور سایہ دار درخت شہر کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔

" کشتاں "ازبکستان کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے والا درخت ہے۔ ازبکستان میں یہ درخت کثرت سے پایا جاتا ہے۔ یہ بہت ہی گھنا، سایہ دار درخت ہے لیکن اس کی ایک اہم خوبی بھی ہے۔ اس کے پھول سفید ہوتے ہیں اور پھل ڈارک براؤن (سرخی مائل) اس کا پھل تقریباً

جامن کی طرح ہوتا ہے لیکن بہت سخت، اس کے پھل کو پیس کر سیرپ بنایا جاتا ہے جو ہڈیوں کے جوڑوں کے لیے بہت ہی مفید ہوتا ہے۔ یہ گھریلو نسخے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے کہتے ہیں جن کے گھٹنوں کے گودے کم ہونے لگتے ہیں ان کے لیے یہ بہت مفید ہے۔ خیر ان خوبصورت سڑکوں سے گزرتے ہوئے خیابان تیمور میں داخل ہوئے۔ پارک کے وسط میں امیر تیمور کا ایک بڑا مجسمہ بنا ہوا جس میں امیر تیمور کو گھوڑے پر بیٹھا دیکھایا گیا ہے۔ یہاں ہر آنے والا سیاح ضرور اس کے سامنے یادگار کے طور پر تصویریں لیتا ہے۔

پارک سے گزرتے ہوئے ہم پیدل ہی تیمور میوزیم کی جانب چل پڑے۔ تاشقند کا تیمور میوزیم جس میں تیموری عہد کی نایاب و نادر اشیا کو جمع کر دیا گیا۔ اس عمارت کے نقش و نگار آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں۔ ازبکستان کے اہل اقتدار کی تہذیبی شناخت قائم رکھنے کی کوششوں کا یہ زندہ ثبوت ہے اسی لیے اس میوزیم کو یہ وقار حاصل ہوا ہے کہ ازبکستان آنے والے سیاح ضرور اس میوزیم کو دیکھنے آتے ہیں۔

اس دن کا موسم ذرا گرم تھا اس لیے ہم تھک گئے اور سر شام ہی گیسٹ ہاؤس واپس آ گئے۔ کچھ دیر آرام کیا ہوگا کہ ڈاکٹر محیا کے ایک طالب علم پہنچے اور مجھے محیا صاحبہ کے گھر لے گئے جہاں انھوں نے پر تکلف عشائیہ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ان کی بہن محترمہ مرحبا صاحبہ نے طرح طرح کے ازبیکی کھانے بنائے۔ محترمہ الفت صاحبہ بھی ساتھ تھیں۔ ابھی ہم کھانا سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ بارش شروع ہوگئی۔ اسی بہانے دیر تک ہم باتیں کرتے رہے اور گرین ٹی کا لطف لیتے رہے۔ بارش تھمی تو الفت صاحبہ کے ساتھ کار میں سوار ہوئے پہلے انھوں نے مجھے گیسٹ ہاؤس پہنچایا پھر اپنے گھر کو روانہ ہوئیں۔ رات کو میرے محترم دوست اور انسٹی ٹیوٹ کے استاد ڈاکٹر سراج الدین نورمتوف صاحب کا فون آیا، بڑی محبتوں سے انھوں نے اپنی ضیافت کی پیشکش کی، ان سے نو بجے صبح ملاقات کا وقت طے ہوا۔ شاید ابھی نو بجنے میں کچھ منٹ باقی ہی تھے کہ سراپا انکسار کے ساتھ وہ کمرے میں تشریف لے آئے۔ ان کی محبت اور خلوص کو لفظوں میں بیان کرنا

مشکل ہے۔ان سے میری پانچ سال قبل پہلی ملاقات ہوئی تھی جب وہ میری دعوت پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے عالمی سیمنار میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔تب سے راہ ورسم تھی اس لیے میری تاشقند آمد سے وہ بہت خوش تھے، وہ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ بتایا جائے مگر مصروفیات کے سبب ممکن نہ ہوسکا۔خیر ان کے ساتھ تاشقند کے مشہور مقام 'بین الاقوامی دوستی کا علاقہ' کی سیر کو گئے پہلے انھوں نے ایک ریسٹورینٹ میں ازبکستان کے مشہور کباب سے ضیافت کی اس کے بعد اسی علاقے سے متصل پارک میں گئے جو بین الاقوامی دوستی کا علاقہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس علاقے میں تقریباً تمام بین الاقوامی دفاتر موجود ہیں۔تفریح کرتے ہوئے ان کے ساتھ بارہ بجے تک انسٹی ٹیوٹ آ گئے اگلے دودنوں تک کلاسیز نہیں تھیں اس لیے تاشقند میں ہی سیر وتفریح کا پروگرام بنایا۔ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا نے تاشقند کے قدیم بازار 'چارسو' جانے کو پلان مرتب کیا یہ قدیم شہر تاشقند میں واقع ہے۔چارسو دہلی کے چاندنی چوک جیسا پرانا بازار ہے یہاں دور تک پھیلے اس بازار میں ہر طرح کی چیزیں دستیاب ہیں خاص طور پر میوے اور گھریلو اشیا۔شہر کے لوگ اکثر اسی جگہ شاپنگ کے لیے آتے ہیں۔بازار کے ایک کونے میں سونے کے زیورات کی بہت سی دکانیں بھی ہیں۔کہا جاتا ہے کہ ازبکستان میں سونے کے کھان موجود ہیں اس لیے سونا یہاں قدرے سستا ہے لیکن یہاں کا سونا زیادہ سے زیادہ ۱۸ کیریٹ کا ہوتا ہے۔بہر کیف ہم نے بھی کچھ خشک میوے خریدے اور شام تک گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔شام کو میرے طالب علم مظفر زادہ کے دوست کی جانب سے کھانے کی دعوت پر جانا تھا۔شام سہانی ہوچکی تھی بارش کے بعد ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔یہاں عموماً مغرب بعد ہی کھانا کھالیا جاتا ہے لہٰذا مظفر کے دوست میر فیاض مغرب سے پہلے ہی گیسٹ ہاؤس پہنچے کیونکہ کھانے کے لیے شہر کے جنوبی علاقے کے مشہور ریسٹورینٹ 'زاہد کباب' جانا تھا، محیا صاحبہ پہلے سے ہماری منتظر تھیں۔واقعی یہ بہت ہی مشہور ریسٹورنٹ تھا۔لوگ پہلے سے بُک کرائی اپنی سیٹوں کے خالی ہونے کا انتظار کررہے تھے، ہمیں بھی کچھ دیر میں ایک مناسب جگہ مل گئی۔یہاں مچھلی کے پکوان بہت مشہور ہیں سو ہم نے

بھی مچھلی اور قومی طرز کے کباب کھائے۔اب رات ہو چکی تھی اور ٹھنڈک بھی بڑھ چکی تھی اس لیے جلدی گیسٹ ہاؤس پہنچ کر آرام کرنا طے پایا اور اگلے دن یعنی اتوار کو تاشقند کے مضافات میں ''زنگی اوتا'' بزرگ کے مقبرے کی زیارت کا پروگرام بنا۔

زنگی اوتا کا مقبرہ:

دو پہر تقریباً ایک بجے جناب میر فیاض کار لے کر گیسٹ ہاؤس پہنچے، شاہجہاں اور سمندر سلامو پہلے سے ہمارے ساتھ جانے کو تیار بیٹھے تھے۔ازبکستان کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں اولیا اور صوفیا کے بہت سے مزارات ہیں انھی میں سے ایک زنگی اوتا کا دربار بھی ہے۔ یہ مقام تاشقند سے تقریباً پندرہ کیلومیٹر کی دوری پر واقع ہے اس پورے علاقے کو اسی نام سے جانا بھی جاتا ہے۔شیخ علی خواجہ معروف بہ زنگی آتا جس کو ہم اپنی زبان میں زنگی بابا یا زنگی آقا کہہ سکتے ہیں کیونکہ ازبک میں آتا کا مطلب 'والد' ہوتا ہے۔ یہ تیرھویں صدی کے بہت بڑے بزرگ ہیں ان کا رنگ بالکل سیاہ تھا اسی لیے ان کو زنگی کہا جاتا ہے۔ یہ اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں میں چرواہی کیا کرتے تھے ایک عام سے انسانوں کی زندگی بسر کرتے تھے لوگ اُن کو ان کے حسن اخلاق کی وجہ پہچاننے لگے اور بعد میں دین اسلام کی تبلیغ کے سبب لوگ ان کے معتقد بنتے گئے اور دیکھتے دیکھتے ایک بڑا حلقہ ان کی ارادت میں آ گیا۔انھوں نے اسلام کی تبلیغ کی اور عوام کے درمیان اخوت و محبت کا پیغام عام کیا۔ان کا مرتبہ بہت بلند ہے ان کے کئی مریدین بھی ولایت کی منزلوں پر فائز ہوئے اور انھوں نے دین اسلام کے پیغامات کو وسط ایشیا میں عام کیا۔ان کے مقبرے کو بعد میں 1870 میں بنایا گیا۔ یہ ایک بڑا احاطہ ہے جس میں مسجد، خانقاہ، طلبہ کے لیے اقامت گاہ، حوض، دروازہ خانہ، زنگی بابا اور انبر بی بی کا مقبرہ اور بلند مینار ہے، اسی سے متصل قدیمی قبرستان ہے۔اس قبرستان کی بعض قبروں پر ان کی تصاویر بھی لگی ہوئی ہیں۔اس دربار میں پورے وسط ایشیا سے بڑی تعداد میں زائرین آتے ہیں۔ان میں خواتین کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔اس پورے احاطے کی تعمیرات تیموری طرز تعمیر کا خوبصورت نمونہ ہے۔

ازبکستان میں کسی بزرگ کے آستانے پر میری یہ پہلی حاضری تھی۔کئی چیزیں جو مجھے بہت اچھی لگیں وہ یہ تھیں کہ مزار جس گنبد کے نیچے واقع ہے اسی سے متصل کمرے بنے ہوئے ہیں جس میں فرش پر خوبصورت صاف ستھرے قالین بچھے ہوئے تھے اور دیوار سے متصل چاروں جانب بینچ لگے تھے۔مرد وعورت زائرین اس کمرے میں داخل ہوتے اور جس کو جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے اس کے بعد شاید حکومت کی جانب سے مقرر خادم خوش الحانی سے درود شریف پڑھتے ،قرآن پاک کی تلاوت کرتے اور اجتماعی طور پر فاتحہ میں سب شریک ہوتے ، فاتحہ کے بعد نذر و نیاز کے لیے مخصوص صندوق میں حسب اوقات روپے پیسے ڈالتے اور اکثر خواتین گھروں سے کھانے کی اشیا لے کر آتیں جو زائرین اور خدام کو پیش کی جاتی تھیں۔اس کے بعد سلام کر کے آہستگی اور ادب سے واپس آجاتے اس کے بعد باہر منتظر لوگ دوبارہ باری باری سے ان کمروں میں داخل ہوتے۔ فاتحہ خوانی کا یہ انداز بہت اچھا لگا۔یہاں زیارت کرنے والوں میں زیادہ تر خواتین ہوتیں۔اس کے بعد جہاں بھی مزارات کی زیارت کے لیے گیا ہر جگہ یہی نظام پایا۔

مینار مسجد

شام کے چار بج چکے تھے ،ہمیں بھوک لگ رہی تھی اس لیے میر فیاض ایک شاندار ریسٹورینٹ لے گئے اور لذیز کھانا کھلایا۔واپسی میں پہلے سے ارادہ تھا کہ تاشقند میں نئی طرز کی مسجد جو''مینار مسجد'' کے نام سے مشہور ہے،کی زیارت کریں گے۔تاشقند میں سیاحوں کے لیے یہ بڑی کشش کا مقام ہے ہمیں یہاں عصر کی نماز پڑھنی تھی۔لیکن ٹریفک کے سبب پہنچنے میں تاخیر ہوئی اس لیے جماعت تو نہیں مل سکی مگر ہمیں اس مسجد کی زیارت کا شرف ضرور حاصل ہوا۔

مینار جامع مسجد تاشقند میں طرز جدید کی عمارت کا شاندار نمونہ ہے۔یہ سفید سنگ مرمر اور ٹائلس سے بنا ہے اس کا نیلا گنبد خوبصورتی میں مزید اضافہ کرتا ہے۔چاندنی رات میں اس کا نظارہ دلکش ہوتا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اتنی شفاف ہے کہ عمارت کے رنگ کو نقصان نہیں پہنچاتی ۔ اندرونی حصے مشرقی طرز کے زیب وزینت سے مزین ہیں،محراب کے حصے میں خالص سونے سے

قرآنی آیات اور نقش ونگار بنائے گئے ہیں۔ یہ مسجد 1913 میں بننی شروع ہوئی اور ا اکتوبر 1914 کو عید میلا دالنبی کے موقعے سے اس کا افتتاح ہوا۔اس مسجد میں 2400 لوگ بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ یہاں عورتوں کے لیے بھی نماز کے لیے مخصوص جگہ ہے۔اس مسجد کے انتظام و انصرام کو دیکھ کر حیرت ہوتی کہ نمازیوں کی سہولت کے لیے تمام چیزیں مہیا ہیں۔وضوخانے میں ہر شخص کے لیے دو تولیے ہوتے ہیں۔ایک سے منہ ہاتھ پوچھنے کے لیے اور دوسرے تولیے سے پیروں کو پوچھنے کے لیے،ایک بار استعمال کے بعد دوبارہ استعمال نہیں ہوتا،اسے دھونے کے لیے رکھ دیا جاتا ہے۔صفائی کا یہ حال ہے کہ ایک تنکا بھی نظر نہیں آئے گا، یہ مسجد مقامی اور غیر ملکیوں کے لیے قابل زیارت مقام بن گیا ہے۔اللہ اس کے انتظام وانصرام کرنے والوں کو جزائے خیر دے اور اس ملک کو اپنے حفظ وامان میں رکھے جس نے اسلامی آثار کو سنبھال کر رکھا ہے۔

میدان استقلال:

میری یہ کوشش تھی کہ مختصر قیام کی مدت میں جس قدر ممکن ہو تاریخی مقامات کو دیکھ لوں چنانچہ ہر روز دو بجے کے بعد شاہجہاں کے ساتھ شہر کی جانب نکل جاتا آج میدان استقلال کی سیر کو نکلا۔ جسے وہاں (Maydoni Mustaqillik) کہا جاتا ہے۔ اسی سے منسلک علاقے میں صدر ازبکستان کا گھر اور دفتر ہے ۔سویت یونین کے زمانے میں یہاں لینن کا ایک دیو قامت مجسمہ ہوا کرتا تھا جسے منہدم کر دیا گیا ہے اور صدر کے گھر کو بھی نئے سرے سے بنایا گیا ہے۔ یہ اہم شاہراہ پر واقع ہے۔ سڑک کے کنارے سے ہی ایک خوبصورت گیٹ نما تعمیر اور اس کے چاروں طرف فوارے، درمیان میں خوبصورت سبزہ زار اور اردگرد بلند و بالا عمارتوں نے اس تفریح گاہ کو خاصا دلفریب بنا دیا ہے۔

اسی کے ساتھ شہیدوں کی یاد میں ایک میموریل اسکوائر ہے جو باغات کے درمیان ہے جس میں دونوں جانب دالان نما عمارت بنی ہوئی ہے اس عمارت کے ہر حصے میں پیتل سے بڑے سائز کی کتاب بنائی گئی ہے۔ ہر کتاب میں تقریباً بیس پیتل کے صفحات ہیں جن میں آزادیٔ ازبکستان

میں شہید ہوئے فوجیوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔اس میدان کے ایک حصے میں عورت کا ایک بڑا مجسمہ بنایا گیا ہے جو ''ماں'' کی علامت ہے۔اس مجسمے میں ماں اس بات کی بھی علامت ہے کہ ماں ان شہیدوں پر نازاں ہے۔ یہاں کے لوگ اپنے شہیدوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے طرح طرح کے طریقے اپناتے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگ فوجیوں کا لباس زیب تن کر کے ان کو یاد کرتے ہیں،جس فوجی لباس میں وہ شہید ہوئے تھے۔ مائیں عام دنوں میں بھی اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے یہاں فوجی لباس پہنا کر لاتی ہیں۔

ازبکستان میں 9 مئی کو ''وکٹری ڈے'' یعنی یوم آزادی کی تقریبات منائی جاتی ہے۔ یہ وہ دن ہے جس دن ازبکستان کے بہادر اور جیالے افراد نے اپنی جانوں کی قربانیاں پیش کر کے اس ملک کو فاشزم سے نجات دلائی۔ ۹ مئی کو ہر سال بڑے اہتمام سے اس دن کو منایا جاتا ہے۔ صدر مملکت خود شریک ہوتے ہیں اور حکومت سے وابستہ تمام لوگوں کو لازمی طور پر شریک ہونا پڑتا۔ اسی لیے یہ دن ازبکستان کے لیے فخر اور سربلندی کا دن تصور کیا جاتا ہے۔

اسی علاقے سے نزدیک 'میر علی شیر نوائی' شاہراہ پر شہیدوں کا میدان واقع ہے۔ یہ وہ شہداء ہیں جن کا آزادی سے قبل روسی حکومت نے قتل عام کیا۔ یہ میدان انہی شہیدوں کی یاد میں بنایا گیا اس پارک کے درمیان ایک نیلا گنبد ہے اور گنبد سے فراز کی جانب بڑا سا مصنوعی آبشار بنایا گیا ہے۔ جہاں آبشار ختم ہوتا ہے وہیں ایک بڑا قدرتی آبی ذخیرہ ہے۔ جو افراد شہید ہوئے ان کی قبروں کا پتہ نہیں چلتا کیونکہ اسے مسمار کر دیا گیا تھا لیکن اسی احاطے میں ایک میوزیم بھی بنایا گیا ہے اس میوزیم کو دیکھنے کے بعد روسی دور کے خاتمے اور ان کی شکست کی داستان سمجھ میں آتی ہے۔ یہاں آزادی سے جڑی یادگار اور اہم شخصیات کی تصویریں اور شکست خوردہ روسی حکومت کی گاڑیاں اور اسلحے موجود ہیں۔ اتفاق سے جس دن میں یہاں گیا وہ چھٹی کا دن تھا اور میوزیم بند تھا لیکن میرا اشتیاق تھا کہ اسے دیکھا جائے سو ہم نے وہاں موجود ایک نگہبان سے بات کی، دوگنی فیس

لے کر مجھے اور شاہجہاں کو اندر جانے کی اجازت مل گئی لیکن تصویر لینے سے منع کیا گیا۔ یہ عمارت طرزِ تعمیر کے لحاظ سے خالص ازبکی طرز کی ہے جس میں لکڑیوں سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔

غفور غلام پارک:

چند دنوں کی کلاس کی بعد طلبہ و طالبات مجھ سے بہت گھل مل گئے۔ اس لیے انھوں نے ایک تجویز پیش کی کہ صرف شہاجہاں نہیں ہم بھی آپ کے ساتھ تاشقند کی سیر کو جائیں گے۔ یہ میرے لیے خوشی کی بات تھی، میں نے ایک شرط رکھی کہ ہر طالب علم صرف اردو یا ہندی میں بات کریں گے، اگر یہ منظور ہے تو چلیں۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ طالب علم جو بولنے میں جھجھک محسوس کر رہے تھے اس تفریح نے ان کی جھجھک ختم کر دی۔ ہم ان طالب علموں کے ساتھ غفور غلام پارک گئے دیر تک تفریح کے بعد اس پارک میں واقع ایک بڑے تالاب میں کشتیوں میں بیٹھ کر گھومنے کا لطف بھی لیا۔ واقعی یہ طالب علم مجھے بہت عزیز ہیں کیونکہ انھوں نے بہت ہی اپنائیت اور احترام کے ساتھ میرا خیال رکھا۔ تاشقند شہر رقبے اور آبادی کے لحاظ اگر چہ چھوٹا ہے مگر اس شہر میں اتنی قدیم تاریخی عمارتیں اور قابل دید مقامات ہیں کہ سب کو چند دنوں میں دیکھنا ناممکن ہے۔

سمرقند شہر اولیاء وصوفیاء:

تاشقند کے بعد میری خواہش تھی بلکہ ہندستان سے ہی ارادہ تھا کہ دو دو دن کے لیے ہی سہی مگر سمرقند اور بخارا ضرور جانا ہے۔ دہلی سے ہی میں نے اپنی میزبان ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا سے گزارش کی تھی کہ وہ کسی طرح میرے سفر کا انتظام کریں۔ انھوں نے ڈاکٹر لولا مکتوبہ صاحبہ سے ذکر کیا اور انھوں نے بڑی محبت سے اس سفر کا انتظام کیا۔ ڈاکٹر لولا مکتوبہ صاحبہ کا شکر یہ لفظوں میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے یکم مئی سے چار مئی تک، چار دن کا پلان اس طرح مرتب کیا کہ کلاسیں بھی ناغہ نہیں ہوئیں۔ یہ سفر کافی آرام دہ اور آسان اس لیے ہوا کہ انھوں نے اپنے دو طالب علم جناب شاہ رخ اور احمد کو اس سفر میں میرے ساتھ کیا۔ احمد صاحب کی اپنی کار تھی اور وہ اسی علاقے سے تھے۔ دوپہر کی کلاس ختم ہوتے ہی لولا صاحبہ ہمیں اپنے ان دو طالب علموں کے ساتھ تاشقند

کے ایک مشہور ریسٹورینٹ 'ریحان' لے گئیں اور پُر تکلف ظہرانے کے بعد ہمیں سمر قند کے لیے روانہ کیا۔ یہ طالب علم تیسری جماعت کے تھے۔ جب ان کے ہم جماعتوں کو معلوم ہوا کہ ہم سمر قند اور بخارا جارہے ہیں تو دو طالبہ بھی ساتھ جانے کو تیار تھیں، لولا صاحبہ چونکہ طالب علموں کو اپنے بچوں کی طرح رکھتی ہیں اس لیے ان بچوں نے بھی اسی طرح ضد کی، مگر ممکن نہیں تھا اس لیے وہ دلبرداشتہ ضرور ہوئیں لیکن لولا صاحبہ نے ان کی دلجوئی کی۔ خیر ہم تقریباً دو بجے تاشقند سے سمر قند کے لیے روانہ ہوئے۔ سمر قند کی دوری تین سو کیلومیٹر کی ہے۔ تاشقند سے سمر قند جانے والی شاہرہ آگے چل کر شاہراہ ریشم (سلک روٹ) سے مل جاتی ہے۔ یہ بہت ہی شاندار سڑک ہے اسی لیے یہ دوری ساڑھے تین گھنٹے میں طے ہوجاتی ہے۔ شہر سے نکل کر جب ہم کھلے راستے میں آئے تو دیکھا کہ سڑک کے دونوں کناروں میں تاحد نگاہ زرعی فارم یعنی کھیتیوں کا ایک سلسلہ تھا جو انتہائی سر سبز و شاداب تھا۔ سڑک کے کناروں پر کہیں چیری، کہیں پستہ، کہیں اسٹابیری، کہیں خوبانی کے باغات تھے تو کہیں دور دور تک گندم کی فصلیں لگی ہوئی تھیں اور کہیں سبزیاں تو کہیں کھیرے کی کھیتی ہورہی تھی۔ ان کھیتوں میں مرد اور عورتیں کام کرتی دیکھائی دے رہی تھیں۔ چونکہ یہ اسٹابیری کا موسم تھا اس لیے اکثر جگہوں پر عورتیں باغ سے تازہ اسٹابیری توڑ کر بیچتی ہوئی نظر آئیں۔ یہ بڑا خوبصورت نظارہ تھا دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اللہ نے اس سرزمین کو کتنا زرخیز اور سرسبز و شاداب بنایا ہے۔ جب یہ سرزمین اتنی خوبصورت لگ رہی ہے تو جنت کتنی خوبصورت ہوگی۔ کچھ ہی دوری طے کی تھی جناب شاہ رخ نے بتایا کہ سر ہم شاہراہ ریشم پر آچکے ہیں اور اب اسی پر چلتے ہوئے سمر قند اور بخارا کا سفر کریں گے۔ میں کچھ دیر کے لیے ماضی کی تاریخ میں کھو گیا کہ یہ وہی صدیوں پرانی شاہراہ ہے جس پر کتنے قافلوں اور کتنے حاکموں نے سفر کیا ہے اور کیا کیا تاریخیں رقم کی ہیں۔ ہم بڑے آرام سے کار میں بیٹھے ان نظاروں سے محظوظ ہورہے تھے کہ 'جزاخ' کی وادی پہنچ گئے۔ نشیب و فراز اور سرسبز و شاداب اس وادی کا نظارہ بڑا دلفریب تھا فراز کی جانب سفر کرتے ہوئے پہاڑ کے دامن میں بسی بستیوں کو دیکھ رہا تھا اور ان پر رشک کر رہا تھا کہ اللہ نے ان لوگوں کو

کس قدر خوبصورت دنیا عطا کی ہے۔ جیسے ہی ہم نشیب کی جانب آئے تو دریائے 'سنگ زار' کے پیچ وتاب نظر آئے جو اس خطے کے حسن میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ کچھ دور تک اس سنگ زار کے کنارے سفر کرتے رہے اور آخر کار سمرقند کی سرحدیں شروع ہو گئیں۔ دل مضطرب تھا اور اشتیاق کا عالم یہ تھا کہ سورج غروب ہونے سے قبل ہم سمرقند پہنچ جائیں کیونکہ ہم نے تاشقند میں ہی یہ طے کیا تھا کہ شہر جانے سے قبل ہمیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مقدس پر حاضری دینی ہے۔

امام بخاری کمپلکس:

امام بخاری کمپلیکس چونکہ سمرقند شہر سے تقریباً پچیس کیلومیٹر آگے ہے۔ وہاں سے ہمیں واپس سمرقند آنا تھا۔ شاہ رخ اور احمد صاحبان میرے اشتیاق کو شاید بھانپ گئے تھے اس لیے وہ بغیر کہیں رکے سیدھے امام بخاری کمپلکس لے کر پہنچے۔ ابھی عصر کی نماز میں کافی وقت تھا۔ گاڑی اسی احاطے میں بنی پارکنگ میں کھڑی کی گئی۔ یہاں سے گنبد نظر آرہے تھے میں نے دل دل میں امام بخاری کی بارگاہ میں سلام عقیدت پیش کیا۔ مزار کی جانب جو اندرونی سڑک تھی اس کے دونوں جانب دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر تو مجھے ہندستان جیسا لگا کیونکہ یہاں کی دکانیں بھی زیادہ تر تبرکات کی دکانیں تھیں بس فرق یہ تھا کہ یہاں پھول اور چادر کی دکانیں نہیں تھیں۔ خیر ہم مین دروازے تک پہنچ گئے جہاں کئی زبانوں میں بورڈ لگے ہوئے تھے جن میں زیارت کے آداب لکھے ہوئے تھے۔ ہم نے غور سے پڑھا جس میں خاص طور پر لباس اور آداب زیارت سے متعلق ہدایات تھیں۔ دروازے پر اندر جانے کے لیے ٹکٹ کھڑکی تھی جہاں سے ہم نے ٹکٹ لیے۔ غیر ملکیوں کے لیے کچھ زیادہ رقم دینی ہوتی ہے اور مقامی لوگوں کے لیے کم، زیادہ تر زیارت گاہوں پر مقامی افراد کے لیے داخلہ مفت ہے۔ خیر سیکورٹی چیک کے بعد اندر داخل ہوئے۔ یہ بہت بڑا احاطہ ہے کچھ دوری پر عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ وضوخانے اور طہارت خانے بنے ہوئے تھے۔ ہم وضو کر کے ایک بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ سامنے امام بخاری کا روضہ نظر آیا۔ ہم نے تصویروں میں پہلے دیکھ رکھا تھا اب اپنی اصل آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور اللہ کا شکر ادا

کررہا تھا کہ اپنے محبوب بندے کی بارگاہ میں آنے کا شرف بخشا۔ یہ عمارت چاروں طرف سے الگ الگ عمارات کا حصہ ہے سامنے دوسو میٹر کی دوری پر امام بخاری کا مزار اور گنبد ہے دائیں جانب وسیع وعریض مسجد ہے اور بائیں طرف میوزیم ہے۔ امام بخاری کا مزار اندورونی حصے میں ہے۔ باہر سے جو مزار دیکھائی دیتا ہے وہ دراصل ایک علامت کے طور پر ہے اسی کے نیچے اصل مزار ہے جہاں سب کو جانے کی اجازت نہیں۔ زائرین گنبد کے سامنیچے بنے مزار کے قریب جا کر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ اس کے تین طرف دالان نما عمارت بنی ہے جہاں زائرین کے لیے تلاوت یا فاتحہ پڑھنے کی جگہ بنی ہوئی ہے۔ ازبکستان کی خاص بات یہ ہے کہ ہر مزار کے پاس اس طرح کی جگہ بنی ہوئی ہے جہاں حکومت کی جانب سے خدام متعین ہیں۔ زائرین عام طور پر مزار کے قریب سلام کر کے گزرتے ہیں اور اس جگہ اجتماعی فاتحہ پڑھتے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جب جگہ پُر ہو جاتی ہے تو خادم قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور فاتحہ پڑھتے ہیں، اس کے فوراً بعد دوسرا گروپ آجاتا ہے۔ یہ انتظام بہت اچھا لگا۔ میں بھی اجتماعی دعا میں شریک ہوا۔ اس کے بعد خادم سے فارسی زبان میں بات کی، مجھے پہلے ہی بتایا گیا تھا کہ سمرقند اور بخارا میں کچھ لوگ فارسی زبان جانتے ہیں خاص طور پر جو تاجکی نسل کے ہیں۔ اس لیے میں نے قیاساً فارسی میں بات کی اتفاق تھا کہ وہ فارسی جانتے تھے میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا ہم اندرونی حصے میں جاسکتے ہیں جہاں مزار واقع ہے۔ پہلے تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگے پھر پوچھا آپ کہاں سے ہیں؟ میں نے دہلی کا ذکر کیا تو وہ ایک بیرونی مہمان سمجھ کر بڑے اخلاق سے پیش آئے اور کہا یوں تو اجازت نہیں، آپ چاہیں تو جاسکتے ہیں مگر ابھی ممکن نہیں کیونکہ لوگوں کا اژدہام ہے یا تو مغرب کے فوراً بعد یا فجر کے وقت تشریف لائیں۔ میرا دل چاہا کہ مغرب تک رک جائیں مگر ہمارے ساتھی کا خیال آیا کیونکہ دو گھنٹے یہاں رکنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ ابھی بات ہو ہی رہی تھی کہ عصر کی اذان ہونے لگی ہم مسجد کی جانب چلے۔ یہ بہت خوبصورت مسجد تھی اندر گنبد پر دیدہ زیب نقش ونگار بنے تھے۔ مسجد کے امام کو دیکھا جو خاص صوفیانہ لباس پہنے ہوئے تھے ان کے چہرے پر ایک خاص طرح کی

نورانیت تھی۔ جماعت سے نماز پڑھی سلام کے بعد وہ انھوں نے مقتدیوں کی جانب رخ کر کے پہلے کچھ وظیفے پڑھے اس کے بعد دعا کی، میں اٹھنے ہی والا تھا کہ مؤذن صاحب ان کے مصلے کے پاس پہنچے اور انھوں نے بآواز بلند کچھ آیتیں اور وظائف کا ورد کیا اس کے بعد دوبارہ دعا ہوئی۔ اب میں اپنی جگہ سے اٹھ چکا تھا لیکن دیکھا کہ سب لوگ ابھی بھی مصلیٰ پر بیٹھے ہوئے ہیں تو میں بھی بیٹھ گیا۔ امام صاحب نے پھر کچھ وظائف کا ورد کیا اس کے بعد تیسری دفعہ دعا ہوئی تب لوگ اٹھے۔ کچھ لوگوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا، میں نے بھی اگلی صف کے مصلیوں سے مصافحہ کیا۔ مسجد کے باہر آتے ہی سامنے ایک حوض تھا جس کے کنارے فوارے لگے ہوئے تھے، بہت سے مردوں اور عورتوں کو دیکھا کہ وہ اس سے پانی پی رہے ہیں۔ شاید متبرک مقام سمجھ کر ایسا کر رہے تھے، مجھے بھی پیاس لگی تھی سو میں نے بھی پانی پیا، پانی کا مزہ بہت اچھا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ امام بخاری کے مزار پر سلام کے لیے حاضر ہوا اس کے بعد قرآن میوزیم جو اسی احاطے میں واقع ہے اس کی زیارت کر کے باہر آئے۔

سمرقند میں مختصر قیام:

لولا صاحبہ نے سمرقند میں پروفیسر جمعہ صاحب کو فون کر کے میری آمد کی اطلاع دی تھی اور یہ زحمت بھی دی تھی کہ وہ ہمارا سرقند میں خیال رکھیں۔ شہر پہنچ کر شاہ رخ صاحب نے ان سے بات کی شہر میں کسی جگہ ملنے کو کہا، کچھ دیر میں ان سے ملاقات ہوئی وہ بڑے خلوص اور اخلاق سے ملے پھر ساتھ آنے کو کہا ان کے ساتھ ہم ایک ہوٹل پہنچے جہاں انھوں نے ہمارے لیے ایک کمرہ بُک کرا رکھا تھا۔ کمرے کو دیکھنے کے بعد لگا کہ اس کا کرایہ بہت ہوگا مگر یہ توقع سے بھی بہت کم تھا۔ ہوٹل میں سامان رکھ کر پروفیسر جمعہ کو رخصت کیا۔ اس ہوٹل سے قریب ہی تقریباً تمام اہم مقامات تھے۔ سامان رکھ کر ہم 'بازار سیاب' جو صدیوں پرانا بازار ہے، یہ بازار سلک روٹ کی وجہ سے صدیوں پہلے یہاں بنا تھا۔ سلک روٹ کو کئی اعتبار سے اہمیت ہے یہ قدیم تہذیبوں کی ترقی اور جدید دنیا کی ترقی کا اشاریہ سمجھا جاتا ہے۔ دائرۃ المعارف کے مطابق:

''عہدِ قدیم (Ancient Ages) کے ان تجارتی راستوں کو مجموعی طور پر شاہراہ ریشم (انگریزی:Silk Road یا Silkroute) کہا جاتا ہے جو چین کو ایشیائے کوچک اور بحیرۂ روم کے ممالک سے ملاتے ہیں۔ یہ گزرگاہیں کل 8 ہزار کلو میٹر (5 ہزار میل) پر پھیلی ہوئی تھیں۔ شاہراہ ریشم کی تجارت چین، مصر، بین النہرین، فارس، برصغیر اور روم کی تہذیبوں کی ترقی کا اہم ترین عنصر تھی اور جدید دنیا کی تعمیر میں اس کا بنیادی کردار رہا ہے۔ شاہراہ ریشم کی اصطلاح پہلی بار جرمن جغرافیہ دان فرڈیننڈ وون رچٹوفن نے 1877ء میں استعمال کی تھی۔ اب یہ اصطلاح پاکستان اور چین کے درمیان زمینی گزرگاہ شاہراہ قراقرم کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ مغرب سے شمالی چین کے تجارتی مراکز تک پھیلی یہ تجارتی گزرگاہیں سطح مرتفع تبت کے دونوں جانب شمالی اور جنوبی حصوں میں تقسیم ہیں۔ شمالی راستہ بلغار قپچاق علاقے سے گذرتا ہے اور چین کے شمال مغربی صوبے گانسو سے گذرنے کے بعد مزید تین حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جن میں سے دو صحرائے ٹکلا مکان کے شمال اور جنوب سے گذرتے ہیں اور دوبارہ کاشغر پر آ کر ملتے ہیں جبکہ تیسرا راستہ تین شان کے پہاڑوں کے شمال سے طرفان اور الماتی سے گذرتا ہے۔ یہ تمام راستے وادیٔ فرغانہ میں خوقند کے مقام پر ملتے ہیں اور مغرب میں صحرائے کراکم سے مرو کی جانب جاری رہتے ہیں اور جہاں جلد ہی جنوبی راستہ اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایک راستہ آمو دریا کے ساتھ شمال مغرب کی جانب مڑ جاتا ہے جو شاہراہ ریشم پر تجارت کے مراکز بخارا اور سمرقند کو استراخان اور جزیرہ نما کریمیا سے ملاتا ہے۔ یہی راستہ بحیرۂ اسود، بحیرۂ مرمرہ سے بلقان اور وینس تک جاتا ہے جبکہ دوسرا راستہ بحیرۂ قزوین اور قفقاز کو عبور کر کے جارجیا سے بحیرۂ اسود اور پھر قسطنطنیہ تک پہنچتا ہے۔ شاہراہ ریشم کا جنوبی حصہ شمالی ہند سے ہوتا ہوا ترکستان اور خراسان سے ہوتا ہوا بین النہرین اور اناطولیہ پہنچتا ہے۔ یہ راستہ جنوبی چین سے ہندوستان میں داخل ہوتا ہے اور دریائے برہم پترا اور گنگا کے میدانوں سے ہوتا ہوا بنارس

کے مقام پر جی ٹی روڈ میں شامل ہو جاتا ہے۔ بعد ازاں یہ شمالی پاکستان اور کوہ ہندوکش کو عبور کر کے مرو کے قریب شمالی راستے میں شامل ہو جاتا ہے۔ بعد ازاں یہ راستہ عین مغرب کی سمت اپنا سفر جاری رکھتا ہے اور شمالی ایران سے صحرائے شام عبور کرتا ہوا لیونت میں داخل ہوتا ہے۔ یہاں سے بحیرہ روم میں بحری جہازوں کے ذریعے سامان تجارت اٹلی لے جایا جاتا تھا جبکہ شمال میں ترکی اور جنوب میں شمالی افریقہ کی جانب زمینی قافلے بھی نکلتے تھے۔''

(بحوالہ: آزاد دائرۃ المعارف)

اسی سلک روٹ پر واقع یہ قدیم 'بازار سیاب' کے نام سے جانا جاتا ہے اب اس میں کچھ تبدیلی آ گئی ہے لیکن جگہ وہی ہے۔ اسی کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کی۔ سامنے ہی سڑک کی دوسری جانب صدر ازبکستان اسلام کریموف کا مقبرہ اور اسی سے متصل مسجد خضر تھی جو کافی بلندی پر واقع ہے۔ چونکہ یہ چھوٹی پہاڑی کا سلسلہ ہے۔ ہم نے اندر جانے کا ارادہ کیا مگر گیٹ بند ہو چکا تھا اس لیے سڑک کی دوسری جانب اندر جاتی ہوئی سڑک کی طرف چل پڑے دور سے ہی امیر تیمور کے عہد کی جامع مسجد جو بی بی خانم مسجد کے نام سے مشہور ہے کے نیلے گنبد و مینار نظر آئے اور دوسری جانب بی بی خانم کا مقبرہ۔ شام کے وقت اس کا نظارہ بڑا دلفریب تھا۔ مینار کی بلندی اور گنبد کی جلوہ ریزی اس ملک کی شاندار ماضی کی داستان سنا رہی تھی۔ ہم نے ٹکٹ لیا اور جامع مسجد میں داخل ہوئے۔ اردو ویکی پیڈیا دائرۃ المعارف کے مطابق

''بی بی خانم مسجد ازبکستان کی مشہور تاریخی مسجد ہے جو 14 ویں صدی کے عظیم فاتح امیر تیمور نے اپنی اہلیہ سے موسوم کی تھی۔ تیمور نے 1399ء میں ہندوستان کی فتح کے بعد اپنے نئے دارالحکومت سمرقند میں ایک عظیم مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بنایا۔ اس مسجد کا گنبد 40 میٹر اور داخلی راستہ 35 میٹر بلند ہے۔ جبکہ دوسری روایت کے مطابق بی بی خانم مسجد امیر تیمور کی بیویوں میں سے ایک نے اس وقت تعمیر کروائی تھی جب وہ جنگ پر نکلے ہوئے تھے۔ یہ مسجد انیسویں صدی

میں زلزلے میں تباہ ہوگئی تھی جو بعد میں 1970 کی دہائی میں بحال کی گئی۔اس مسجد کی تعمیر 1399ء میں شروع اور 1404ء میں مکمل ہوئی۔''

سڑک کی دوسری جانب بی بی خانم کا مقبرہ ہے جس میں امیر تیمور کی دو بیویوں اور ان کی خاص خادمہ کی قبریں ہیں۔اسی سڑک سے ایک کیلومیٹر کی دوری پر سمرقند کی مشہور عمارت ریگستان اسکوائر میں مسجد و مدرسہ ہے۔چونکہ رات ہو چکی تھی اس لیے ریگستان جانے کا پروگرام ملتوی کیا۔

اس کے بعد احمد اور شاہ رخ کے ساتھ سمرقند شہر کا رستے ہی گھومتے رہے۔کچھ دیر بعد احمد صاحب نے ایک ریسٹورینٹ کے سامنے کار روکی اور کہا یہیں کھانا کھائیں گے۔یہ بہت بڑا ریسٹورینٹ تھا جو سیاحوں سے بھرا پڑا تھا۔ہمیں باہر ہی سائبان میں بیٹھنے کو جگہ ملی۔رات ہو چکی تھی اور خنکی بڑھ گئی تھی دیکھا کہ جو بھی سیاح سائبان میں لگی کرسیوں پر بیٹھ رہے تھے ان کے لیے ویٹر پہلے کمبل نما چادر لا کر ان کو بڑے اہتمام سے اوڑھا رہے تھے۔اس کے بعد کھانے کا آڈر لیتے۔ یہاں کے کھانے بہت مشہور ہیں اسی لیے زیادہ تر سیاح یہاں کھانے کے لیے آتے ہیں۔کھانے کے بعد ہم ہوٹل پہنچے اور آرام کیا۔احمد صاحب کسی دوست کے یہاں چلے گئے، میں اور شاہ رخ ایک ساتھ رکے۔

شاہ زندہ:

صبح طے شدہ وقت پر ہم تیار ہوئے پہلے ہم شاہ زندہ کمپلکس پہنچے۔سمرقند میں شاہ زندہ کا احاطہ بہت وسیع و عریض علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔یہ احاطہ حضرت قثم بن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت سے 'شاہ زندہ' کہلاتا ہے۔آپ حضور اکرم ﷺ کے چچازاد بھائی تھیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہاں تشریف لائے۔مشرق وسطیٰ میں دین اسلام کی تبلیغ کے لیے سب سے پہلے آپ کی ہی آمد ہوئی۔آپ نے عمر کے آخری حصے تک دین کی تبلیغ کی اور یہیں شہادت پائی۔آپ کے حوالے سے مشہور ہے کہ اس وقت کے حاکم وقت نے آپ کو قید کرنے اور پھانسی کا حکم دیا۔جب سپاہی قریب آئے تو یہ اپنے حجرے سے باہر نکلے اور حجرے کے

قریب ہی ایک کنواں بنوایا تھا جس سے لوگ سیراب ہوتے تھے جونشیب میں واقع تھا، اس کنویں کی جانب اترے اس کے بعد پھر نظر نہیں آئے، اسی لیے انہیں شاہ زندہ کہا جاتا ہے۔ اس احاطے میں ان کا کوئی مقبرہ نہیں ہے بلکہ عبادت کرنے کا حجرہ اوراسی کے ساتھ منسلک مسجد ہے جہاں لوگ جاتے ہیں اور فاتحہ پڑھتے ہیں۔ وہ کنوان بھی موجود ہے لیکن عام لوگوں کو بتایا نہیں جاتا اور اسے ڈھک دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پیغمبر حضرت خضر علیہ السلام تشریف لائے اور انھوں نے حضرت قثم رضی اللہ عنہ کے روپوش ہونے میں رہبری کی۔ (واللہ اعلم بالصواب) اسی لیے اس احاطے سے کچھ دوری پر جو مسجد واقع ہے اسے مسجد خضر کہتے ہیں۔

اس احاطے میں سینکڑوں قبریں ہیں یہاں تیمور کے حکم سے بہت سے مقبرے گنبدوں کے ساتھ بنائے گئے ہیں۔ یہ سڑک کے کنارے سے پہاڑ کی بلندی کی جانب ہے اسی لیے حضرت قثم بن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالی عنہ کا حجرہ سب سے بالائی حصے میں ہے۔ اس پر جانے والی سیڑھیوں کے حوالے سے مشہور ہے کہ اوپر جاتے وقت یہ 36 سیڑھیاں ہوتی ہیں اور اترتے وقت 37 سیڑھیاں۔ میں نے بھی کوشش کی کہ گنا جاسکے مگر ممکن نہ ہوسکا۔ اب اس میں کتنی سچائی ہے یہ نہیں کہا جاسکتا مگر یہ بات یہاں بہت مشہور ہے۔

مسجد خضر:

شاہ زندہ سے متصل ہی مسجد خضر ہے۔ یہ دونوں مقامات بلندی پر واقع ہیں یہ چھوٹی پہاڑی ہے۔ دونوں عمارتوں کے درمیان اس چھوٹی پہاڑی پر قدیم قبرستان ہے۔ ویسے ازبکستان میں زیادہ تر قبرستان چھوٹی پہاڑیوں پر ہی ہیں۔ خیر بلندی کی طرف جاتے ہوئے اور عمارت کی کئی سیڑھیوں کو طے کرنے کے بعد ہم اس کمپلکس کے اندر داخل ہوئے۔ بائیں جانب مسجد خضر ہے۔ روایت ہے کہ یہاں اسلام کی آمد سے قبل بت خانہ تھا جسے منہدم کر کے مسجد بنائی گئی ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہاں حضرت خضر علیہ السلام تشریف لائے تھے ان کی تشریف آوری کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت قثم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سزائے موت سنائی گئی تھی تو حضرت خضر

نے ہی اللہ کے حکم سے ان کی روپوشی میں مدد کی تھی۔ اسی لیے اس مسجد کا نام شروع سے ہی مسجد خضر ہے۔ یہ مسجد بہت بڑی نہیں ہے لیکن مسجد کی آخری دیوار کے دونوں جانب دو چھوٹے چھوٹے حجرے بنے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام یہاں عبادت کرتے تھے۔ ان میں ایک حجرے میں ایک عصا رکھا ہوا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت خضر کا عصا ہے۔ روایت یہ ہے کہ مسجد کی تعمیر کے وقت حضرت خضر کا یہ عصا کہیں گم ہو گیا تھا بعد میں تاشقند میں مقیم ایک خاتون جو اپنے وقت کی ولیہ تھیں، ان کے خواب میں حضرت خضر نے اس عصا کی نشاندہی کی۔ اس خواب کے بعد وہ سمرقند آئیں، ان کی نشاندہی پر یہ عصا کہیں زمین کے اندر موجود تھا اس کی بازیافت ہوئی۔ (واللہ اعلم بالصواب)۔ اسی لیے یہ مسجد حضرت خضر کے نام سے موسوم ہے۔ بڑی تعداد میں زائرین یہاں آتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں، اب بھی دونوں حجرے موجود ہیں۔ ایک عورتوں کے لیے اور دوسرا مردوں کی عبادت کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اللہ نے اس مسجد کی زیارت کی مجھے توفیق دی۔ دو رکعت نفل ادا کر کے اسی سے متصل سابق صدر ازبکستان اسلام کریموف کے مزار کے پاس گیا جہاں تصویر لینے کی سخت ممانعت تھی۔ یہاں ایک وسیع احاطے میں ہر جگہ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ زائرین آتے اور اپنی جگہ لیتے، جب ساری جگہیں پُر ہو جاتیں تو اسی قاعدے کے مطابق اجتماعی فاتحہ خوانی ہوتی۔

ریگستان اسکوائر:

مسجد خضر سے نشیب میں سڑک کی دوسری جانب چل کر اس سڑک پر پہنچے جہاں بی بی خانم مسجد واقع ہے یہی سڑک ریگستان کو جاتی ہے اکثر لوگ پیدل ہی جا رہے تھے۔ ہمیں دوری کا اندازہ تھا اس لیے بیٹری والی گاڑی سے وہاں تک پہنچے۔ ریگستان کا لفظ سننے اور پڑھنے میں کچھ اور تصور قائم ہوتا ہے لیکن یہاں معاملہ بالکل جداگانہ تھا۔ ایک وسیع و عریض میدان کے تینوں جانب بلند و بالا اور شاندار مسجد و مدرسہ کی عمارتیں واقع ہیں۔ یہ کمپلکس ازبکستان کی ایک شناخت بھی ہے۔ اسے ریگستان اسکوائر بھی کہتے ہیں۔ لیکن عام زبان میں یہ ریگستان کے نام سے ہی جانا جاتا

ہے۔اس میدان میں تین الگ الگ عمارتیں ہیں۔

دائیں جانب ''مدرسہ الغ بیگ'' سامنے ''مدرسہ شیر دار'' اور درمیان میں ''مسجد طلا کاری'' ہے۔ مدرسہ الغ بیگ 1417 میں تعمیر ہوا اس میں پچاس کمرے ہیں۔ ہر کمرے میں دو طالب علم رہتے تھے، دن میں یہی درسگاہ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ یہ اس وقت کی سب سے عظیم دانشگاہ تھی یہاں جدید مذہبی تعلیم کے علاوہ اس کے وقت کے مروجہ علوم وفنون کی تعلیم ہوتی تھی اس عہد کے عظیم شاعر، فلسفی، ماہر فلکیات اور دانشوروں کا تعلق اسی مدرسے سے تھا اسی لیے اس کو اُس عہد کا عظیم سائنسی درسگاہ کا درجہ حاصل تھا۔ شیر دار مدرسہ 1619 میں سمرقند کے مشہور سیاست داں شیر دار خان نے بنوایا۔ اس مدرسے کے بڑے دروازے پر شیر کا نشان بنا ہوا ہے۔ طلا کاری مدرسہ و مسجد بھی اسی کی تعمیر کردہ ہے جس کی تعمیر 1646 میں شروع ہوئی اور 1660 میں مکمل ہوئی۔ اس مسجد کے محراب اور گنبد میں خالص سونے سے نقاشی کی گئی ہے اسی لیے اسے طلا کاری کہا جاتا ہے۔ اسے احاطے میں ایک باغ بھی ہے جو انواع واقسام کے پھولوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس احاطے میں داخل ہوں تو آنکھیں خیرہ رہ جاتی ہیں کہ اس زمانے میں اتنی عظیم الشان عمارتیں کیسے بنوائی گئی ہوں گی۔ اب تو ان مدرسوں کے کمرے دکانوں میں تبدیل ہو گئے ہیں اور اب یہ خالصتاً سیاحتی مرکز بن گیا ہے۔ یہاں موجود دکانیں ازبکستان کی صنعت کاری سے متعلق ہیں یہ جدید طرز کا بازار نہیں ہے۔ اس کو دیکھنے کے لیے دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں اور یہ اب عالمی ورثے میں شمار ہوتا ہے۔

امیر تیمور کا مقبرہ:

ازبکستان کو امیر تیمور نے بہت کچھ دیا اس کے عہد میں جتنی عمارتیں بنی ہیں شاید اور کسی حکمراں کے عہد میں نہیں بنیں۔ تیمور کا شمار دنیا کے عظیم فاتحوں میں ہوتا ہے۔ سمرقند میں واقع امیر تیمور کا مقبرہ بھی زائرین کی توجہ کا مرکز ہے۔ اسی طرز کے گنبد و مینار بنے ہوئے ہیں لیکن اندرونی گنبد پر جو نقش ونگار ہیں وہ حیرت زدہ کرتے ہیں۔ سونے اور دیگر قیمتی دھاتوں سے نقش ونگار

بنائے گئے ہیں۔اس میں امیر تیمور کے علاوہ ان کے خاندان کے افراد کی قبریں موجود ہیں۔اس مقبرے کی تعمیر میں کافی خرچ کیا گیا ہے۔

اللہ کے نبی حضرت دانیال علیہ السلام کے مزار مبارک پر:

سمرقند کے بیرون شہر پہاڑی پر یہ مقام واقع ہے۔اس کے نیچے خوبصورت نہر بہہ رہی ہے۔اس کے قریب ہی ایک چشمہ ہے جو مستقل جاری ہے۔ یہ چشمہ بھی لوگوں کی عقیدت کی جگہ ہے ہر زیارت کرنے والے اس کا پانی پیتے ہیں، اس پانی کو شفا مانتے ہیں۔مسلم، عیسائی اور یہودی تینوں اقوام حضرت دانیال کو اپنا نبی مانتے ہیں اسی لیے مسلمانوں کے علاوہ وہ بھی بڑی تعداد میں زیارت کے لیے آتے ہیں۔حضرت دانیال کی قبر انور کے بارے میں اختلاف ہے۔میں خود مصر کے قدیم شہر اسکندریہ میں حضرت دانیال کے مزار پر حاضری دے چکا ہوں۔ وہاں ان کی قبر مبارک کے ساتھ حضرت لقمان کی بھی قبر ہے لیکن سمرقند میں ان کی قبر کی لمبائی سترہ میٹر ہے۔

حضرت دانیال کی قبر کی لمبائی سترہ میٹر کیوں ہے؟ اس کے متعلق ایک روایت یہ ہے کہ بادشاہ کے حکم سے اتنی لمبی قبر بنائی کیونکہ عیسائی، یہودی سب عقیدت کرتے تھے اور کچھ لوگ پوجنے بھی لگے تو بادشاہ نے کسی اور جگہ سے منتقل کر کے قبر یہاں بنوائی اور لمبائی اتنی رکھی تا کہ کسی کو اصل قبر کس جگہ ہے اس کا علم نہ ہو سکے۔حضرت دانیال کی قبر مبارک کے حوالے سے ایران کے علاقہ شوش میں بھی دعوی کیا جاتا ہے۔

حضرت دانیال علیہ السلام کے مزار مبارک کے پائین میں واقع ایک چشمہ ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس پانی میں شفا ہے اسی لیے یہاں ہر وقت ہجوم رہتا ہے اور بلا امتیاز مذہب و ملت لوگ اس پانی کو پیتے ہیں اور بوتلوں میں بھر کر بھی لے جاتے ہیں۔مزار مبارک پہاڑی کی بلندی پر ہے اور یہ چشمہ اسی کے نیچے کچھ دوری پر جاری ہے۔مزار کے احاطے میں ایک پرانا درخت ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہزاروں سال پرانا درخت ہے اور اس درخت کے سامنے لوگ منتیں مانگتے نظر آئے۔

بخارا روانگی:

سمرقند میں حالانکہ اور بھی کئی مقامات تھے مگر ہمارے پاس وقت کم تھا شام سے پہلے بخارا پہنچنا تھا اس لیے دوپہر کا کھانا کھانے کے فوراً بعد ہم بخارا کی جانب روانہ ہوئے اسی شاہراہ ریشم پر چلتے ہوئے اسی طرح کے دلفریب نظارے اور دلکش قدرتی مناظر، پستہ، بادام، اسٹابیری، چیری، خوبانی اور انواع واقسام کی کھیتیوں سے لہلہاتی سرزمین۔لیکن اس سرزمین کی روحانی کشش بھی تھی کہ راستے کا احساس بھی نہ ہوا اور تقریباً دوسوستر کیلومیٹر کا راستہ کب اور کیسے طے ہوا پتا ہی نہ چلا۔

بخارا جانے کا ایک اور بھی مقصد تھا۔ اورینٹل اسٹڈیز میں لولا صاحبہ سے دوران گفتگو ازبکستان کی شادی کا ذکر آیا تو میں نے بڑے اشتیاق سے یہاں کی رسم ورواج کے بارے میں دریافت کیا۔لولا صاحبہ نے کہا کہ کیا آپ ازبکستان کی شادی دیکھنا چاہتے ہیں؟ میں نے فوراً ہاں کردی توانھوں نے دوسرے دن مجھے بتایا کہ آپ کے لیے ہم نے ایک پلان مرتب کیا ہے۔پھر یہ طے ہوا کہ ہم سمرقند ہوتے ہوئے 2 مئی کو بخارا جائیں گے۔

اصل میں انھوں نے اپنے ایک طالب علم رمزالدین سے بات کی ان کے بھائی کی شادی ہورہی تھی سوانھوں نے اس میں شریک ہونے کی دعوت ان کے توسط سے مجھے دی اور بخارا میں مقیم ان کے طالب علم رمزالدین جوابھی پونا، انڈیا سے بی۔بی۔اے کا کورس کر رہے ہیں، انھیں کے گھر قیام کا انتظام کیا اس طرح میں نے بخارا کی روحانی سیر بھی کی اور ازبکستان میں شادی کی رسوم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی سکا۔ پروگرام کے مطابق ہم 2 مئی کی شام رمزالدین کے گھر پہنچ گئے۔احمد صاحب ہمیں رخصت کر کے اپنے گھر کو چلے گئے۔رمزالدین کے اہل خانہ نے ہمارا پُر تپاک خیر مقدم کیا۔ایک غیر ملکی مہمان کی آمد پر گھر کے سبھی افراد خوش تھے۔

دل کو چھو جانے والی چند رسمیں:

مہمان خانے میں ہمیں عزت سے بیٹھایا گیا۔ عام طور پر ازبکستان میں کمرے میں کوئی فرنیچر نہیں ہوتا۔میں نے ایران میں بھی ایسا ہی دیکھا ہے۔فرش پر دبیز قالین بچھی ہوئی تھی اور

کمرے کے چاروں طرف آرام دہ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی دسترخوان سجا دیا گیا انواع واقسام کے میوے، چاکلیٹ، شیرینی اور ازبکی روٹیاں اور گرین چائے سے ضیافت ہوئی۔ لیکن جو بات مجھے بالکل نئی اور بہت اچھی لگی وہ یہ تھی کہ میرے بیٹھتے ہی دعا کرنے کو کہا گیا میں سمجھا نہیں لوگوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دئے سو میں نے کچھ دعائیں پڑھیں۔ اس کے بعد جو بھی ملنے آتے سلام اور مصافحہ کے بعد میرے قریب بیٹھ جاتے اور دعا کے لیے کہا جاتا۔ میرے ہمراہ شاہ رخ نے بتایا کہ سر یہ ہمارا دستور کے ہے کہ گھر میں جب بھی کوئی آتا ہے تو سب مل کر خیر کی دعا کرتے ہیں اور آنے والا اگر بڑا ہے تو ان سے دعا کے لیے کہا جاتا ہے یا محفل میں جو سب سے اہم ہوتے ہیں ان سے دعا کے لیے کہا جاتا ہے۔ واہ واہ! یہ رسم دیکھ کر دل بہت خوش ہوا میں نے کسی اسلامی ملک میں بھی ایسی رسم نہیں دیکھی ہے۔ اللہ سلامت رکھے اس ملک کو اور اس ملک کے باشندوں کو۔

کچھ دیر ہم نے گفتگو کی اور آرام کیا مغرب بعد رمزالدین کے چچا تشریف لائے، ان کے آتے ہی دعا ہوئی اور بڑی محبت سے باتیں ہوئیں۔ نہ میں ان کی زبان سمجھتا تھا اور نہ وہ میری زبان سمجھتے تھے مگر خدا بھلا کرے شاہ رخ کا کہ وہ سائے کی طرح ہمارے ساتھ رہے اس لیے ان کے توسط سے ہماری باتیں ہوتی رہیں ہم اردو بولتے تھے اور شاہ رخ ازبکی میں اس کا ترجمہ کرتے تھے۔ پھر ان کے ساتھ رات میں بخارا شہر گھومنے کا پلان بنا۔ رمزالدین کا گھر بخارا کے نئے علاقے میں واقع تھا جو پرانے شہر سے کچھ دوری پر تھا۔ بخارا پہنچ کر اندازہ ہوا کہ کتنی تیزی سے اس شہر کی توسیع ہو رہی ہے اور بڑی بڑی کالونیاں بن رہی ہیں۔ لیکن مکانات کی زیب وزینت اور آرائش میں کوئی کمی نہیں جبکہ کہا جاتا ہے کہ ازبکستان کی اقتصادی حالت بہت اچھی نہیں لیکن ان کی رہائش کا معیار اور مکانات دیکھ کر کوئی ایسا نہیں کہہ سکتا۔ یہ کیسے ممکن ہوتا ہے اللہ ہی جانے۔

ان کے ہمراہ ہم بخارا کے لابی حوض پہنچے یہ قدیم عمارتوں کی جگہ ہے۔ اسی کے سامنے مدرسہ اور دیگر عمارات موجود ہیں اسی کے آس پاس قدیم بازار اور سرائے ہیں۔ رات کافی خوشگوار تھی کچھ دیر ہم تفریح کرتے رہے۔ رات کو دیر سے گھر واپس آئے رمزالدین کے گھر والوں نے پُر

تکلف کھانا بنا رکھا تھا۔ کھانے کے بعد یہ طے ہوا کہ صبح پانچ بجے رسم کے لیے دلہن کے گھر کے جانا ہے اس رسم کو 'مردانہ پلاؤ' کی رسم کہا جاتا ہے۔ اس لیے جلدی ہی سو گئے۔

مردانہ پلاؤ کی رسم:

ازبکستان میں ''مردانہ پلاؤ'' کی رسم ہے۔ میں بھی اس رسم کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس رسم کے مطابق لڑکے والے لڑکی کے گھر والوں اور رشتہ داروں کو صبح ناشتے کے وقت پلاؤ کی دعوت پر بلاتے ہیں۔ پلاؤ ازبکستان کی سب سے مرغوب، مشہور اور پسندیدہ غذا ہے۔ اس میں گوشت وغیرہ کے علاوہ ایک خاص پرندے کے چھوٹے چھوٹے اُبلے ہوئے انڈے شامل کیے جاتے ہیں۔ اس رسم کا مطلب یہ ہے کہ لڑکی کی رخصتی سے ایک دن قبل لڑکے والے دلہن کے گھر کے قریب کسی ہوٹل یا شادی گھر میں دعوت کا اہتمام کرتے ہیں، لڑکی والے اپنے رشتہ داروں کو دعوت دیتے ہیں اس دعوت میں مرد ہی شامل ہوتے ہیں البتہ لڑکی کی والدہ کے علاوہ قریبی خواتین موجود ہوتی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ میں نے جب دریافت کیا کہ اسے مردانہ پلاؤ کیوں کہا جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ پہلے اس دعوت میں صرف مرد شامل ہوتے تھے لیکن اب گزرتے وقت کے ساتھ کچھ تبدیلیاں آ رہی ہیں۔

دلہن کا گھر چونکہ دور تھا اس لیے ہم صبح پانچ بجے ہی روانہ ہوئے۔ سات بجے تک اس جگہ پہنچ گئے۔ گیٹ پر لڑکے اور لڑکی کے والد مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ ہم شاہ رخ کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ گئے۔ ہر جگہ گول میز ہی لگے ہوئے تھے جس کے ساتھ تقریباً آٹھ کرسیاں تھیں۔ ہم جب بیٹھے تو صرف دو تھے، لوگ آتے گئے اور تعداد بڑھتی گئی۔ ہماری میز پر ہر آنے والے پہلے دعا کرتے۔ بہت اچھا لگتا لوگ آتے سب کو سلام کرتے، بیٹھتے ہی دعا کی جاتی۔ کچھ دیر بعد کھانے کا سلسلہ شروع ہوا اور ساتھ ہی ایک شخص اسٹیج پر ازبکی نغمے گا رہا تھا۔ کھانے سے پہلے دولہے کو مخصوص لباس پہنایا گیا۔ عام لوگوں کے چلے جانے کے بعد گھر کی عورتوں نے خوب رقص کیا پھر محفل برخاست ہوئی۔ میں نے شاہ رخ سے پوچھا کہ یہاں تو لڑکی والوں کا گھر نزدیک تھا اس لیے

آئے اور واپس آ گئے اگر خدانخواستہ کسی دوسرے شہر میں ہو تو کیسے یہ رسم کی جاتی ہے۔شاہ رخ نے بتایا کہ دور ہو تب بھی لڑکے والے جاتے ہیں اور یہ رسم کر کے واپس آتے ہیں۔اس رسم کے بعد دلہن کو رخصت نہیں کیا جاتا بلکہ دوسرے دن رخصتی ہوتی ہے اور ان رسموں سے ایک ہفتہ پہلے ہی نکاح ہو جاتا ہے۔اس رسم کے بعد گھر کے لوگ واپس ہو گئے لیکن میں نے شاہ رخ صاحب کے ساتھ غجدوان میں واقع حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی کے مزار پر حاضری کا پروگرام بنایا جو یہاں سے قریب ہی تھا۔

سات خواجگان کا شہر بخارا

اس جگہ کا نام غجدوان ہے جو بخارا شہر سے تقریباً پچاس کیلومیٹر کی دوری پر ہے۔ یہ شہر خواجۂ دوجہان خواجہ عبدالخالق غجدوانی کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ان کے علاوہ ان کے سلسلے کے چھ اور خواجہ بخارا کے مضافات میں ہیں اسی وجہ سے بخارا کو سات خواجگان کا شہر کہا جاتا ہے۔خواجہ عبدالخالق غجدوانی علیہ الرحمۃ والرضوان ماوراء النہر کے عظیم مشائخ اور نقشبندی سلسلے کے پیر طریقت میں سے ایک ہیں۔ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی ولادت سے قبل ان کے والدین کو بشارت ہوئی تھی کہ تمہارے گھر ایک چراغ روشن ہونے والا ہے جو ایک عالم کو روشن کرے گا اور بشارت میں ہی ان کا نام عبدالخالق رکھنے کو کہا گیا تھا۔ان کی پیدائش کے کچھ ہی دنوں بعد ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو والدہ نے ان کو مفسر قرآن حضرت امام صدر الدین کی تربیت میں دیا۔ان کی وفات کے بعد آپ نے خواجہ یوسف ھمدانی سے بیعت وخلافت حاصل کی۔عمر بھر تبلیغ دین میں مصروف رہے آپ کی ولایت کے چرچے دور دور تک تھے اسی لیے بڑی تعداد میں لوگوں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی۔616 ہجری میں وفات پائی۔آپ کو خواجۂ دوجہان بھی کہا جاتا ہے۔ان کے مزار پر زائرین کی بڑی تعداد رہتی ہے۔ازبکستان کے علاوہ سینٹرل ایشیا سے لوگ جوق در جوق آتے ہیں۔ زائرین میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔دوسری جگہوں کے مزارت پر بھی میں نے عورتوں کی تعداد زیادہ دیکھی۔

یہاں سے حاضری کے بعد حضرت خواجہ انجیر فغنوی کے مزار پر حاضری ہوئی ہے یہ جگہ وہاں سے تقریباً بیس کیلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ وہیں سے دس کیلومیٹر کی دوری پر حضرت خواجہ عارف ریوگری کی بارگاہ میں حاضری کا موقع ملا۔ یہ جمعہ کا دن تھا اس لیے ہم لوگوں نے ارادہ کیا کہ حضرت خواجہ شیخ بہاء الدین نقشبندی کے مزار پر جائیں گے اور وہیں جمعہ کی نماز ادا کی جائے گی۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی رحمتہ اللہ علیہ کا مزار مبارک اوران کی والدہ محترمہ کا مزار مبارک ایک وسیع وعریض کیمپس میں واقع ہے جس میں عالی شان مسجد اور صوفی خانقاہ میوزیم موجود ہے۔ اس کے عقب میں قدیم قبرستان ہے جس میں نجانے کتنے اولیا واصفیا مدفون ہیں۔ یہ وہی عالی مرتبت بزرگ ہیں جن سے نقشبندیہ سلسلہ شروع ہوا، جن کا سلسلہ ہندستان اور پاکستان میں موجود ہے اور پوری دنیا میں کروڑوں لوگ اس سلسلے کے عقیدت مند ہیں۔ ان کی مختصر تفصیلات اردو وکی پیڈیا آزاد دائرۃ المعارف میں یوں درج ہے:

''خواجہ خواجگان بہاؤالدین نقشبند بخاری نقشبندی (پیدائش: نومبر 1327ء۔ وفات: 21 فروری 1390ء) مسلم صوفی سلسلہ نقشبندیہ کے بانی تھے۔ یہ سلسلہ پوری دنیا میں سب سے زیادہ مقبول اور بڑا سلسلہ مانا جاتا ہے۔ سلسلہ مجددیہ، سلسلہ خالدیہ، سلسلہ سیفیہ اس کی مشہور شاخیں ہیں۔ آپ کا اسم شریف محمد اور والد گرامی کا نام بھی محمد ہے۔ آپ کا تعلق سادات خاندان سے ہے۔ اسلامی تاریخی شہر بخارا سے تین میل کے فاصلہ پر قصر ہندواں نیا نام قصر عارفاں نامی قصبہ میں محرم الحرام 728 ہجری میں پیدا ہوئے۔ محمد بن محمد بہاؤالدین البخاری سلسلہ نقشبندیہ کے بانی ان کا لقب شاہ نقشبند (لفظی معنی: مصور) کی تشریح علم الٰہی کی لاثانی تصویر کھینچنے والا سے کی گئی۔ یا زیادہ صوفیانہ انداز میں اپنے دل میں کمال حقیقی کا نقش رکھنے والا۔ انہیں الشاہ کا جو لقب دیا گیا ہے اس سے مراد روحانی رہبر ہے۔ نسبت الاویسی سے یہ مراد ہے کہ ان کی نسبت

روحانی براہ راست حضرت سیدنا خضر علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ
سے تھی۔ بچپن ہی سے آپ کی پیشانی پر آثار ولایت وہدایت نمایاں تھے اور یہ
کیوں نہ ہوں جب کہ آپ کی ولادت سے بھی پہلے وہاں سے گذرتے ہوئے
قطب عالم محمد بابا سماسی نے فرمایا تھا کہ مجھے یہاں سے ایک مرد خدا کی خوشبو آتی
ہے۔ایک اور مرتبہ فرمایا اب وہ خوشبو زیادہ ہوگئی ہے اور جب آپ پیدا ہوئے
اور دعا کے لیے آپ کے پاس لائے گئے تو انہیں اپنی فرزندی میں قبول فرمایا اور
توجہات سے نوازا۔اس طرح شاہ نقشبند کی ابتدائی روحانی تربیت قطب عالم
بابا سماسی نے کی اور بعد میں آپ کو سید امیر کلال کے سپرد فرمایا۔گو آپ نے
ظاہری طور پر طریقت کی تعلیم وتربیت سید امیر کلال سے حاصل کی لیکن روحانی
طور پر آپ کی تربیت قطب عالم عبدالخالق غجدوانی نے اویسی طریقہ پر فرمائی۔
چنانچہ خود فرماتے ہیں میں اوائل احوال میں جذبات و بے قراری کے عالم میں
راتوں کو اطراف بخارا میں پھرا کرتا تھا اور ہر مزار پر جاتا تھا۔ایک رات میں
تین مزارات پر گیا۔آخر میں جس بزرگ کے مزار پر گیا وہاں حالت بے خودی
میں میں نے دیکھا کہ قبلہ کی جانب سے دیوار شق ہوگئی اور ایک بڑا تخت ظاہر ہوا
جس پر ایک بزرگ تشریف فرما تھے۔الغرض ایک شخص نے مجھے بتایا کہ یہ عبد
الخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔میں نے خواجہ کی خدمت میں سلام عرض کیا۔
آپ نے سلام کا جواب دیا اور وہ ارشادات فرمائے جو سلوک کے ابتدا اور
درمیان وانتہا سے تعلق رکھتے ہیں۔یعنی مکمل سلوک کی تعلیم دیدی۔اس موقع پر
تاکیدی طور پر آپ نے مجھے ارشاد فرمایا استقامت سے شریعت کے شاہراہ پر
چلنا۔کبھی اس سے قدم باہر نہ نکالنا۔عزیمت اور سنت پر عمل کرنا اور بدعت سے
دور رہنا۔اسی لیے مدت العمر آپ شریعت وسنت پر کاربند رہے اور اتباع

شریعت اور رسم و بدعت سے نفرت طریقہ عالیہ نقشبندیہ کی امتیازی علامات ہیں۔ نقشبندی سلسلہ آپ کی طرف منسوب ہے۔ طریقہ عالیہ نقشبندیہ کی تین اصطلاحات وقوف زمانی، وقوف عددی اور وقوف قلبی شاہ نقشبند قدس سرہ نے مقرر فرمائی ہیں اور آپ اویسی بھی ہیں کہ آپ کو روحانی نسب خواجہ عبدالخالق سے حاصل ہوئی۔ آپ کا وصال بروز پیر 3 ربیع الاول 791ھ مطابق 21 فروری 1390ء کو 73 برس کی عمر میں آبائی گاؤں قصر عارفاں میں ہوا۔ ان کی قبر پر ایک شاندار مزار تعمیر کیا گیا اور یہ بخارا کے قابل ذکر مقامات میں شامل ہے۔ مشہور یہ ہے کہ آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے جنازہ کے سامنے یہ شعر پڑھا جائے:

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو

شیئاً للّٰہ از جمال روئے تو

(ترجمہ: میرے مولیٰ میں ایک مفلس کی حیثیت سے آپکی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں، خدارا اپنا جلوہ جہاں آرا مجھے دکھادے۔) یہ تمام حوالے درجہ ذیل کتابوں سے لیے گئے ہیں۔

- اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد 22 صفحہ 435 دانش گاہ پنجاب لاہور
- البینات شرح مکتوبات، محمد سعید احمد مجددی، جلد اول، صفحہ 285، تنظیم الاسلام پبلیکیشنز گوجرانوالہ“

حسب پروگرام جمعہ کی نماز ہم نے یہیں پڑھی اتنی بڑی مسجد میں بھی اندر جگہ نہیں مل سکی اس لیے باہر ہر طرف بچھی دبیز قالین پر کسی طرح جگہ مل گئی۔ جو اچھی بات یہاں نظر آئی وہ یہ کہ فرض نماز کے بعد جس طرح برصغیر میں لوگ جلدی جلدی مسجد سے بغیر سنت پڑھے نکل جاتے ہیں وہ یہاں نہیں دیکھا ایک بھی شخص بغیر سنن ونوافل ادا کیے مسجد سے باہر نہیں گیا۔ نماز کے بعد باہر نکلتے ہوئے دیکھا کہ کچھ خواتین گھروں سے سموسے (سموسہ ازبکستان کا مشہور ڈش ہے ایسا لگتا ہے کہ ہندستان میں سموسے بنانے کا طریقہ یہیں سے آیا) بنا کر لائی تھیں جو نمازیوں میں تقسیم کر رہی

تھیں۔نماز سے قبل یہ بھی دیکھا کہ نمازیوں نے اپنے جوتوں کو جو بے ترتیب ادھر ادھر رکھا تھا کئی لوگوں نے ان تمام جوتوں کو سلیقے سے سیدھا کر کے رکھ دیا۔

جوتے سیدھا کرنے کا محاورہ اردو میں موجود ہے۔مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ چلواب تو جوتے بھی سیدھے کر دئے گئے۔اس کے علاوہ ہندستان میں رخصتی کے پان بھیجنے کی بھی رسم تھی۔خیر ہم نے اس محاورے کو مشاہدے کے طور پر کئی جگہ دیکھا۔آپ کسی کے گھر جائیں تو آپ عموماً جوتے اسی سمت میں کھولتے ہیں جس سمت سے آتے ہیں اور جاتے وقت جوتے سیدھے کرنے ہوتے ہیں۔ازبکستان میں مہمان نوازی بہت ہوتی ہے اس لیے چھوٹی چھوٹی چیزوں کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔لہٰذا گھر آئے مہمان جب اندر داخل ہوجاتے ہیں تو کوئی نہ کوئی باہر جا کر مہمانوں کے جوتے اور جوتیاں سیدھی کر کے رکھ دیتے ہیں تاکہ مہمان جب واپسی کے لیے دروازے پر آئیں تو انھیں جوتے سیدھے کرنے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔

ہم نے ان مقدس درباروں کی حاضری کے بعد دوسرے دن حسب پروگرام مزید چار خواجگان کے مزارت کی زیارت کا شرف حاصل کیا ان میں حضرت خواجہ علی رومیتانی، حضرت خواجہ بابا سماسی (جنہیں قطب عالم کہا جاتا ہے روحانی مرتبے میں آپ قطب کے مقام پر فائز تھے)، حضرت خواجہ سید امیر کالال یہ بزرگ حضرت بہاء الدین نقشبندی کے استاد تھے۔ان کا مزار حضرت بہاءالدین نقشبندی کے مزار مبارک سے تقریباً تین یا چار کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

دوسرے دن صبح سویرے ہم بخارا شہر دیکھنے نکلے۔شام کو شادی تقریبات تھیں اس لیے وقت کم تھا اور قابل دید مقامات بہت تھے لہٰذا ہم مخصوص مقامات کو ہی دیکھ سکے۔لابی حوض کے پاس ہم نے کار چھوڑ دی۔سب سے پہلے ہم بخارا کے قدیمی علاقے کو دیکھنے گئے۔دراصل یہ پُرانے گھر ہیں حکومت کی جانب سے یہاں مقیم لوگوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ ان گھروں کو توڑ کر نئے طرز کے مکانات تعمیر نہ کریں اس کے عوض انھیں حکومت کی جانب سے کئی طرح کی رعایتیں ملتی ہیں اسی لیے یہ تمام گھر بہت ہی پُرانے ہیں اور سب کے سب مٹی سے بنے ہیں۔دیکھنے میں

ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی گاؤں میں آگئے ہوں، گلیاں ویسے ہی شکستہ اور اندر کے راستے بالکل ویسے ہی محفوظ رکھے گئے ہیں۔ حکومت کا یہ قابل ستائش قدم ہے اس سے قدیم بخارا کی اصل تصویر دیکھنے کو ملتی ہے کہ اس زمانے میں بھی کیسے کیسے مکانات تعمیر ہوتے تھے۔ انھیں گلیوں کے درمیان ایک بزرگ کا مقبرہ بھی تھا۔ رمزالدین نے بتایا تھا کہ اسی پرانے مکانات کے درمیان ساتویں صدی ہجری کے ایک بہت بڑے بزرگ ہیں، مقامی لوگوں کو تو معلوم ہے لیکن بیرونی افراد یہاں تک نہیں پہنچ پاتے اس لیے آپ ان بزرگ کے مزار کی ضرور زیارت کریں، ان کا نام انھوں نے بندوق شاہ بتایا تھا۔ نام سننے میں ذرا تکلف ہوا کہ یہ جس وقت موجود تھے اس وقت بندوق تو موجود نہیں تھا تو ان کا نام بندوق شاہ کیسے ہوا؟ خیر ہم تلاش بسیار کے بعد وہاں پہنچ گئے۔ دروازے پر نام 'حضرت بند کشا' لکھا ہوا تھا، تب جا کر یہ عقدہ کھلا کہ بولنے میں یہ نام بگڑ کر بندوق شاہ ہو گیا ہے۔ یہ مزار ایک مکان کے اندر ہے۔ باہر سے بالکل نہیں لگتا کہ اس میں کوئی مزار بھی ہوگا کیونکہ یہ مکان اسی اصلی حالت میں برقرار رکھا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ان بزرگ کا حجرہ تھا ان کی رحلت کے بعد یہیں ان کا مزار بنایا گیا ہے۔ جب اس مکان کے اندر داخل ہوئے تو پہلے دو بزرگوں کے مزار تھے شاید یہ ان کے مریدین یا خلیفہ رہے ہوں گے۔ اس کے بعد اندر کمرے میں داخل ہوئے تو واقعی یہ ایک کمرہ ہی تھا وہاں دیوار سے متصل ان کی قبر تھی اور باقی کمرے میں قالین بچھی ہوئی تھی۔ زائرین آتے اور یہاں بھی حسب دستور اجتماعی فاتحہ ہوتا۔

اس کے بعد ہم بخارا میں اس مسجد کو دیکھنے گئے جس مسجد میں امام بخاری درس حدیث دیا کرتے تھے۔ اس پورے علاقے میں کئی مساجد اور مدرسے اور سرائے کی عمارتیں ہیں، لابی حوض کے آس پاس ہی ایک زرتشتوں کی عبادت گاہ بھی ہے جو اسی طرح محفوظ رکھی گئی۔ اس مسجد کو مسجد کلاں بھی کہا جاتا ہے ہم اس کے احاطے میں داخل ہوئے۔ یہاں کا سب سے بڑا مدرسہ میر عرب ہے جس کی تاریخ انتہائی قدیم ہے۔ آج بھی یہ مدرسہ موجود ہے اور اس میں تعلیم ہوتی ہے۔ اس میں اسی زمانے کا قدیم ہاسٹل بھی اسی حالت میں موجود ہے جس وقت ہم وہاں پہنچے دور سے ہی

قرآن پڑھنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مدرسہ میر عرب حضرموت کے تاجروں نے قائم کیا تھا۔ مدرسہ کے ساتھ ہی امام بخاری مسجد ہے جہاں امام بخاری درس حدیث دیا کرتے تھے۔ یہ اتنی بڑی مسجد ہے کہ اس میں 60 ہزار نمازی آرام سے نماز باجماعت ادا کر سکتے ہیں۔ مسجد کلاں کے باہر بلند و بالا مینار ہے جس میں 148 سیڑھیاں ہیں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ مینار کی تعمیر کے دو اسباب تھے۔ پہلا سبب اس مینار سے مؤذن پانچ وقت اذان دیتا تھا جب کہ دوسرا سبب یہ مینار شہر کی حفاظت کے لئے اہمیت کا حامل تھا نگراں ٹیمیں اس مینار پر ہمہ وقت موجود رہتی تھی جو کسی ناگہانی صورت میں نقاروں کے ذریعے باقی لوگوں کو خبردار کرتے۔ مینار رات کو قافلوں کی رہنمائی کے لئے بھی استعمال کیا جاتا۔ رات کے وقت مینار کی چوٹی پر مشعلیں روشن کردی جاتی تھیں جس کی روشنی دور سے دکھائی دیتی اور قافلے اس کی روشنی میں اپنی منزل کا اندازہ کرتے تھے۔ مسجد کلاں (بڑی مسجد) سے کچھ فاصلے پر امیر تیمور کے پوتے مرزا الغ بیگ کا تعمیر کردہ مدرسہ بھی اپنی شان و شوکت کے ساتھ موجود ہے جس کی بناوٹ دیکھ کر اس وقت کے معماروں کی کمال مہارت کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ یہ تمام عمارتیں یونیسکو کی فہرست میں شامل ہیں۔ اس مسجد سے نکل کر کچھ ہی دوری پر گنبدوں والا بازار نظر آیا۔ اس زمانے میں اشیا کے لحاظ سے یہ گنبد بنائے گئے تھے مثلاً کسی گنبد کی دکانوں میں کرنسی تبدیل کرنے کی دکانیں اور کسی میں کپڑے اور کسی میں دیگر اجناس کی دکانیں ہوا کرتی تھیں۔ آج بھی یہ بازار اسی شکل میں موجود ہے۔ کچھ ہی دوری پر امیر بخارا کا قلعہ تھا۔ امیر بخارا کا محل آج بھی اسی شان و شوکت کی علامت ہے جو کبھی ماضی میں رہا ہوگا۔ محل کی فصیل بلند و بالا اور مرکزی دروازہ کئی میٹر اونچا ہے۔ محل میں داخل ہونے کے لئے ڈھلوان راستہ بنایا گیا ہے جس سے ہو کر محل کے مرکزی حصہ میں پہنچا جاتا ہے۔ محل کا مرکزی ہال جہاں امیر بخارا کا دربار لگتا تھا بالکل وسط میں تھا ہال کے درمیان میں امیر بخارا کے لیے تخت لگایا جاتا تھا محل میں مسجد ایک بلند مقام پر تعمیر کی گئی تھی جو دور سے دکھائی دیتی تھی۔ دور سے دیکھنے پر یہ قلعہ مٹی کا نظر آتا ہے۔ مین گیٹ سے داخل ہوتے ہوئے دونوں جانب جیل کے کمرے بنے ہوئے تھے یہاں عارضی طور پر

اہم قیدیوں کو رکھا جاتا ہے۔محل میں داخل ہونے کا راستہ فراز میں ہے۔اندر داخل ہوتے ہی ایک صحن ہے۔اسی میں ایک چھوٹی مسجد بنی ہوئی ہے۔

شادی کی تقریبات اور کچھ نئی رسمیں:

بخارا میں یہ حسن اتفاق تھا کہ میں شادی کی تقریب میں شامل ہوا اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ یہاں کی معاشرتی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔رسم ورواج میں خرافات تو نہیں تھے اور نہ اصراف بیجا نظر آیا۔مثلاً لڑکی والوں کو برصغیر میں جس طرح جہیز کے لیے پریشان ہونا پڑتا ہے ویسی لعنت وہاں ابھی تک موجود نہیں۔کئی لوگوں سے اس سلسلے میں گفتگو کی سب نے یہی کہا ایسی لعنت ابھی یہاں موجود نہیں لیکن یہ بھی بتایا کہ اب سوشل میڈیا کے سبب یا بدلتے زمانے کی وجہ سے تحائف دینے کا رواج شروع ہوگیا ہے۔خیر جس دن صبح کو مردانہ پلاؤ کی دعوت تھی۔پھر اسی دن شام کو دولہے کے گھر والے دولہے کے ساتھ دلہن کے گھر گئے۔اب ضیافت کی ذمہ داری دلہن کے گھر والوں کی تھی۔ہم بھی اس قافلے میں شامل تھے۔کوئی شام کو پانچ بجے کا وقت ہوگا کہ ہم دلہن کے گھر پہنچے۔اس رسم کو ایک طرح سے بارات کہہ سکتے ہیں۔اس بارات میں مشکل سے پندرہ سے بیس لوگ شامل تھے۔جب بارات گھر کے قریب پہنچی تو ایک عجیب سی رسم دیکھنے کو ملی۔دولہے کے ساتھ چند لڑکوں نے دو مشعلیں جلائیں۔یہ مشعلیں بڑی سے لکڑی کی تھیں ان کی نوک پر تاروں سے دل کا نقشہ بنایا گیا تھا جسے روئی یا کپڑے سے لپیٹا گیا تھا اور اس میں ڈیزل یا کوئی اور تیل ڈال دیا گیا تھا تا کہ دیر تک مشعل روشن رہے۔مشعل روشن ہوتے ہی دف اور کچھ لاؤڈ موسیقی بھی شروع ہوگئی اور سارے لڑکے دولہے کے ارد گرد جمع ہوگئے اور زور زور سے ازبک زبان میں کچھ کہنے لگے، مجھے تو ایسا لگا جیسے نعرہ لگایا جارہا ہو، بعد میں جب پوچھا کہ اس کا کیا مطلب تھا؟ تو بتایا کہ ہم دلہن کے گھر والوں کو یہ بتارہے تھے کہ دولہا بہت اچھا ہے، آپ کا داماد سلامتی لے کر آیا ہے۔خیر چند قدم کے فاصلے پر دلہن کے گھر کا دروازہ تھا جہاں پہلے سے ہی سوکھی لکڑیوں کو جمع کر کے رکھا گیا تھا۔جیسے الاؤ کے لیے ان لکڑیوں کو جمع کیا گیا ہو۔دولہے کے ساتھیوں نے اس مشعل

سے لکڑیوں میں آگ لگائی اس کے بعد لڑکے کو اُس آگ کے گرد تین چکر لگوائے گئے۔ اسی درمیان دلہن کے گھر سے کچھ عورتیں نکلیں اور رقص کرتی ہوئی دولہے کا استقبال کیا اور اندر لے گئیں۔ کچھ ہی دیر میں سارے مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بیٹھایا گیا۔ لڑکے کے لیے جگہ مخصوص تھی لیکن ان کو بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی (ان کو گھر کے اندر کی رسم پوری کرنے کے بعد ہی بیٹھنے کی اجازت تھی)۔ مہمانوں کی ضیافت میں بہت زیادہ تکلفات نہیں تھے سادگی سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں پیش کی گئیں۔ بعدازاں دولہے کو گھر کے اندر بلایا گیا۔ ہندو پاک میں ''دروازہ لگنے کی رسم'' ہوتی ہے اسی طرح کی یہ رسم تھی لیکن اس رسم کو دیکھ کر بہت اچھا لگا، دولہا جیسے ہی کمرے کے اندر داخل ہوا دلہن کو ایک سرخ اوڑھنی میں سامنے لایا گیا اور آئینے کی مدد سے دولہن کو دیکھایا گیا۔ (ہندستان میں اس رسم کو آرسی مصحف کہا جاتا ہے) اس کے بعد ایک باحجاب اور معمر خاتون نے سلام پڑھنا شروع کیا جس میں رسول اکرمﷺ آل محمد اور ازواج مطہرات پر سلام پیش کیا گیا۔ یہ سلسلہ دیر تک چلا۔ بس اتنی سی رسم تھی پھر دولہے صاحب ہمارے درمیان آکر بیٹھے۔ اتنے میں واپسی کی تیاری ہونے لگی گویا بمشکل دو گھنٹے ہم وہاں رکے اور دولہن کو لیے بغیر ہم واپس آ گئے کیونکہ یہاں کی رسم کے مطابق دوسرے دن علی الصباح یہاں آکر دولہن کو لے جانا تھا۔

اس تقریب میں دولہے کی جانب سے جو لوگ شریک تھے وہ سب کے سب خاندان کے لوگ تھے اور دلہن کی جانب سے بھی صرف ان کے گھر والے تھے اس طرح بہت اژدہام نہیں تھا۔ میں چونکہ ایک غیر ملکی تھا اور ہندستان کی ایک بڑی یونیورسٹی میں پروفیسر تھا، یہ بات سب جانتے تھے اس لیے لوگوں نے میرا بڑا احترام کیا، بہت محبت سے پیش آئے اکثر معمر حضرات قریب آکر بیٹھتے اور زبانِ حال سے میرا استقبال کرتے، کچھ کہتے اور میں بھی کچھ کہتا نہ وہ میری بات سمجھتے اور نہ میں ان کی باتیں سمجھتا مگر محبت کی زبان ایسی ہوتی ہے کہ سب کچھ سمجھ میں آجاتا ہے۔ ہاں ایک دل چسپ بات یہ ہوئی کہ جب ان کو معلوم ہوتا کہ میں مسلمان ہوں تو حیرت کرتے۔ مجھ سے پوچھتے آپ مسلمان ہیں؟ کئی بار تو دعا کے لیے مجھ سے کہا گیا تو میں نے دانستہ زور زور سے قرآنی

آیات اور درود شریف پڑھا تا کہ ان کو معلوم ہو جائے کہ میں مسلمان ہوں۔لیکن ہر شخص میرے مسلمان ہونے پر حیرت کرتا جیسے ہندستان میں مسلمان ہوتے ہی نہیں ہیں۔ یہ بات صرف بخارا میں نہیں ہوئی بلکہ تاشقند میں بھی لوگ میرے مسلمان ہونے پر خوشی کا اظہار کرتے۔

شادی کے پروگرام کے مطابق دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد لڑکی کی رخصتی کے لیے جانا تھا لیکن میں بہت تھک گیا تھا اس لیے رات ہی میں معذرت کر لی تھی ،تمام اہل خانہ سوائے میرے اس رسم میں شریک ہوئے ، میں سو رہا تھا اس لیے شاید باہر سے مین گیٹ پر یہ لوگ تالا لگا کر چلے گئے تھے۔ جب میں اٹھا تو ساری رسمیں ختم ہو چکی تھیں۔لڑکی کے سسرال میں آنے کے بعد کی رسموں کی تفصیلات میں نے شاہ رخ سے معلوم کیں تو معلوم یہ ہوا کہ آگ کے گرد تین چکر لڑکی کو بھی لینے ہوتے ہیں۔ یہ رسم بہت عجیب لگی۔کئی پروفیسران سے میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ زرتشتی عہد کی یہ رسم ہے جو معاشرتی رسم کے طور پر ادا کی جاتی ہے اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے لگا کہ بعض قومیں کس طرح اپنے اقدار کی دلدادہ ہوتی ہیں، جیسے جب مصر میں میرا قیام تھا تو وہاں کے لوگوں کو فرعونی تہذیب پر فخر کرتے ہوئے دیکھا تو حیرت ہوئی۔لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ سب فرعون ایسے نہ تھے کئی فراعین اہل توحید تھے اور مصر کی تہذیبی ترقی میں ان کا بڑا رول تھا اسی لیے وہ فرعونی تہذیب کی قدر کرتے ہیں اور یہ ان کی شناخت کا حصہ بھی ہے، شاید یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

کیا ازبکستان کے سب لوگ ٹیکسی ڈرائیور ہیں؟:

ازبکستان میں ایک بہت انوکھی چیز دیکھی اور بہت اچھا لگا کہ کاش ہمارے یہاں بھی ایسا ہو۔اس کے بارے میں ہمارے ایک ازبکی دوست نے کہا کہ جناب ازبکستان میں ہر شخص ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ مجھے یہ بات اس وقت سمجھ میں نہیں آئی اور حیرت بھی ہوئی مگر ایک دو دن میں جب اس کا مشاہدہ کیا تو بہت اچھا لگا۔ دراصل یہاں پرائیوٹ ٹیکسیوں کا نظم بہت کم ہے۔جن کے پاس

کار ہے وہ بغیر کسی تکلف کے راستے میں کسی بھی شخص کو بیٹھا لیتے ہیں اور ان سے کرایہ وصول کرتے ہیں۔ایسا کرنے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں وہ آفیسر بھی ہوسکتے ہیں یا پروفیسر، عام بزنس مین یا کوئی بھی شخص۔اس رسم سے گاڑی چلانے والے شاید اپنے پیٹرول کا خرچ بھی نکال لیتے ہیں اور شاید کچھ بچ بھی جاتا ہو۔ایسا کرنا یہاں معیوب نہیں سمجھا جاتا۔اہم بات یہ بھی ہے کہ ان پر سوار ہونے والے کوئی بھی ہوسکتے ہیں،لڑکیاں بھی ہوتی ہیں اور اسی مغربی لباس میں لیکن آج تک کسی بدتمیزی یا کرائم کی کوئی رپورٹ درج نہیں ہوئی ہے۔ویسے ازبکستان میں کرائم ہی کم ہے اور خاص طور پر لڑکیوں کے حوالے سے کرائم نا کے برابر ہے۔اسی طرح اس ملک کے لوگ بڑے سادہ لوح ہیں وہ وہی بولتے ہیں جوان کے دل میں ہوتا ہے،ان سے اگر مذاق میں بھی کوئی بات کہہ دی تو وہ اسے سچ مان لیتے ہیں،جھوٹ بہت کم بولتے ہیں۔

ازبکستان والوں کی ایک دو اچھی عادتوں کا ذکر کرتا چلوں۔جب بھی کوئی کسی قبرستان کے سامنے سے گرزتا ہے تو دعا کے لیے ہاتھوں کو بلند کرتا ہے اور مرحومین کے لیے دعا کرتا ہے۔یہ اور اس کے علاوہ بھی کئی عادتیں اس ملک کو امن وامان فراہم کرتی ہیں۔ویسے عالمی سروے کے اعتبار سے ازبکستان خوش رہنے والے ممالک میں 44 نمبر پر آتا ہے۔واقعی میں نے یہاں کے لوگوں کو بہت سنجیدہ اور خوش وخرم دیکھا۔

ایک اور مشاہدہ جس نے مجھے حیرت میں ڈالا وہ یہ کہ اکثر ازبکستانی لوگوں کو سنہرے دانتوں والا پایا۔ایسا لگتا ہے کہ یہاں کے لوگوں کے دانت کمزور ہوتے ہیں اور جب وہ مصنوعی دانت لگاتے ہیں تو وہ سونے کے ہی ہوتے ہیں اسی لیے اگر یہ کہا جائے کہ سونے کے دانتوں والا ملک تو شاید غلط نہ ہو۔

ہوس گروہی گروپ:

شام کو ولیمہ کا پروگرام تھا یہ تقریب شہر کے ایک شادی ہال میں تھی اس تقریب میں شرکت کے لیے ہوس گروہی گروپ بھی آیا تھا۔ازبکستان میں یہ ایک فیملی میوزیک گروپ ہے اس گروپ

میں بھائی بہن اور والد سب کے سب ایک ہی فیملی سے ہیں ان کے والد کا نام رستم ہے جوان بچوں کی کافی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ یہ گروپ ''ہوس گروہی'' کے نام سے جانا جاتا ہے ازبکستان میں 'ہوس' کا لفظی معنی آرزو کے ہیں۔ یہ کافی مقبول گروپ ہے ان کی ایک خاصیت یہ ہے کہ یہ ہندستانی فلمی نغموں کو بہت خوبصورتی سے گاتے ہیں جب کہ یہ اردو ہندی نہ بول پاتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں مگر جس خوبصورتی سے الفاظ اور لہجے کی ادائیگی کرتے ہیں وہ قابل داد ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ ہم اس تقریب کے لیے ایک ہی مہمان خانے میں رکے۔ یہ گروپ ہندستان میں بھی کافی مقبول ہے میں بھی اس گروپ سے واقف تھا اس لیے جب ان سے غیر متوقع طور پر ملاقات ہوئی اور ساتھ رہنے کا موقع ملا تو انتہائی خوشی ہوئی۔ رستم صاحب اور ان کے بڑے صاحب زادے چونکہ انگریزی میں بات کر سکتے تھے اس لیے بہت آسانی ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ہندستانی فلمی نغموں کو کیسے آپ گاتے ہیں تو ان کا برجستہ جواب تھا کہ میوزک کی کوئی اپنی زبان نہیں ہوتی۔ میں نے کہا پھر بھی جب آپ ہندستانی زبان نہیں جانتے تو اس جانب کیسے متوجہ ہوئے تو انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی کی جانب اشارہ کرکے بتایا کہ اس نے سب سے پہلے سوشل میڈیا سے ایک نغمہ ''گوروں کی نہ تو کالوں کی، یہ دنیا ہے دل والوں کی'' سنا تو اسے بہت اچھا لگا اور جب اس نے اس نغمے کو اسی طرز میں یاد کر کے سنایا تو ہم سب کو بہت اچھا لگا۔ اس طرح یہ ابتدا تھی گھر میں ہندی نغمے سننے اور گانے کی۔ چونکہ یہ اتفاق ہے کہ اللہ نے ہم سبھوں کو بہتر آواز دی ہے اس لیے اپنے اسکول میں بھی جب ہم ازبکی گانا گاتے تو ایک ہندی نغمہ بھی گایا، لوگوں نے اسے بہت پسند کیا۔ والد صاحب نے بڑی حوصلہ افزائی کی اور لوگوں نے سراہا تو یہ سلسلہ گھر سے باہر نکلا۔ عوام کی پسند نے ہمیں حوصلہ دیا اس طرح آج یہ ازبکستان کا مشہور میوزک گروپ بن گیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ہم سینٹرل ایشیا کے کئی ممالک میں جاتے ہیں لوگ ہم سے ہندی نغمے ہی سننا چاہتے ہیں۔ ویسے پورے ازبکستان میں لوگوں کو 'اپنا دل تو ہے آوارہ' سب کو پسند ہے اور لوگ محفلوں میں گاتے ہیں۔ ہوس گروہی گروپ کو ہندستان میں بھی بڑے بڑے پروگرام کے لیے بلایا گیا ہے اور کئی حکومتی اداروں اور وزار نے انھیں اعزازات اور توصیفی سند سے بھی نواز

ہے۔

سات بجے شام سے کچھ پہلے ہم ہال میں پہنچ گئے، آہستہ آہستہ مہمانوں کی آمد شروع ہوئی۔ یہاں بھی مہمانوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی۔ ہال بہت سلیقے سے سجا ہوا تھا اور ہر طرف گول میز لگی ہوئی تھی، ہر میز کے ساتھ آٹھ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہر میز پر انواع وقسام کے کھانے پینے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ہال کے ایک جانب دولہا دلہن کے لیے اسٹیج بنا ہوا تھا اور اسی کے سامنے دوسری جانب میوزک کے پروگرام کے لیے اسٹیج سجا تھا۔ دولہا دلہن کے آنے سے قبل ہی میوزک کا پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے بہت ہی شاہانہ انداز میں دولہا دلہن کی ہال میں آمد ہوتی ہے۔ گیٹ پر ان دونوں کا شاندار استقبال کیا گیا اس کے بعد جب یہ ہال میں داخل ہوئے تو ہر دو تین قدم پر رک رک کر دلہن حاضرین کے استقبال کے لیے کورنش بجالاتی اس طرح اسٹیج تک آنے میں انہیں تقریباً آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ اسٹیج پر آنے کے بعد بھی دلہن مستقل جھک جھک کر سلام پیش کرتی رہی ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی گڑیا میں چابھی بھر دی گئی ہو اس لیے وہ مستقل ایک ہی انداز میں جھکی جا رہی ہو۔ مجھے عجیب لگا کہ سب لوگ بیٹھ چکے تھے مگر دلہن بھاری بھرکم لباس میں کیسے یہ تکلیف برداشت کر رہی یہ دیکھ کر اچھا نہیں لگا۔ میں نے دولہے کے بھائی سے کئی بار کہا بھی کہ اب دونوں کو بیٹھ جانا چاہیے مگر انھوں نے بتایا کہ یہی رسم ہے۔ اس طرح تقریباً دو گھنٹے تک یہی سلسلہ رہا ہوگا۔ خیر اس درمیان سب سے پہلے یہ رسم ہوئی کہ دولہے اور دلہن کے والد اسٹیج کے سامنے کھڑے ہوئے ان کے ہاتھ میں مائیک دیا گیا اور دونوں نے نئے جوڑے کو شادی کی مبارکباد دی۔ اس کے بعد دونوں کی والدہ آئیں لڑکی کی والدہ شاید زیادہ شرمیلی تھیں اس لیے انھوں نے کچھ نہیں کہا مگر دولہے کی والدہ نے کچھ دیر تک گفتگو کی، ساری محفل واہ واہ کہہ رہی تھی مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا مگر ان کی گفتگو کے انداز سے معلوم ہوا کہ وہ کافی جذباتی ہو گئیں تھیں۔ اس کے بعد خاص رشتہ داروں نے مبارکبادیاں دیں۔ مجھے بھی مبارکباد دینے کے لیے بلایا گیا میں نے اپنی اور ہندستان کی جانب سے ان کو مبارکباد پیش کی، شاہ رخ نے میری مبارکبادی کا ازبک میں ترجمہ کیا۔ خیر اب محفل شباب پر آ رہی تھی موسیقی کا پروگرام محفل کو خوشگوار بنا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد

جب ہوس گروہی گروپ کا میوزک شروع ہوا اور انھوں نے ہندستانی فلموں کے نغمے گانے شروع کیے تو پوری محفل جھوم اٹھی، عورت مرد سب رقص کرنے لگے۔ مجھے ایسا لگا کہ رقص کا رواج یہاں عام ہے خوشی کی تقریبات میں عام طور پر رقص ہوتا ہے لیکن شائستگی کے ساتھ۔ یہی چیز میں نے قاہرہ میں بھی دیکھی تھی۔ مجھے چونکہ رات کے نو بجے کی ٹرین سے تاشقند کے لیے روانہ ہونا تھا اس لیے ہم ساڑھے آٹھ بجے اہل خانہ سے اجازت لے کر نکل آئے حالانکہ وہ اجازت دینے کے موڈ میں نہیں تھے کیونکہ ابھی تو محفل ختم بھی نہیں ہوئی تھی۔ بہرکیف ان کی بہت ساری محبتیں اور دعائیں لے کر ہم بخارا اسٹیشن وقت پر پہنچ گئے۔ اس یادگار سفر کے لیے میں محترمہ لولا صاحبہ، جناب عزیز الدین صاحب، رمزالدین اور ان کے والد، والدہ، ہمشیرہ، بھائی اور چچا کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں۔

تاشقند واپسی:

رات بھر کے سفر کے بعد پانچ مئی کی صبح تاشقند آ گیا یہ اتوار کا دن تھا چھٹی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ کے طلبہ و طالبات نے کئی بار یہ گزارش کی تھی کہ ہمارے ساتھ تاشقند کے مضافات میں پہاڑوں کی سیر کے لیے چلیں۔ یہ دن اچھا تھا کیونکہ سوموار سے رمضان شروع ہونے والا تھا اور روزے کی حالت میں گھومنا شاید مشکل ہو اس لیے سمندر کو فون پر اپنی آمد کی اطلاع دی انھوں نے کئی دوستوں سے بات کی اور بیلدرسائے جو تاشقند سے تقریباً 70 کیلومیٹر کی دوری پر خوبصورت پہاڑ ہے جہاں چھٹیوں کے دنوں میں تاشقند والے سیر کے لیے نکل جاتے ہیں، کئی امیر گھرانوں کے یہاں فارم ہاؤس بھی بنے ہوئے ہیں، اس مقام پر جانے کا فیصلہ ہوا۔ دہلی سے ڈاکٹر اخلاق بھی تاشقند آ چکے تھے ان کا بھی اسی گیسٹ ہاؤس میں قیام تھا۔ ناشتے پر ان سے ملاقات ہوئی تو وہ بھی ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔ ہمارے ساتھ سمندر اور دلآرام رہبر کے طور پر تھے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت طے کر کے خوشگوار وادی میں پہنچ گئے۔ اس کے سرسبز و شاداب نشیب و فراز انتہائی دلکش تھے ساتھ میں چرچیک ندی کا کنارا دلفریب تھا۔ کئی گھنٹے گزارنے کے بعد ہم شام گئے تک گیسٹ ہاؤس آئے۔

اگلے دن تاشقند میں پہلا روزہ تھا، جب کلاس روم گیا تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تمام طلبہ و طالبات روزے سے ہیں، یہاں کی نئی نسل کو دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ سب روزہ دار ہیں۔ان کے ملبوسات میں اگر چہ روسی جھلک موجود ہے اور بہت حد تک ان کے طرز حیات میں مغربیت نظر آتی ہے مگر ان کے قلوب ایمان سے منور ہیں۔اللہ اس ملک کو اور اس ملک کے لوگوں کو فلاح دارین عطا کرے۔دوسرے رمضان کو اورینٹل اسٹڈیز، تاشقند کے ہمارے عزیز طالب علموں نے الوداعی افطار کا اہتمام کیا یہ پہلی جماعت کے طالب علم تھے انہیں معلوم تھا کہ 11 مئی کو ہماری واپسی ہے۔ یہ بڑے اہتمام سے افطار کا انتظام کرنے والے تھے مگر ہر دن افطار کی دعوت کی وجہ سے ہم مصروف تھے اس لیے یہی ایک دن بچا تھا لہٰذا جلدی بازی میں دوپہر کو انھوں نے افطار کی تیاری شروع کی اور شہر کے مشہور ریسٹورینٹ الہلال میں یہ اہتمام ہوا۔میری خوشی، میری حیرت کی انتہا نہیں کہ یہ بچے مجھ سے اس قدر پیار کرتے ہیں۔ان کے اندر علم حاصل کرنے کا جذبہ لائق تحسین ہے۔سب روزہ دار ہیں اور دلوں میں ایمان کی روشنی ہے۔اللہ ان بچوں کو دونوں جہاں میں کامیابیاں عطا کرے۔(آمین)

8 مئی کو انسٹی ٹیوٹ میں ایک تقریب رکھی گئی۔ یہ تقریب ایک تو ہماری الوداعی تقریب تھی اور دوسری اس میں ہماری اور ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا کی مشترکہ تصنیف ''اردو شاعری'' کی رسم اجرا بھی تھی۔ یہ کتاب ہم دونوں نے مشترکہ طور پر لکھی ہے جو یہاں کی نصابی ضرورتوں کو پوری کرتی ہے۔انہی کی فرمائش پر یہ کتاب تیار کی گئی تھی، جس کی رونمائی کا اہتمام ہوا تھا۔تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے اساتذہ کا تہہ دل سے شکر یہ کہ انھوں نے میرے لیے الوداعی تقریب کا اہتمام کیا اور مجھے اعزاز سے نوازا۔صدر شعبہ پروفیسر الفت محبّ صاحبہ اور لولا مکتوبہ صاحبہ جو بہت ہی دل سے تمام انتظامات کرتی ہیں، ان کا اور محیا عبدالرحمانوا اور شعبے کے تمام اساتذہ کا اس عزت افزائی کے لیے ممنونیت کا اظہار کرتا ہوں۔ مجھے اس تقریب میں توصیفی سند اور تاشقند کا تحفہ دیا گیا۔اس تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر لال بہادر شاستری سینٹر فار

انڈین کلچر کے ڈائریکٹر پروفیسر چندر شیکھر صاحب اور صدر کی حیثیت سے جناب نادر عبد اللہ ایو پرووائس چانسلر تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ فار اورینٹل اسٹڈیز، موجود تھے۔ان کے علاوہ طلبہ وطالبات نے بھی شرکت کی۔

لال بہادر شاستری سینٹر فار انڈین کلچر میں لیکچر:

اسی شام کو پروفیسر چندر شیکھر، ڈائریکٹر لال بہادر شاستری سینٹر فار انڈین کلچر نے میرے لیکچر کا اہتمام کیا۔عنوان ’ہندستان اور ازبکستان کے تہذیبی روابط‘ تھا۔لیکچر سے قبل ازبکی لڑکیوں نے ہندستانی رقص پیش کیا، ہندی نغمے سنائے اس کے بعد پروفیسر بیات کی تقریر ہوئی اور آخر میں میری تقریر ہوئی، صف سامعین میں سب کے سب ازبکی تھے اس لیے میری تقریر کا ترجمہ ڈاکٹر محیا صاحبہ نے کیا۔ایک گھنٹے کی اس تقریب کے بعد بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور یہیں طے ہوا کہ اگلے دن پروفیسر چندر شیکھر کے گھر افطار کی دعوت پر جانا ہے۔

پروفیسر چندر شیکھر کے گھر افطار کی دعوت:

چندر شیکھر صاحب اکیلے گھر میں ہوتے ہیں لیکن گھر اتنا بڑا ہے کہ کئی فیملی ایک ساتھ رہ سکتی ہے۔ان کے لیے یہ مشکل کام تھا کہ افطار کا کیسے انتظام ہو؟ مگر انھوں نے بہت سے کھانے خود اپنے ہاتھوں سے بنائے، کچھ کی ذمہ داری لولا صاحبہ نے لی۔یہاں آکر پتہ ہی نہیں چلا کہ میزبان کون ہے اور مہمان کون ہے۔کیونکہ خواتین نے کیچن سنبھال لیا۔اس دعوت کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں انسٹی ٹیوٹ کے تمام اساتذہ مدعو تھے اور تاشقند میں اردو کے بڑے نامور ادیب تاش مرزا صاحب بھی مدعو تھے،ان سے ملاقات کا یہی بہتر موقع تھا۔

ازبکستان کے ’شہر امن‘ تاشقند میں اردو کے بنیاد گزاروں میں جناب تاش مرزا خالمرزائف کا نام بہت ہی اہم ہے وہ ساٹھ کی دہائی میں دو ساتھیوں کے ساتھ اردو زبان کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی یونیورسٹی جانے والے پہلے طالب علم تھے جو اردو زبان سیکھنے کے لیے ہندستان گئے۔اس وقت خواجہ احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی کے صدر تھے۔وہاں سے آنے کے بعد ان کے

بازؤں میں جیسے شاہین کے پر لگ گئے اور بتدریج اردو زبان وادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ اردو زبان کے لیے ان کی خدمات بہت ہیں یہ اور بات ہے کہ برصغیر میں کہیں بھی ان کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا یہ ہم اردو والوں پر ایک قرض ہے۔ تاش مرزا صاحب کی طرح اور بھی کئی شخصیات ہیں جن کی بدولت ازبکستان میں اردو والوں کی آج بڑی تعداد موجود ہے۔ ان شاء اللہ بہت جلد ان پر تفصیلی مضمون لکھوں گا تا کہ اہل اردو ان کی خدمات سے متعارف ہوسکیں۔ آج کی شام ان سے ملاقات میرے لیے ایک تاریخی دن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اتنے معمر ہونے کے باوجود انتہائی زندہ دل اور جوش وخروش سے ملنے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ نفیس اردو میں ایسی باتیں کرتے ہیں کہ بس سنے جایئے۔ ان کی گفتگو میں مزاح کا پہلو حاوی ہوتا ہے۔ بہت کم وقت ملا ان سے بات کرنے کا لیکن یہ تین گھنٹے یادگار رہے۔ اللہ انھیں صحت وسلامتی کے ساتھ رکھے۔ اسی محفل میں جناب دادا خان نوری صاحب سے خوشگوار ملاقات ہوئی۔ تاشقند میں فیض احمد فیض نے ان کے گھر قیام کیا تھا۔ فیض شناسی کے حوالے سے ان کی شخصیت بہت اہم ہے کیونکہ تاشقند میں فیض کے قیام کے حوالے سے اب تک بہت سے پہلو اخفائے راز میں ہیں۔ دادا خان صاحب نے ہندستانی نغموں کی دلکشی سے اردو ہندی خود سے سیکھی بعد میں قمر رئیس صاحب نے ان کی اردو کو جلا بخشی، اب تک ان کی کئی تحریریں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی اہم شخصیات اس افطار میں موجود تھیں۔ جناب چندر شیکھر صاحب کا اس لیے میں بہت شکریہ ادا کرتا ہوں کہ افطار کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان اہم شخصیات سے ملاقات کا موقع فراہم کیا۔

11 مئی کی صبح گیارہ بجے کی فلائٹ تھی اس لیے ہم گیسٹ ہاؤس سے سات بجے ہی نکل گئے۔ ڈاکٹر محیا صاحبہ کے ایک طالب علم جمشید اپنی گاڑی سے مجھے ائیر پورٹ لائے یہاں محیا صاحبہ پہلے سے منتظر تھیں۔ ائیر پورٹ میں ان کی ایک شاگردہ کام کرتی تھیں، انھوں نے انھیں فون کیا اور خود میرے ساتھ اندر تک آئیں، میرے ساتھ مشکل یہ تھی کہ سامان بہت زیادہ تھا اور صرف بیس کیلو لے جانے کی اجازت تھی لیکن ان کی شاگردہ زلفیہ صاحبہ کی وجہ سے یہ مشکل بھی آسان ہوئی۔

دراصل دہلی ائیر پورٹ میں پہلی دفعہ ایسا تجربہ ہوا تھا کہ بورڈنگ شروع ہونے کے بعد عجیب واقعہ ہوا۔خود پائلٹ بورڈنگ گیٹ پر موجود تھے اور بہت سختی سے لوگوں کے ہینڈ بیگیج چیک کر رہے تھے کہ سات کیلو سے زیادہ نہ ہو۔اس وجہ سے بورڈنگ میں بہت تاخیر بھی ہوئی۔میری مشکل یہ تھی کہ ہینڈ بیگ میں بہت ساری کتابیں تھیں جس کا وزن دس کیلو سے زیادہ تھا۔لیکن شکر ہے کہ ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔تاشقند سے واپسی پر بھی میرے ہینڈ بیگ کا وزن زیادہ ہی تھا مگر زلفیہ صاحبہ کی وجہ سے سب مرحلے آسانی سے طے ہوئے اور یہاں دہلی کی طرح بورڈنگ گیٹ پر وہ تماشہ بھی نہیں تھا۔پندرہ دنوں کے طویل سفر کے بعد ان تمام ناقابل فراموش اور خوشگوار یادوں کے ساتھ 11 مئی کو دہلی واپس آ گیا۔